

ایک چھاپا

ایک چھاپا

(جملہ حقوق بحق میرا قبضہ میں محفوظ)

پہلی بار ————— ۱۰۰۰

اگست ۱۹۶۰ء

قیمت :- چار روپے پچاس نئے پیسے

ناشر :- مکتبہ "صبا" حیدرآباد (آندھرا پردیش)

اپنے بارہ سالہ بچے فرید

کے نام

جس کی اچانک موت نے

میرے دست و بازو کی ساری

قوت سلب کر لی

کتابت محمد منظر

تزیینِ عنوانات قیصر سرمست

حسنِ کار سعادت

طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

گردپوش ونکیٹیشور پریس

رائٹس انتخاب پریس

فوٹو ریگل

بلاک ڈوان

محمد مظہر کی پُر خلوص شخصیت، اُس کی شرافت نفس اس کی متخل ہی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ فنِ کتابت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ کتابتوں کے ساتھ جو روایات منسوب ہیں ان سے وہ اس طرح شرم محسوس کرتا ہے جیسے یہ روایات فنِ کتابت ہی سے منسوب ہو گئی ہوں اور اسی بات کے ردِ عمل کے طور پر وہ بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ مظہر کا تب لکھتا ہے تاکہ آپ اس کی اپنی شخصیت کے تعلق ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہم پیشہ ہر فرد سے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

محمد مظہر نے ”اعلیٰ پرچھائیاں“ کے بہانے مجھے اپنی کتنی ہی محبتیں دیں۔ اتنے چاؤ سے اس نے میری کتاب لکھی جیسے وہ خود اس کی اپنی تخلیق ہو۔ یہ بھی ہوا کہ ایک بار لکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیجا گئیں۔ سوچتا ہوں کہ اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی اجرت ادا کر سکوں بھی اس قرض کو کیسے چکا سکوں گا جو بے اندازہ خلوص کی صورت میں اس نے مجھے دیا ہے۔

مظہر نے ۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش خوش نویس یونین کی بنا ڈالی۔ وہ اس انجمن کا روح رواں ہے۔ پچھلے سال وہی سکریٹری تھا، اور اس سال اس کے ساتھیوں نے جن میں اس کے ہم پیشہ بزرگ بھی شامل ہیں اسی نوجوان کو اپنا پریسڈنٹ چنا ہے۔

قیصر سر مست

بچپن ہی سے اسے آرٹ سے دلچسپی رہی لیکن ۱۳ سال کی عمر تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جو اس کے اس دے ہوئے شوق و جذبے کو جگما سکے۔ جب یہ تیرا سال کا ہوا اس وقت ایک فلمی بنیز بنتا ہوا دیکھ کر اچانک اسے اپنے دے ہوئے شوق کا احساس ہوا۔ اس کے بعد سے یہ پنٹنگ کر رہا ہے باضابطہ اس نے آرٹ کی تعلیم نہیں پائی۔ بس اپنے شوق کو پورا کرتا رہا آرٹ کے دو امتحان بھی پاس کیے۔ حال ہی میں کل ہند صنعتی نمائش میں اس کو ایک STILL LIFE پرسکند پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کا پسندیدہ مضمون STILL LIFE ہے، وہ پاکستانی فنکاروں میں زین العابدین سے کافی متاثر ہے اور ہندوستانی فنکاروں میں حسین اس کا پسندیدہ آرٹسٹ ہے۔ خود کو آرٹسٹ کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ اس کا ابتدائی فن "عنوانات کے روپ میں آپ کے سامنے ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی حیثیت منوالے گا۔ فی الوقت اپنے گھر ہی کو اپنی پنٹنگ سے آراستہ کر کے غوش ہوتا ہے۔ میں اس وقت کے انظار میں ہوں جب کہ ہر گھر اس کا اپنا گھر ہو گا اور اس طرح اس کی پنٹنگس ہر گھر کی زینت بنیں گی۔

نیمہ سیر ۹

۱۷

۳۵

چنگن چاچا

۵۷

گرتی دیواریں

۷۵

وام ہر موج

۹۱

بیمار

۱۱۷

برہان قاطع

۱۳۳

ملب

آدمی اور آدمی

۱۶۱

۱۹۵

۲۱۷

۲۳۳

۲۶۱

۲۷۱

۲۹۹

مجلہ پریچانیات

سہارن

مجموعہ

اجنبی

روزنامہ

گرمیہ یارو

ہیں کہ اکبر کچھ



اقبال متين

چشمہ

میں ذاتی طور پر کسی تخلیقی فن پارے پر خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا ڈراما کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں مصنف خود لکھے تو لکھے بلکہ بعض صورتوں میں تو مصنف کا دیباچہ ”ضروری“ ہو جاتا ہے اور ایسی سچی دو چار مثالیں موجود ہیں کہ بجائے خود دیباچہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اصل تصنیف سے ہٹ کر ادب میں اس کی سچی ایک علاحدہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے۔

گو کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے کو ہموار کیا جائے، گویا مقدمہ نگار مصنف اور قاری کے درمیان ایک شخص رابطہ کا فرض انجام دیتا ہے اور عام طور پر دیباچہ یا مقدمہ کسی ادیب کی پہلی پیش کش پر محض اس وجہ سے سچی لازمی سمجھا جاتا ہے کہ ادبی حلقوں میں اس ادیب کا بھرپور تعارف ہو جائے اور اس کی پہلی پیش کش کی پذیرائی میں آسانی پیدا ہو لیکن مقدمہ نگار جو

فرض اپنے سر لیتا ہے وہ بھی کچھ کم اہم اور نازک نہیں۔ اسے بہت ذمہ داری کے ساتھ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہیے اور حتی المقدور ادبی دیانت داری کے رشتے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے لیکن ادھر یہ رسم چل پڑی ہے کہ اس سیدھے سادے مقصد کے حصول کے لیے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو بڑے نام رکھتے ہیں لہذا ہوتا یہ ہے کہ وہ یا تو مصنف کی حوصلہ افزائی کی خاطر یا پھر ”شرفِ اُردو“ میں ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق دور دور تک نہ تصنیف سے ہوتا ہے اور نہ مصنف سے چنانچہ اکثر کتابیں پڑھنے کے بعد مقدمہ نگار کی حیثیت گواہ کی اور مصنف کی حیثیت مدعی کی نظر آتی ہے۔ لیکن اس مقدمے کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس سے نہ مصنف کا بھلا ہوتا ہے اور نہ مقدمہ نگار ہی کا اعتبار باقی رہتا ہے۔ دونوں کی ”رسوائی“ ہوتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جس ادب پارے میں جان نہ ہوگی اس میں کسی بڑے سے بڑے ادیب یا نقاد کا قلم معجز رقم بھی روح نہ پھونک سکے گا۔ ادب پارے میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت ہوگی وہ کسی عیسائی نفس کی تلاش نہیں کرے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ”اجلی پر چھائیاں“ پر جو دیباچہ لکھ رہا ہوں تو کس حیثیت میں اور کیا سمجھ کر۔ حیثیت میری یہ ہے کہ میں اقبال متین کا دوست ہوں اور اس کے زیر نظر افسانوی مجموعے کا ناشر بھی، اور سمجھتا یہ ہوں کہ میری دیباچہ نگاری سے اسے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا البتہ اقبال متین نے کیا سمجھ کر یہ گناٹے کا سودا کیا یہ میں نہیں جانتا۔ شاید یہ بھی دوستی ہی کی کوئی ادا ہو۔

اقبال متین کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ یہ کوئی ۳۳ء، ۳۴ء کی بات ہوگی لیکن وہ شاعر جس کے مستقبل سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی جاتی تھیں آہستہ آہستہ کھلانے لگا اور چار پانچ سال کے بعد پھر جو اقبال متین سامنے آیا تو وہ شاعری کا لبادہ اتار کر افسانہ نگار بن چکا تھا۔ شکریہ ہے کہ افسانہ نگار اقبال متین نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور ”چوڑیاں“ جیسی (پہلی ہی) کہانی لکھنے کے بعد ادھر بسیوں کو بصورت کہانیاں تخلیق کر کے اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری اختیار نہ کرتا تو یقیناً اردو افسانہ ایک اچھے فنکار سے محروم رہ جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو شاعری اور افسانہ نگاری کی اصناف ہی ایسی ہیں کہ ان میں ہمارے اہل قلم نے زیادہ جولانیاں دکھائی ہیں اور آج بھی اردو شعر و افسانہ کا ایک قابل لحاظ حصہ اتنا بلند ہے کہ ہم اسے فخر کے ساتھ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے میں کیا دنیا کی بہت سی زبانوں کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار سمجارت اور پاکستان میں ابھرے ہیں اور جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کی ناک کو اونچا کیا ہے ان میں ایک اقبال متین بھی ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ حیدر آباد کی مٹی کی منکسر المزاجی اور آج بھی اردو ادب میں پھیلی ہوئی صوبہ واریت، گروہ بندی اور احباب نوازی نے اقبال متین کو قابل اعتناء سمجھا ہوا اور وہ بھی ان ”غیر ادبی مظاہروں“ کی پروا کیے بغیر لکھتے جا رہا ہو۔

اقبال متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے پھر سب کچھ اور جو اچھا ادب ہو گا وہ کسی رنگ کا ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے قابل قبول ہو گا۔ اس میں درد مندی بھی ہوگی اور انسان دوستی بھی اور اس میں غم ذات سے لے کر غم کائنات تک ہر غم کے لیے گنجائش ہوگی۔ اگر ادب کی مذکورہ بالا تعریف کی تائید میں اقبال متین کی کوئی کہانی پیش کی جائے تو آپ کو اس میں اچھے ادب کی بہت سی خوبیاں مل جائیں گی۔

یوں اقبال متین کہانی کی کسی بندھی ٹکی تکنیک کا پابند نہیں لیکن وہ کہانی کو ایک مشاق مشاطہ کی طرح بنا سنوار کر اور لوک پلک سے آراستہ کر کے اہل نظر کے سامنے لاتا ہے۔ وہ کہانی کے ضروری اجزاء کے ساتھ دوسرے فنی نکات پر بھی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور خاص طور پر کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں تو اسے یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ وہ اپنی کہانی کے لیے کبھی کوئی ایسا کردار نہیں چنے گا جس سے وہ نہ مل چکا ہو بلکہ جب تک خود کردار کی طفسر سے یہ اصرار نہ ہو کہ جب تم مجھ سے مجھ سے زیادہ واقف ہو تو پھر مجھ پر کیوں نہیں لکھتے۔ اس پر اقبال متین کہے گا کہ تمہاری خواہش ہو تو میں تم پر آج ہی کہانی لکھوں گا مگر ایک شرط پر کہ میکریمہ جس میں اکسے کی مشین بھی لگی ہے اگر تمہارے ظاہری ضد و خال کے ساتھ تمہاری روح کے ڈھلکے چھپے گوشوں کو بھی اجاگر کر دے تو مجھے برا بھلا نہ کہنا اور جب کردار کی طفسر سے اقبال متین کو اجازت مل جائے گی تو پھر وہ بڑی بیدردی اور بڑی ہمدردی سے اس کردار کو کاغذ پر منتقل کر دے گا۔

چنانچہ آپ جھگن چاچا سے گاؤں میں بیٹے یا برہان سے اسٹیشن والی سڑک پر رام دیال سے آروند و گھوش کی تعلیمات پر تبادلہ خیال کیجئے یا شیکھر کے ساتھ ہرن کے شکار پر جائیے، بیگم سے راست اس کے جسم کا مول تول کیجئے یا ہارڈنگ کے ساتھ کوالٹی میں آخری بار و سکی پیجئے آپ کو کوئی کردار اجنبی نہیں لگے گا سب آپ کے شناسا، دوست، عزیز رشتہ دار اور پیارے نکلیں گے اور ہو سکتا ہے کہ کسی کردار کے روپ میں آپ کو خود اقبال متین نظر آجائے اور آپ جھجکا کر پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر کہانی میں کردار نگاری کی کوئی اہمیت ہے اور اپنے زندہ کرداروں کے بل بوتے پر کوئی افسانہ نگار زندہ رہ سکتا ہے تو اس مجموعے کی حد تک ہی جھگن چاچا برہان، ماسٹر صاحب اور رام دیال اقبال متین کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

بعض شاعروں کی طرح بعض افسانہ نگار بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس موضوعات کی کمی ہوتی ہے، اور ان کے فن کا انحصار محض طرزِ ادا اور حسن بیان پر ہوتا ہے۔ وہ متضاد اور مختلف موضوعات پر یکساں قدرت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے اور بعض افسانہ نگار ایسے ہوتے ہیں کہ تنوع اور بوقلمونی کے شوق میں ایسے موضوعات پر بھی کمندیں ڈالتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں اگر ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے دو چار افسانے پڑھ لیں تو پھر ہم اس کا کوئی بھی افسانہ پڑھیں یہ محسوس ہوگا کہ یہ افسانہ تو پڑھا ہوا ہے اور دوسری صورت میں ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے سب افسانے پڑھ بھی لیں تو دو چار افسانے ہی کام کے نکلیں گے لیکن اقبال متین نہ پہلی شق کے افسانہ نگار

میں ہے نہ دوسری شق کے اس کے ہاں موضوع کی یکسانیت بھی نہیں ملتی اور ہر طرح کے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کا شوقِ فضول بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن سے وہ بوجہ احسن عمدہ برا ہو سکتا ہے، یہ احتیاط یہ سنبھلا سنبھلا ہوا انداز دراصل اقبال متین کا مزاج ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اس کی آبرو بچائے ہوئے ہے۔

شاعری، افسانہ اور دوسری اصنافِ ادب کے لیے بھی یہ مسئلہ ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے کہ زبان کیسی ہونی چاہیے۔ عام طور پر سادہ اور سہل زبان کی تائید شدہ دوسرے سے کی جاتی ہے لیکن زبان سے خیال اور نفسِ مضمون کے تعلق سے قطع نظر حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شاعر، افسانہ نگار یا ادیب کی شخصیت کا اظہار اس کی زبان اور طرزِ تحریر ہی سے ہوتا ہے لہذا کسی فنکار یا ادیب سے یہ مطالبہ کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی ہی زبان لکھے۔ اقبال متین کی تحریر میں بھی اس کی شخصیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے جو عبارت ہے آرستگی، سلیقہ مندی اور ایک پر تکلف رکھ رکھاؤ سے، ساتھ ہی اقبال متین اپنے افسانوں میں حیدر آباد کے محاورے اور مقامی زبان کے الفاظ بھی بڑے چاؤ سے استعمال کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اہل زبان اس پر ناک سجھوں چڑھائیں گے۔ اس خصوص میں اس کا استدلال یہ ہے کہ جب اہل دہلی اور اہل لکھنؤ اپنے محاورے اور روزمرہ پر اصرار کر سکتے ہیں تو ہم کو کیوں اپنی زبان استعمال کرنے کا حق نہیں دیا جاتا؟ اور کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس استدلال میں کوئی وزن نہیں ہے؟

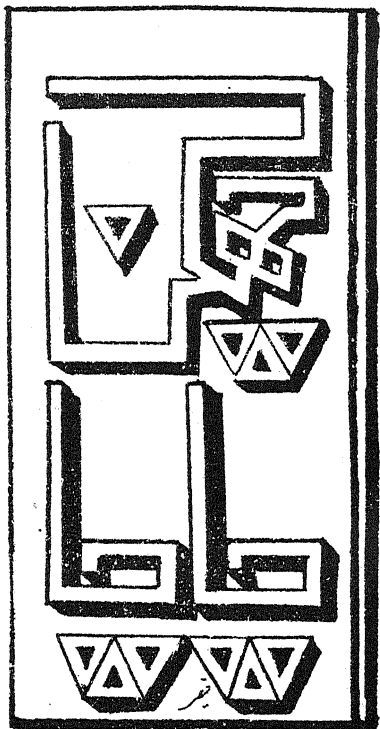
پوری انسانی تاریخ حق و باطل، نیکی و بدی اور تعمیر و تخریب کی آویزش کا ایک ایسا موقع ہے جس میں انسان کہیں یزداں کی صورت میں خیر محض بنا ہوا ہے تو کہیں اہرمن کے روپ میں مجسم شر اور کبھی کبھی تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دراصل وہ ہے کیا؟ لیکن ایک ابن آدم ابن مریم کو صلیب پر چڑھاتا ہے تو ایک ابن آدم رحمت اللعالمین بن کر آتا ہے اور میرے نزدیک اقبال متین کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ انسان کی تصویر کے تاریک ترین رخ کو سامنے لانے کے باوجود انسان کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ اقبال متین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ مکتبہ ”صبا“ کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے اور میرا یقان ہے کہ روز بروز متین کا فن اور نگہ بے صفا اور سنورے گا۔

سلیمان اریب

۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء

اے۔سی گارڈز۔سیف آباد۔حیدرآباد دکن



چاچا چھکن کے تو پورا ہر تھے، کوئی گھر ہو، کوئی کنبہ ہو گاؤں بھر میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں چھکن چاچا کا بول بالا نہ تھا طبیعت بھی کچھ ایسی ہی پائی تھی انہوں نے۔ ورنہ بات بے بات میں کوئی کسی کا دم کیوں بھرے۔ اب اسی کو ہی لے لیجئے۔ امام دادا اور کریم بخش میں تو بار حواں چاند تھا۔ کریم بخش جس راہ سے گزریں گے امام دادا اس طرف متھوکیں گے بھی نہیں کریم بخش کا اکلوتا، نوجوان بھائی، دوبارہ زندگی ہوئی ہے اس کی لیکن کیا مجال جو امام دادا ایسے میں بھی پیچھے ہوں۔ نا بھئی ایسی بھی کیا بخش مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ آدمی آدمی کا دشمن اور چاچا چھکن لگ گئے میل ملاپ کی فکر میں۔ یہ اور بات ہے کہ امام دادا اور کریم بخش کے دلوں کا میل نہ گیا لیکن چھکن چاچا نے تو وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ امام دادا نے دبی زبان میں چھکن چاچا کو بھی کریم بخش سے میل جول رکھنے پر روک ٹوک کی تھی۔ مگر وہ سب چھکن چاچا یوں دان بچا گئے کہ ہاتھ میلانہ ہوا اور رنگ چوکھے کا چوکھا۔ امام دادا کو آخر ہتھ ہی نہی کہ بھائی تم اپنے جی کے راجہ ہو، آپ اپنے مختار ہو میں شرمندہ ہوں جو یوں بے وجہ تمھاری طبیعت میں دخل دینا چاہا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چاچا چھکن نے دونوں سے میل ملاپ جاری رکھا کیوں نہ رکھتے آخر کوئی کسی سے ٹوٹے وہ تو سب کے تھے، سارے گاؤں کے۔

اُجلی پر چھائیاں جھگن چاچا

یہ جھگن چاچا کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ گاؤں میں جہاں کسی میں ٹھنی اور وہ لگے اپنی دھن میں نہ کھانے پینے کے رہیں گے نہ سونے کے، فریقین میں جب تک گٹھ بندھن نہ ہو جائے وہ نچلے نہیں بیٹھنے کے۔ کلو مادھو کی تو چھوڑیے، ان دونوں میں تو بنتی بگڑتی ہی رہتی ہے۔ آج لڑیں گے تو کل مل لیں گے کل مل لیے ہوں تو آج ضرور لڑیں گے۔ صرف ان کا ہی جھگڑا ایسا تھا کہ جھگن چاچا بھی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ چاچا نے خود چھوڑا ہے ان دونوں کو۔ اب پرسوں ہی کی بات ہے مادھو کو چوپال کی طرف آتا دیکھ کر چاچا یوں بیٹھے رہے جیسے منوں بوجھ دھرا ہوا ان کے سینے پر۔ اور ہم سب سمجھ گئے کہ چاچا گل کھلائیں گے اب۔ مادھو نے چاچا کو اس رنگ میں دیکھا تو حسب توقع خیر خیریت پوچھی۔ چاچا کہاں چوکنے کے بولے۔ مادھو بٹیا وہ میرے اصل ہیں نادونوں۔ لال بھبھو کا اور گٹر گوں جانے کیا بات ہے دو دن سے بہت میل ملاپ ہے ان میں۔ مادھو بولا تو کیا بُرائی ہے چاچا۔ چاچا کہنے لگے۔ دولڑا کو یوں سر جوڑ لیں تو سمجھ خون میں گرمی نہیں رہی ان کے۔ آختہ ہو گئے بس، اور سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ مادھو تاڑ گیا۔ یوں کھسیا نا ہوا کہ اب رو پڑے گا۔ اس دن سے گاؤں والوں میں کلو اور مادھو کا نام لال بھبھو کا اور گٹر گوں پڑ گیا۔

چاچا کی یہی باتیں گاؤں بھر میں مشہور تھیں۔ جہاں کچھ آما کافی ہونی کہ چلے سب چاچا کے گھر۔ گاؤں کے کسی باسی نے چاچا کے تیور پر بل پڑتے نہیں دیکھا۔ چاچا میں خوبیاں یوں تو بہت سی تھیں۔ بات کرنے کا انداز ایسا دلکش جیسے ہٹل کار ٹیڈیو بول رہا ہے آواز میں گرمی بھی نرمی بھی۔ جو بولیں گے دل میں اتر کر رہے گی۔ عجیب شخصیت تھی ان کی بچہ جوان، بوڑھا، عورت، مرد سبھی خوش ان سے، چاچا کیا تھے چلتا پھرتا جادو تھے بوڑھا سا دھوکھتا تھا جھگن چاچا اس کے ہم عمر ہیں لیکن دیکھنے میں تو وہ اتنے سال خود

نہیں معلوم دیتے تھے۔ یوں اسخوں نے بیٹھک پر اس آندھی کا ذکر تو کئی بار کیا تھا جو سنتے ہیں کوئی پچیس سال پہلے آئی تھی۔ وہ کہتے تھے تمہارا چاچا آنکھوں دیکھی باتیں کرتا ہے۔ کانوں سنتی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چاچا اتنے ہی بُرے ہوں جی لیکن جی نہیں مانتا تھا اور مانے بھی تو کیسے۔ چوڑی چھاتی، گھٹلا بدن، چال ڈھال میں ایسا ظنطنہ جیسے فوجی افسر چل رہا ہو۔ بالوں پر ہمیشہ خضاب مگر موخچیں نہ ڈار مٹی۔ سینک کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے تھے پر کیا مجال جو کوئی اس بہروپ کی ہنہ تک پہنچ سکے۔ دل کی جوانی کا یہ عالم کہ بدن کے کس بل سے کچھ ٹیرھ چڑھ کر ہی۔ آس پاس کے گاؤں میں کہیں میلہ لگتا اور چاچا گاؤں کے گبروؤں کی ٹولی بنا کر چل پڑتے۔ کبڈی کی شریں ہوتیں اور چاچا کھلاڑیوں کے چناؤ میں مگن ہو جاتے۔ جہاں چاچا نے ان باتوں میں دلچسپی لی کہ ہم میں گھن پن شروع ہو گئی۔ چاچا بنار ہے ہیں ٹیم۔ اچھا جی۔ پھر تو مزے ہیں مزے۔ چاء بسکٹ پان بیری سبھی کچھ رہے گا۔ اور واقعی سبھی کچھ رہتا۔

چاچا ہاتھ کے بہت کھلے تھے۔ کہتے پسیہ ہاتھ کا میل ہے۔ سرکار سے پچانوے روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ آندھ تھے اور یوں جی ان کا تھا کون جس کی حق تلفی ہوتی۔ دھرم تپتی تھیں سوانھیں سورگیاں ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ چاچا کی جوانی ہی میں وہ داغ مفاہت دے گئی تھیں۔ رہ گئی مالتی بہن سوان کا بیاہ چاچا نے کیا۔ اچھے کھاتے پیتے دیکھ گھر انے میں کیا تھا۔ مالتی بہن کو وہ جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور ننھی کی تصویریں تو جب دیکھو ان کے جیب میں ٹپری رہتیں۔ باوجود اتنے چاؤ کے وہ مالتی بہن کے گھر جانے سے گریز ہی کرتے۔ ان کی منطقی ہی جدا تھی۔ کہتے بیٹی پر یادھن ہوتی ہے اور بیٹا اپنا دھن۔ اپنا دھن تو ہے نہیں۔ پر اے دھن کی کیا میت۔ اس پر زرتیوں، کلثوم، پر ماسب کی سب

بگڑ گئیں۔ تو کیا چاچا۔ مالتی کے لیے آپ کے من میں کچھ نہیں —؟ ہے کیوں نہیں لیکن تم سب سبھی تو ہو۔ ایک من میں کس کس کا پریم لیے پھروں گا، اور چاچا یوں رچھا لیتے سب کو، گاؤں کی چھوریاں اس بات کو طول دیتے ہوئے بھی دڑتیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی نہ جانے چاچا کیوں کرتا تھے اس قصے سے جہاں یہ بات چلی کہ لگے چاچا زمین گھورنے زمین گھورنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی ہوں ہاں کہیں گے۔ ہوں ہاں بھی نہ ہو سکے تو وینکٹ کے بیل پیل کا بھوت ڈپٹی صاحب غرض کہ کچھ نہ کچھ بات نکال دیں گے، یہ بھی نہ چلے تو یوں زمین گھوریں گے جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئیں۔ پنکٹ پر چو پال پر چاچا سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے غائب۔ دور بہت دور کہیں گچھاؤں میں کھو جائیں گے، غلاؤں میں ٹھیکیں گے۔ اور یں پدما میں ٹھیس ہو گئے وہ تو۔ سفر کر رہے ہیں پنجاب میں پدما کچھ کا دے گی۔ پدما، زیتون، ٹھیس ٹھیس۔ غرض پنکٹ پر چاروں سمتوں سے نظریں اٹھیں گی۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی۔ رام جانے۔ اللہ توبہ۔ اور چاچا غائب۔ دور بہت دور۔

اس بات سے ہٹ کر چاچا کو کبھی کسی نے کھویا کھویا نہیں دیکھا۔ بات بات پر ہنستے چرخ سے پیک کی بچکاری ماری اور لگے دانت کریدنے۔ سیر سپاٹوں کے دلدادہ۔ کہتے کیسی جوانیاں ہیں جویوں پخلے بیٹھے رہتے ہو۔ جوانی تو ٹوپی کا پھندا ہونا چاہیئے۔ مضطرب بے کل، بارہ۔ سنا ہوں ندی ٹپری ہوئی ہے۔ سمے ایسا کہ مجھ بوڑھے کا بدن کس مس کرتا ہے۔ آنکھ اٹھاتا ہوں تو متوالا ہوا جاتا ہوں۔ نا بھئی مجھ سے تو نہیں رہا جاتا۔ ہم کوئی ماں کے پیٹ میں تھوڑا ہی ہیں جویوں پیرے بھگتیں۔ دنیا نہ ہوئی کال کو ٹھہری ہو گئی۔ نا بھئی ان جوانیوں سے تو یہ بڑھاپا ہی جلا۔ اور ہم سب سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے۔ چرخ پان کی پیک

اُجلی پر چھائیاں
 زمین پر آ رہتی اور زردہ کا ایک بھپکا مہیں مسح کر دیتا۔ تو شے تیار ہوتے۔ چاچا نکڑ
 کے بیٹھائی والے کو چوپال پر سے پکارتے۔ ”گولی پہلوان ذرا سنا تو“ ”اُم
 کر نا چاچا۔“ وہ جواب دیتا ”جلیبیاں اور لڈو کل سویرے سویرے چاہئیں۔
 تازہ گھی کے میرے سورما، اور دوسرے دن سویرے سویرے گولی پہلوان کو لڈو
 اور جلیبیوں کی قیمت سے کچھ اوپر ہی مل جاتا۔ وہ ان کا سورما جو ٹہرا۔
 چاچا اس کو اپنا سورما کہا کرتے۔ بات یہ تھی کہ سورما نے واقعی ہمارے گاؤں
 کی لاج رکھ لی تھی۔ سیتاپور والوں کے آسامی نے چاچا کے پاس چٹنی بھیج دی تھی
 کہ کشتی میں اگر ہمارے گاؤں کو ہر ادیس تو مان لیں گے وہ اوجنی کے گبروؤں کو۔
 سیتاپور ہمارے اوجنی کے کوئی چار میل اُتر میں تھا۔ ہر سہ ماہی کو سیتاپور اور اوجنی والوں
 میں دھڑلے کی کبڈی ہوتی۔ اس سال ہم نے انھیں مسلسل تین بار جیتا تھا۔ چٹنی دیکھی تو
 فوراً لکھ جیجا۔ سو موار کو ہم آ رہے ہیں، پر اس شرط سے کہ جو ہمارے گاؤہ جلسہ بھی
 دے گا۔ آسامی چلا گیا۔ پر چاچا لڑے گا کون۔ ہم حیرت سے بول اٹھے۔
 لڑے گا کوئی بھی میرا لال یا گٹرگوں۔ سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ پھر چاچا سنبھل کر بولے
 ہاں کر دی ہے تو پیچھے نہیں ہٹنے کے ہم۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ اور ہاں وہ کیا کم ہے
 ہمارا گولی پہلوان۔ موچھوں پر تاؤ دیتا پھرتا ہے۔ مونچھیں منڈوا دوں گا بچہ کی۔ انھوں
 نے اس انداز سے تن کر کہا جیسے اپنی اہمیت کا احساس دلارہے ہوں۔ ”پھر تو جلسے کی
 تیاری کیجیے چاچا۔ ہو چکی کشتی۔“ بیٹیک کے کونے سے کسی نے کہا۔ ہم پیچھے پلٹے تو بندہ علی
 کہہ رہا تھا۔ تین سال ہوتے ہیں اس کو لنگوٹ کھول کر اور حساب سے تین ہی تھے بھی
 ہیں اس کے۔ سچ۔ چاچا نے مسکراتے ہوئے زمین پر پچکاری چلائی۔ پان کو

چھلکن چاچا

اُجلی پر چھائیاں

دہننے جڑے میں برابر کرتے ہوئے بولے عورت کے آگے لنگوٹ کھولا تھا اس نے کچھ مرد کے آگے تو نہیں کھولا تھا، اور سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سوموار کو دھڑے پٹے، پنگیاں باجے جب ہم سینا پور پہنچے ہیں تو سارا گاؤں زنگل پر جمع تھا، عورتیں بھی چھتوں پر گھاس کی گری پر چڑھی ہوئی ہماری منظر تھیں۔ گنپت کو دیکھا تو ہمارے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ دل ایسے دھڑکنے لگے جیسے گاؤں میں بجتے ہوئے دھڑے ہمارے سینوں کے اندر پٹ رہے ہوں۔ کشتی شروع ہوئی تو گولی پہلوان چوڑی بھول گیا تھا۔ گرتے گرتے یوں سنبھلنا جیسے سال سب کا سچہ چلنا سیکور رہا ہو۔ ایک بار تو بس حد ہی کر دی اس نے کشتی کرتے کرتے اتنی حسرت سے ہماری طرف دیکھا ہے جیسے کہ رہا ہو، میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کیا چاچا، میرے منہ سے چیخ ہی تو نکل گئی کجخت نے جو اس بھی تو کھو دیئے ہیں۔ لڑتا کہاں ہے اور دیکھنا کہ صر ہے چاچا کا یہ عالم کہ گولی کے ساتھ ساتھ خود بھی اچھل کود رہے ہیں۔ جیسے کڑے داؤں پیچ سکھا رہے ہوں۔ مار دیا۔ مار دیا۔ مار دی۔ آمیرے سورما۔ اور گنپت ساڈ کی طرح چت پڑا تھا۔ پھر کیا تھا سورما کبھی کسی کے کندھے پر تھا تو کبھی کسی کی گود میں، کبھی گردن میں لٹکا مانگیں جھاڑ رہا تھا۔ چاچا نے اپنی طرف سے چاندی کا کڑا سورما کے ڈنڈ پر چڑھایا تو اس نے چرن چہر کر آہستہ سے چاچا کے کان میں کہا۔ چاچا آج سے میں نے مرد کے آگے بھی لنگوٹ کھول لیا ہے۔ سب ہنس پڑے۔

چاؤری میں کھارے میٹھے اور چاء پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمارے سورما کو پھول پہنائے گئے، باجوں اور رشتہ سے جب گھر واپس ہوئے ہیں تو بہت ساروں نے فیصل کے باہر ہی استقبال کیا۔ آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ گولی پہلوان پھول پہنے آ رہا ہے۔ ضرور

اُعلیٰ پر چھائیاں چھگن چاچا

جیت لی ہوگی اس کے شتی لوگ جلوس میں شامل ہونے لگے۔ سمجی واہ مار دیا ہمارے سورمانے۔
سورما کا کوئی یاریوں چچا۔ جندہ باز میرے پٹھے عورت بھی چیت۔ مرد بھی چیت۔ اور چاچا
نے جواب میں کہا بھگوان کی کرپا ہے ورنہ دونوں پٹ گئے ہوتے ذرا کی ذرا میں۔

چاچا کی یہی زندہ دلیاں تو گاؤں کی زندگی تھی۔ مہینوں میں برسوں میں کبھی کبھار جب
وہ مالتی پن کے پاس چلے جاتے یا بیمار پڑ جاتے تو سارا گاؤں سونا سونا ہو جاتا۔ ہم سب کچھ
ایسا محسوس کرنے لگتے جیسے پرندوں کی چچا ہٹ اور کھیتوں کی لہلہا ہٹ ختم ہو گئی ہو اور جیسے
ڈھوڑ ڈنگرنے دانہ چارہ چھوڑ دیا ہو۔ حالانکہ سارے کاروبار اسی ڈھنگ سے جاری رہتے
لیکن شاید دلوں کی ویرانی گاؤں کی ویرانی بن کر سارے گاؤں پر مسلط ہو جاتی۔ ماحول ہی کچھ
بجھا بجھا سا ہو جاتا جیسے کوئی اہم ترین چیز ہماری زندگیوں میں سے کم ہو گئی ہو۔ چاچا کیا
تھے گاؤں والوں کا دل تھے۔ ہمدرد تھے کہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ کبھی انہوں
نے کسی کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا بلکہ سچ پوچھتے تو وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتے
کہ انہیں کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔ آپ یقین کیجئے جب وہ ہمیں حکایات شیریں میں جُھپ
چُھپ کر گھروں میں تھیلیاں پھینکنے والے وزیر کا قصہ پڑھاتے تو وہیں اس وزیر کو چاچا کے
روپ میں دیکھنے لگتا۔ میرا مقصد اس سے یہ نہیں کہ چاچا بھی یوں ہی کرتے لیکن جانے کیوں
یہ سبق یاد کرتے وقت میں چاچا کو باوجود ان تھک کوشش کے خیال سے ہٹانے سکتا چاہنے
سارے گاؤں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے
اوجہ میں ایک ہی بہت بڑا خاندان یا کنبہ رہ بس گیا ہے۔

بوڑھی بھنگن کا نواسہ بیار ہوا تھا تو چاچا نے سو سو جتن کیے تھے اس کے لیے
اس زمانے میں سردیاں کڑا کے کی پڑ رہی تھیں۔ آگ تاپتے ہوئے چاچا نے شعلوں کو

جھگن چاچا

اُجلی پر چھائیاں

گھورتے ہوئے کہا تھا جہاں آگ انسان کے سرد جسم کو حرارت بخشی ہے وہیں ایک ایسی بھی آگ ہے جو متحرک جسم کی حرارت کو سرد اور بے جان کر دیتی ہے ہم نے چاچا کی ان بے وقت فلسفیانہ باتوں کو سمجھ نہ پا کر پوچھا تھا — کون سی آگ؟ — پیٹ کی — اور ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — سچ کہتے ہیں چاچا — تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے جھگن کے نواسے کے لیے — اور دوسرے دن اتنا چندہ جمع ہو گیا تھا کہ قصبہ کا ڈاکٹر بلا گیا۔ ایک کبیل خریدی گئی اور اناج سے بھری پوری دو بوریوں کی جھگن مالکن ہو گئی —

میری ماں کہتی تھی جھگن چاچا آدمی کے روپ میں دیوتا ہیں وہ اس بات کے جواز میں ہمیشہ ایک قصہ لے بیٹھتی۔ کہتی کہ جب میں چھوٹا سا تھا اور میرے باپ کو ابھی کہیں نوکری نہیں ملی تھی ان دنوں کئی کئی دن کے فاقے ہوتے تھے ہم پر۔ فاقوں کی وجہ سے ماں کی چھاتیاں سوکھ جاتی تھیں تو دودھ کی بوند بوند کے لیے میں بھی بلکتا تھا زینیں تو ہماری متھی نہیں جو کبھی بٹری کرتے۔ میرے ماں باپ جو لاہے کا کام کرتے تھے ان دنوں یہ دھندل کچھ چلتا چلاتا نہیں تھا۔ پہلے تو ایک ایک رو مال ایک ایک لنگی بنانے میں کئی کئی دن بیت جاتے اور جو مال تیار ہوتا اس کی کچیت ان دامنوں نہیں ہوتی جو لاگت اور ان کی کڑی محنتوں کا معاوضہ ہو سکے۔ نفع کا ایسے میں سوال ہی کیا۔ میری ماں اور باپ اس مفلسی کی زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ آدمی بھوکا ہو تو شاید اس کے سارے انسانی جذبے دم توڑ دیتے ہیں میری ماں کہتی کہ میرا باپ ان دنوں اپنی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ ہمیشہ چڑچڑا رہتا۔ بے وجہ مجھے گھر کتا، مال کو گالی دیتا، اور میرے بڑے بھائی کو علانیہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستا، اس پر ماں کچھ کہتی تو لڑکھڑکھ کر

اچلی پر چھائیاں
 دو دو دن گھر سے کہیں چل دیتا اور سدھ بدھ تک نہ لیتا ہماری۔ وہ کہتی کہ چنگن بھیا کو
 شاید یہ واقعات معلوم ہوئے۔ ایک بار میرا باپ بٹنی کے تقاضے سے تنگ آکر گھر سے
 غائب تھا اور وہ بیٹھی رو رو کر مجھے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی اس وقت چنگن چا چا
 اپنے مخصوص انداز میں پان کی گھوری جڑے میں دبائے مسکراتے ہوئے گھر میں داخل
 ہوئے ماں کو روتا دیکھ کر وہ باتیں کی ہیں کہ پیٹ خالی ہونے پر سبھی ہنسنی کل پڑی۔ پھر
 کہنے لگے قاسم سب میں اچھی طرح جانتا ہوں اس بخشو کو۔ میرا بچپن کا ساتھی ہے ناباؤلا
 اور دیکھ بہن تو اپنے من میں کچھ اتنا پریم رکھتی ہے اس کے لیے کہ وہ تجھے تڑپا تڑپا کر
 شانت ہوتا ہے۔ گیا ہے تو آپ ہی چلا بھی آئے گا، یوں اس کے لیے روتی بیٹھے گی تو
 تیری آنکھیں آنسو بن کر بہ جائیں گی اک دن۔ جیسے انھیں ماں کے رونے کا سبب معلوم
 ہی نہ تھا۔ جاتے ہوئے کہنے لگے کچھ اپنے بھائی بھاج کا بھی تو خیال کر گا ہے ماہ۔
 اکیلی پڑی رہے گی لیکن ذرا کی ذرا ہماری سچی پوچھ گچھ کی ہے کبھی۔ مالتی کی ماں ہے کہ
 یاد کیے جاتی ہے بچاری — ان دنوں چاچی زندہ تھیں۔

تیرے چا چا چلے گئے تو میں نے تجھے کھاٹ پرسلانے کے لیے اٹھایا تیرے تیکے
 کے نیچے پیلا پیلا ٹوٹ دھرا تھا۔ اور ماں کی آنکھیں سہرائیں۔ سنتی ہوں اگلے
 زمانے میں بادشاہ اور وزیر اپنی پر جا سے ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ پر اب کہاں
 ایسے بادشاہ بھی۔ تب تو مجھے یقین سا ہونے لگتا کہ ”حکایات شیریں“ کے وزیر نے
 چا چا کے روپ میں دوسرا جنم لیا ہوگا۔ میں ان خیالوں میں کھو جاتا اور وہ مسکراتی
 ہوئی آنکھیں پونچھ لیتی۔

چا چا کے ایسے ہی اور سبھی دو ایک قصے مشہور تھے جنہیں دے سکتے انھیں کھینڈ

اصلی پر چھائیاں

چمکن چا چا

بھی دے دیا کرتے لیکن خود ان کو کسی نے کبھی اپنی حاجت بیان کرتے نہیں سنا۔ کیسی ہی افتاد پرے ہنستے ہنساتے سہم لیں گے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ چا چا فکر مند ہیں یا کوئی بات انھیں اندر ہی اندر کھول رہی ہے۔ ایسے میں بھی صرف ایک ہی چیز تھی جس سے کبھی کبھی ان کی حالت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہی باتیں کرتے کرتے یا ہنستے ہنستے زمین پر کچھ تلاش کرنے کی عادت۔ کبھی چا چا قہقہہ لگاتے لگاتے ایک دم ایسے خاموش ہو جاتا جیسے کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ ہمیشہ کی بلشاشت ان کے چہرے سے کچھ اس طرح غائب ہو جاتی جیسے یہ پل بھر کی سنجیدگی اور متانت ہی ان کے چہرے کی خصوصیت ہو۔ سنجیدگی اور تمکنت کا یہ غول ان کے وجود کو اس طرح ڈھک لیتا کہ ان کی شخصیت پر کچھ شبہ ہونے لگتا، اصلی چا چا کونسا ہے۔ ؟ یہ جو اس وقت سامنے ہے یا وہ جو ابھی ابھی زندہ تھا، اور اگر اس چہرے کے توسط سے کوئی ان کے قریب ہو رہا ہوتا کوئی ان کے اندر جھانک رہا ہوتا کہ وہ ایک دم کھل کھلا اٹھتے۔ جیسے پل بھر پہلے مارے ہوئے قہقہے کا تسلسل ابھی ٹوٹا ہی نہ ہو۔ جیسے یہ قہقہے ان کے وجود کا جز ہوں اور شاید سب ہی سوچنے لگتے کہ اصلی چا چا کونسا ہے۔ وہ جو ابھی مردہ تھا یا یہ جو اب زندہ ہے۔ کہلنڈرا منس مکھ جو ان۔ پنج۔ زردہ کی خوشبو کا ایک مچھکا سب کو مسحور کر دیتا اور کوئی بھی چا چا کے اندر تک نہ پہنچ سکتا۔

وہ یوں جب کبھی خاموش خاموش نظر آتے تو نہ جانے کیوں میرا خیال مالٹی بہن کی طرف رجوع ہوتا۔ میرا دل بولتا کہ چا چا کی ان بھتی اور سلگتی ہوئی آنکھوں سے مالٹی بہن کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہو گا۔ میں جتنا ہی اس بات کو سوچتا اتنا ہی میرے دل کو یقین ہوتا جاتا میں نے بار بار اپنی ماں سے مالٹی بہن کے لیے الٹ پیچ کر پوچھا تھا لیکن وہ

ہمیشہ ہی مجھے اس کا یقین دلاتی رہی کہ وہ بڑے ٹاٹھ سے ہیں۔ ساون گاؤں کے دیسکھ کی بہو۔ بڑی بڑی زمینیں، جائداد، نوکر چاکر سبھی کچھ — اللہ رکھے ایک نہیں دو بچے، بھتیہ کہتے ہیں پاؤں پھر بھاری ہو گئے ہیں اس کے۔

میں خود بھی سوچتا کہ اس سے زیادہ آخرو کیا آرام چاہیے کسی کو۔ رہ گیا میاں بیوی کا پریم سوا اس کے تو چرچے تھے۔ وہ تھیں بہت محبت والی۔ چاچی کو تو بھی کچھ پتہ تھا مالتی بہن تو باپ پر گئی تھیں جس کے باپ نے سارے گاؤں کو موہ لیا ہو، اس کی بیٹی اپنے تپ کو نہ اپنالے۔ جی نہیں مانتا تھا۔

میں پھر کھوجتا ”ماں پریم تو ہے نا جوڑے میں“ کیوں نہیں سننتی ہوں پاؤں دھو کر پتیا ہے اس کے۔ کھل میری ہنسی نکل جاتی، یہ پاؤں کا دھوؤں پینے کی بھی خوب رہی، لیکن جی چاہتا کوئی مسکے بھی پاؤں دھوے۔ یا میں ہی کسی کا۔ اور یوں ہی جو بات چاچا اور مالتی بہن کے بارے میں چلتی وہ اکثر مجھ پر آکر ختم ہوتی مجھے اس پاؤں دھونے والی بات سے اتنا لطف آتا کہ ماں میری منگنی کی باتیں لے بیٹھتی، اور میں جانتا تھا کہ میری ماں اس موضوع پر جب کبھی آتی ہے تو روتی ضرور ہے اور اسی سبب میں اس سے پہلے کہ اس کو اپنی مفلسی اور نکبت کا احساس ہو وہاں سے کھسک جاتا۔

ہاں چاچا کے بارے میں ایک اور بات مجھے کھٹکتی تھی۔ حوالدار مرحوم کی بہن نوراں دادی کی نواسی کا بیاہ تھا۔ ہمارے ہی ضلع میں کہیں بات چیت ہوتی تھی۔ بیاہ سے دو ایک دن قبل چاچا بھی اتنے مصروف رہے کہ چوپال کا رخ نہیں کیا۔ بیاہ کا دن آیا تو ہم سب ہی شریک تھے۔ چاچا اس طرح خوش خوش کام دھندے میں لگے تھے جیسے یہ تقریب ان ہی کے پاس ہو رہی ہو۔ ہنسی مذاق چوڑ چوڑ، چہل اور دو لہا والوں سے

اُجلی پرچھائیاں

چھگن چاچا

نوک جھونک وہ ہر بات میں شریک تھے لیکن جب بارات جانے لگی تو نوراں دادی اور گھسروالی عورتوں کے رونے چلانے سے چاچا بھی اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی سب چہرل آن کی آن میں غائب ہو گئی۔ جانے عورتیں شادی بیاہ کے مواقع پر بھی رونے سے کیوں نہیں چوکتیں۔ پال پوس کے پروان چڑھانے کے بعد اپنے جگر گوشہ کو کسی اجنبی کے حوالے کرتے ہوئے دکھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ سنتے ہیں بڑے شہروں میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو خود ہی پسند کر لیتے ہیں شاید ایسے میں شہر کی بڑی بوڑھیاں یوں چلا چلا کر روتی بھی نہ ہوں گی۔ سچ پوچھیے تو رونے دھونے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ رونا دھونا ہی ٹہر تو یوں کر کے دینا ہی کیا ضروری ہے۔ ان بوڑھیوں کا تو اللہ بلی۔ ادھر روتی بھی ہیں ادھر دگانے بھی ادا کرتی ہیں کہ سینے کا بوجھ سہرا۔ نوراں دادی کی اوموشی تو میری منہسی نکل گئی۔ بارات روانہ ہوئی تو چاچا باہر نکلے۔ میں نے جوا نکھٹھائی تو چاچا منہ موڑ کر آنسو خشک کر رہے ہیں — مجھے اپنی آنکھوں پر بھر و سہ نہ تھا۔ وہ چاچا جس کی آنکھیں بڑی سے بڑی مصیبت میں نہ ہوتی تھیں آج یوں بچوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔ مجھے اس کی حرکت پسند نہ آئی مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی معمولی باتوں پر کبھی رو ہی نہیں سکتا اور یہ صرف دکھاوا ہے شاید نوراں دادی کے لیے۔ لیکن چاچا اتنا عام آدمی بھی تو نہیں ہے جو شخص کسی کی خاطر دکھاوے کے لیے ہنس نہیں سکتا وہ رو کیسے سکتا ہے؟ — اور نہ جانے کیوں مالتی بہن میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

اس وقت میرے ذہن میں چاچا کے خلاف مورچہ قائم ہونے لگا۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے چاچا کی شخصیت میں میرے لیے وہ دلچسپی ختم ہو رہی ہے جو کبھی تھی۔ ماں کہتی تھی کہ چاچا کے اس پر بہت سے احسانات ہیں لیکن مجھے جب مالتی بہن کا خیال آتا تو چاچا کے سارے احسانات کو بھول کر میرا ذہن ان کے خلاف سوچنے کو تیار ہو جاتا، ایسے میں خصوصیت

سے مجھے وہ بات یاد آ کر تڑپاتی جو چند ہی ماہ پیشتر اس ضمن میں پیش آئی تھی۔ مالتی بہن نے بوڑھے کا کاکے ساتھ ننھی کو شہرے بھیجا تھا کہ وہ اپنے نانا کو کسی طرح پکڑ لائے۔ لیکن چاچا نے پھسلا کر ننھی کو اکیلے لوٹا دیا تھا۔ خود نہ جانا تھا نہ گئے۔ جب تک ننھی یہاں رہی چاچا اس پر وارے نیا رے ہوتے رہے اور جانے لگی تو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے اور جاچکی تو زمین پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ اس دن سے کوئی دو تین روز تک میں نے غور کیا تھا کہ چاچا پھر کچھ کھوئے کھوئے سے رہے، پھر چند دن تک مجھے ان کی مسکراہٹیں ان کی دلی کیفیات کو جھٹلاتی ہوئی معلوم ہوئیں جیسے ان کی خارجیت ان کی داخلیت کا کفن ہو ایسے میں نے یہ مناسب بھی نہ سمجھا کہ ننھی کے اکیلے لوٹا دینے کا سبب پوچھوں ورنہ یوں تو دیرا جی چاہتا تھا کہ اس معاملے میں چاچا سے کھرے کھرے سوالات کر ہی لوں، کیوں کہ مجھے مالتی بہن بہت پیاری تھیں اس لیے بھی کہ میں نے چاچی کا دودھ پیا تھا۔ پھر بھی جب ننھی جا رہی تھی میں نے دبی زبان میں چاچا سے التجا کی تھی۔ لیکن وہ زمین پر نظریں گاڑے جانے کہاں پہنچ گئے تھے۔ جب ان کی نظریں اٹھیں تو میں نے دیکھا پلکیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ تو چلی گئی ننھی؟۔ کیوں نہ جلے گی۔ آخر وہ چونکے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کا انھیں احساس بھی نہ تھا۔ اس واقعہ کے تین چار مہینے کے بعد وہ یکایک مالتی بہن کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ البتہ مالتی کی سہیلیاں اس کے پاس اپنے اپنے پیام اور سندیش بھیج رہی تھیں۔ میری خوشی بے پناہ تھی۔ ماں مگر خوش نہ دکھائی پڑتی تھی۔ چاچا صبح کو بکھنے والے تھے۔ انہوں نے میری ماں سے توشہ کی تیاری کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ جب انھیں کسی لمبے سفر پر جانا ہوتا تو وہ میری ماں سے

اُعلیٰ پر چھائیاں

چھلکن چا چا

ہی توشے کے لیے کھانا بنواتے۔ میری ماں کو ایسی چیزیں بنانے میں مہارت تھی جو رکور کو کر کھاتی جاسکیں۔ اس شام وہ بہت دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ چلتے وقت کہنے لگے اٹھ سہیل تو پیدل چلنا ہو گا قسوس ہن تب کہیں جا کر گاڑی ملے گی۔ وہ بھی دن ڈھیلے ڈوبے ڈبولی ہو تو اسلم پہنچا دے گا جیتا۔ ہاں ہاں پہنچا دے گا کیوں نہیں سلو میرا، اور وہ کواٹر کھول کر باہر نکل گئے۔

دوسرے دن صبح کو جب میں توشے لے کر چا چا کے دروازے پر پہنچا ہوں تو تالا پڑا تھا۔ پہلے تو میں ٹھٹھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شاید چا چا بھی توشہ ہی کی غرض سے ہمارے گھر آئے ہوں۔ لوٹ گیا۔ بظاہر تو اس کا بھی امکان نہ تھا اس لیے کہ اگر وہ ہمارے ہاں جاتے تو ان سے راستہ میں میری مدد بھیٹر ہونا ضروری تھا۔

میں گھر لوٹنے لگا تو راستے میں برج لال بنیے کے مکان پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اسی کے گھر میں ٹیس ٹری تھی۔ پندرہ سو روپے کی نقدی غائب تھی۔ اس کی پتی چھاتی کوٹ رہی تھی۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے سمجھی کو ہمدردی تھی۔ کوئی کچھ پوچھتا، کوئی کچھ سوال کرتا۔ برج لال نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ رات گئے صرف چھیل داس جی آئے تھے انھیں ہزار روپیہ قرض کی ضرورت تھی۔ بہت منقہیں کیں لیکن میں ٹال رہا تھا۔ اور وہ رونے لگا۔

چھیل داس جی آئے تھے۔ رات گئے۔ انھیں ہزار روپے کی ضرورت تھی — اور چا چا گھر پہنچے نہیں ہیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے گاؤں پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ بہت بڑی مصیبت۔ اور ماں میرے کانوں میں پلارہی تھی جیسا آدمی نہیں دیتا ہے — مجمع میں کوئی چیخ رہا تھا۔ چا چا گھر نہیں ہیں۔ چا چا غائب ہیں۔

اجلی پر چھائیاں

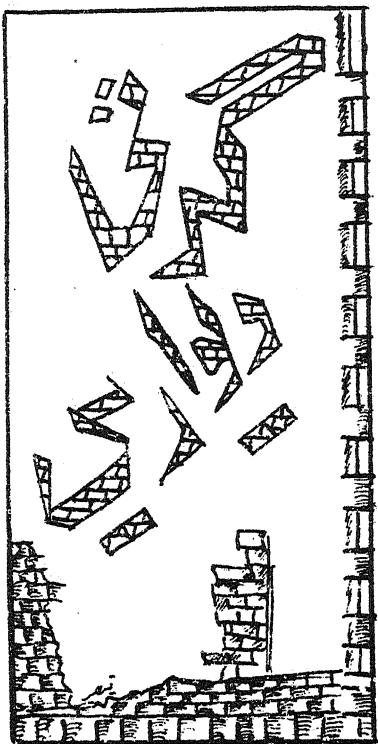
جھگن چا چا

چا چا — غائب ہیں۔ اور انھیں آوازوں میں جیسے میری ماں مجمع میں پھینچڑوں کی پوری قوت کے ساتھ پکار رہی ہو — بھیا آدمی نہیں دیتا ہیں۔

میں گھر لوٹا تو میری حالت اس جواری کی تھی جس نے اپنا سب کچھ مار دیا ہو۔ ماں کو اڑ کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ میں کھاٹ پر گر پڑا تو ماں نے دھیمی آواز میں کہا — تیرا چا چا بد لغیب ہے سٹو۔ جو چیز اسے جان سے پیاری ہے اسی کے دکھ میں گھل رہا ہے۔ مالتی ہسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں رسولی ہے۔ اس کے پتی نے شراب اور جوئے میں ساری جائیداد کھو دی ہے۔ تجھے کیا خبر بیٹا۔ اس سوئے نے تیرے چا چا کو خوب پٹیا بھی تھا — ہاتھ ٹوٹیں ظالم کے۔ بھیا آدمی نہیں — اور ماں سسکیاں لینے لگی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چاچی مجھ سے دودھ کا بدلہ مانگ رہی ہے میں نے نظریں جھکا لیں تو جیسے کسی گہری اور غیش کھائی سے چا چا پکار رہے ہوں مالتی۔ مالتی۔ اور سیکے منہ سے نہ جانے کیوں نکلا۔ ماں چا چا بہت برے ہیں۔ وہ دیتا نہیں، آدمی ہیں۔





بی اماں اُپر سپر کرتی پیش دالان میں پہنچ گئیں۔ گھر کا گھر ابھی سو رہا تھا۔ صرف دلہن کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بیچارے نادومیاں صحاف میں امنہ چھپائے دلہن کو بچکار رہے تھے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی دلہن کی طراری کی جھنک بی اماں کے کانوں میں ٹپر چلی تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اللہ میاں کی بارگاہ میں دلہن کی تنک مزاجی کے خلاف دبے دبے احتجاج کیا تھا اور نادومیاں کے لیے دعائیں کی تھیں۔ سناڑے فارغ ہو کر انہوں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو دلہن ابھی تک نادومیاں پر گولیوں اور سبوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں۔ سو بی اماں پیش دالان تک چلی آئیں کہ دلہن کو ان کی قربت کا احساس ہوا اور نادومیاں بٹھے جائیں۔ جب سے دلہن نے گھونگٹ سے سر نکالا تھا انقلاب تازہ تر پیدا کرتی رہی تھیں اور بیچارے نادومیاں نے اس طرح ہتیار ڈال دیے تھے کہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن بی اماں نے آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھا کیوں کہ انہوں نے اپنے بہت چمیتے بیٹے کے لیے اپنی پسند کی بہو ڈھونڈی تھی۔ بات کر کے پرکھا تھا۔ چلا پھر کر دیکھا تھا۔

ناک نقشہ، رنگ روپ تو سامنے تھا ہی بس چینی کی گڑباعتی نازک نازک چھوٹی موٹی ہاں البتہ پاؤں قد و قامت کا لحاظ کرتے بہت چھوٹے تھے اتنے چھوٹے کہ نادومیاں اپنی دلہن کا جو تاخیر دیتے ہوئے شرماتے تھے لیکن ان پیروں کے غیر معمولی چھوٹے ہونے کا رتو نادومیاں کو دکھ تھا اور نہ بی اماں کو، اور ویسے تو بیچارے نادومیاں کو کسی بات کا دکھ نہ تھا اور اگر دکھ تھا سچی تو وہ زبان کیس طرح لاتے اس لیے کہ دلہن بی اماں کی پسند کردہ تھیں اور نادومیاں کی سعادت مندی خاندان بھر میں مثال تھی بی اماں دکھی تھیں کہ دلہن کی زبان بہت لمبی ہے اور دلہن کو پر کھنے وقت انھوں نے صرف چلا پھرا کر دیکھا تھا دو چار دن رہ بس کہ نہیں دیکھا اور ان کے لیے وہی بات خداب جان بن گئی جس کو انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ نادومیاں سے کچھ محبوب محبوب سی رہیں وہ سمجھ گئی تھیں کہ نادومیاں ابھی اس دنیا میں نہ آئے داخل ہوئے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھوں اوپر چڑیوں کے چھناکوں میں ابھی ان کے لیے اتنا رہ ہے کہ وہ دلہن کی دشنام طرازی میں صرف نزاکت آواز دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن بی اماں جہاں دیدہ تھیں انھیں یقین ہو چلا تھا کہ منقش اور چمکیلے کاغذوں سے سجی ہوئی زندگی کی یہ نگاری بس چند روز اور چلے گی اور پھر اندر چھپی ہوئی لکڑی باہر نکل آئے گی جس پر بہت سی خراشیں ہیں بہت سے دھبے ہیں۔ اور پھر پیسے بیٹھ جائیں گے یا جام ہو جائیں گے جس کی ذمہ داری دلہن کے چھوٹے پیروں پر نہ ہوگی بلکہ ان تمام باتوں کی ذمہ دار خود بی اماں ہوں گی۔ اور بی اماں کا دل جھج جاتا اور وہ محسوس کرتیں کہ سارا خاندان ان پر انگلیاں اٹھا رہا ہے بی اماں کے تینوں بیٹوں میں ایک نادومیاں ہی تو تھے جن پر خاندان کی شرافت ناز کرتی تھی۔ تعلیم میں سبھی یتیموں میں آگے تھے۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی نہ ان یتیموں نے ضرورت محسوس کی اور نہ بی اماں کے لادھیار نے انھیں اس کی اجازت دی۔ اور

واقعی انھیں ضرورت بھی کیا تھی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ نادومیاں کے والد انتقال کر گئے تو صرف سہی ہوا کہ دروازے پر چھوٹنے والا ہاتھی نہ رہا۔ متھان پر بندھے ہوئے اسٹیکٹور میں سے چھ گھوڑے فروخت کر دیئے گئے۔ گھیاں فروخت کر دی گئیں اور یہ سب کچھ بنی اماں نے اپنی دانشمندی سے کیا کہ گھر کے اخراجات کم سے کم ہو جائیں۔ اس لیے کہ اب کمانے والا ہی نہ رہا تھا جس کی جیتوں کے طفیل یہ سارا کرو فرم تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے نادومیاں کی شادی اس دھوم دھام سے کی کہ مرحوم شوہر کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا یہ اور بات ہے کہ نواب سلیم کی شادی کا مقابلہ نہ ہو سکا اور نہ بنی اماں اتنا خرچ کرنے کو اب تیار تھیں۔ اس وقت مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے بل بوتے پر کیا اور ایسا کیا کہ شہر کی گنی چنی شادیوں میں نواب سلیم کی شادی کا شمار ہوتا ہے اور لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں لیکن اب بنی اماں سمجھ گئی تھیں کہ مرحوم کی عزت و آبرو کو قائم رکھنا ان کے اپنے ہاتھ ہے۔ دولت کا کیا ہے لٹاؤ تو بل بھر میں لٹ جائے، پیدا کرنے میں جو تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے مرحوم کی بات اور تھی ان کے باپ داداؤں نے جانیں قربان کی تھیں تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں متول ورثے میں ملا تھا اور اب ان کی عزت بنی اماں کے ہاتھ تھی۔ چاہیں تو سنبھال لیں چاہیں تو سر بازار نیلام کریں۔ اور اسی لیے بنی اماں اپنے لادلوں کی شادی بیاہ کے مسائل میں بہت زیادہ محتاط تھیں۔ اس لیے کہ متول کو قائم رکھنے کا اب ان کے پاس میرا ایک ذریعہ تھا۔ بڑے گھر کے لڑکوں کو بڑے گھروں کی بیٹیاں ہی بیاہی جائیں تو سونا سونے کو کھینچے گا اور خاندان کی آن بان باقی رہے گی سو اسی لیے نادومیاں کے لیے انھوں نے متول گھرانے کی اکلوتی بیٹی تلاش کی اور دلہن کو خوشی خوشی گھر لے آئیں۔ دلہن بھی اپنے ساتھ وہ سب کچھ لائی تھیں جو بنی اماں کے خاندان کے شایان شان تھا اور جو کچھ دلہن لے آئی تھیں اس کو بنی اماں نے

پہلے ہی ٹھوک بجا کر دیکھا تھا لیکن کچھ چیزیں دلہن نے گھونگٹ میں چھپا کر رکھ لی تھیں اور دلہن والوں نے بی اماں کی نظر بچا کر یہ چیزیں بھی دلہن کے ساتھ کر دیں کیوں کہ یہ دلہن کو ورثے میں ملی تھیں اور بچپن سے اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں لیکن جب دلہن نے گھونگٹ اٹھا تو بی اماں بوکھلا گئیں اور بچارے نادومیاں سہم گئے۔ اور بی اماں سمجھ گئیں کہ سونے چاندی سے لدی ہوئی اس گڑیا کے اندر باروت بھری ہوئی ہے جو آہستہ آہستہ دھماکے پیدا کرتی ہے اور نادومیاں سینہ میں چونک پڑتے ہیں۔

دلہن کی تنک مزاجی اور تلون سے پہلے پہلے تو بی اماں دکھی رہیں پھر آہستہ آہستہ خائف ہوتی گئیں لیکن وہ بھی آخر ساس تھیں کتنک اچھے خاصے گھر تو دوزخ بنتا ہوا دیکھتی رہیں۔ وہ تو نادومیاں جیسے بر غور دار اور نیک حلن بیٹی کی صورت تھی جو انھوں نے اپنے پتے کو مار کر رکھ لیا تھا لیکن ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ زیادہ ستایا جائے تو آدمی خدا کو گالی دینے سے بھی نہیں چوکتا پھر یہ تو ٹھہری بیوی۔ بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھیں تو بی اماں خاندانی سمجھاؤ سے ان سے دو ہاتھ بڑھ چڑھ کر ہی تھیں۔ کجواب کو ٹاٹ کا پسوند تو لگایا نہیں تھا جو دلہن والوں سے ان کی کٹی دہتی۔

ایک دن دلہن بہت برس رہی تھیں۔ بات صرف یہ تھی کہ دلہن کو شکرام میں سوار ہو کر تفریح کرنے کی سوجھی۔ نادومیاں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوری پھرے دار کو دوڑایا لیکن وہ کجخت پتہ نہیں کہاں جاما۔ دلہن بناؤ سنگار کر چکنے کے بعد بھلا کتنک اشتعال کر تیں کچھ طبیعت مکدر ہو گئی اور انھوں نے نادومیاں کو نشانہ بنایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ دیر ہو رہی ہے تو نادومیاں خود شکرام لانے کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور بچارے نادومیاں تھے کہ اس خیال سے ہی پانی پانی ہوئے جارہے تھے۔ شرم دامن گیر تھی اور وہ بالکل حق بجانب تھے جس کے گھر پر ہاتھی جھولتا تھا جس کے آنکھ اٹھانے پر بیسیوں ملازم دوڑ پڑتے تھے وہ

بھلا شکر ام کے اڈے پر شکر ام لسنے کے لیے جاے۔ لیکن دلہن کی ضد کے آگے انہوں نے کبھی مسلح ہونے کا تصور تک ذہن میں آنے نہ دیا۔ وہ خود کو اس طرح تسلی دے لیتے تھے کہ دلہن ٹبرے ہی ناز و نعم میں پروان چڑھی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ دلہن کے والد جب گھسکر باہر جاتے تو بلا مبالغہ سات بار اپنی بیٹی کے چہرے پر سے اپنا سر اتارتے۔ اب جب کہ دلہن اتنے چاہنے والے باپ کی آغوش سے آئی ہیں تو نادومیاں کو ناز برداریاں کرنا ہی پڑیں گی۔ چنانچہ وہ اہستہ سے بی اماں کی نظر پکڑ کر باہر نکل گئے اس لیے کہ اگر یہ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچ جائے تو وہ بہت برہم ہوں گی کہ لو بھی ٹبرے صاحبزادے نے کوٹھل پیر آبرو گنوائی تو چھوٹے صاحبزادے کی کوچوں کے چور ہے۔ نادومیاں بھی محبت میں گھر کے صدر دروازے تک تو جلیپنے لگیں اس سے آگے ان کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ سوچ کر انہوں نے سائیس کو دوڑایا اور خود وہیں انتظار کرتے دروازے کے پٹ پر پاؤں ٹکا کر تنگ مہری کے پاجامے کی چڑیاں درست کرتے رہے۔ بی اماں کے منہ چڑھے خواجہ سرا کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح یہ بات جا پہنچی تھی کہ خود نادومیاں دلہن کی ضد پر شکر اموں کے اڈے تک بھاگے بھاگے گئے ہیں۔ کانوں میں بھنک پڑنے کی دیر تھی کہ خواجہ سرا نے حق نمک ادا کیا۔ دلہن سے سوکنا پے کا پیر تو تھا ہی کیوں کہ میاں خواجہ سرا جھپٹن ہی سے نادومیاں پر مرتے تھے۔ کھیلے کھیلے بس یوں ہی نادومیاں کو چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ تنہائی میں سرکار اور دلدار کہہ کر پان کی گھوریاں پیش کرتے تھے۔ دیدے اور کر مٹکا مٹکا کر نادومیاں کے قدموں میں بچھ بچھ جاتے تھے لیکن نادومیاں تھے کہ پتھر کی چٹان بنے ہوئے تھے۔ نہ کھل کر ہنستے نہ ہنس کر کھلتے، البتہ جب وہ اپنے بھائی جان کو خواجہ سرا کی کمر میں زور زور سے گدگدیاں کرتا ہوا دیکھتے تو دوسرے ہی لمحے ان کی نظریں گلابن بوا کے اداس چہرے پر بھی پڑتیں جو بھائی جان کے حجرے میں دروازے کی اوٹ سے خواجہ سرا کے مخروں کو

دیکھ دیکھ کر سروالے کی طرح بل کھاتیں لیکن جب سے دلہن گھر کی زینت بنی تھیں میاں خواہرا کو اس بات کی توفیق نہ ہوتی تھی کہ وہ نادومیاں کی خدمت میں پان کی گھوڑیاں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں دن باند میاں نے صوف اتنا محسوس کیا تھا کہ میاں خواہرا سرالان سے بہت کچھ کچھ رہتے ہیں اور بدھ گلبدن بوا میں اور ان میں اکثر تو تو میں میں ہوتی۔ آج میاں خواہرا کو دلہن سے ناتہ پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو اس نے بی اماں پر بھر پور روار کیا۔ دوپٹے سے آنکھیں پونچتے ہوئے بی اماں کے قدموں میں جھک گیا اور لگا سوسے بہانے۔ انھوں نے شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ چیر کر احوال پوچھا تو سکیاں لیتے ہوئے نہایت ادب سے ان کے گوش گزار کیا کہ نادومیاں کو دلہن نے شکر مول کے ادب پر بھیجا ہے وہ بہتیرا معذرت خواہی کرتے رہے لیکن دلہن کی تریباہٹ پر وہ باپ دادا کی ہڈیاں اکھاڑ پھینکنے سے بھی نہ چو کے۔ بی اماں کی آنکھیں بھی بھڑکیں ایک گرم لوہے کی سلخ ان کو اپنے حلق سے سینے تک جھلستی ہوئی سی محسوس ہونے لگی اور وہ آنسو پینے کی کوشش کرتی ہوئی سیدھی دلہن کی چوکھٹ تک آہنچیں دلہن پہلے ہی سے منہ پھلائے تھیں بی اماں نے جلی کٹی سانی تو وہ لگیں چھوٹ چھوٹ کر بن کر بنے نادومیاں نے اندر قدم رکھا تو نقشہ بدلا ہوا پایا بی اماں برستی رہیں۔ اجداد کی آبرو کے منہ جانے کا ماتم کرتی رہیں اور دلہن نے میکے کا رخ کیا۔ نادومیاں بیچارے سچی پھی آنکھوں سے ٹکڑ ٹکڑ دیکھتے رہ گئے جس شکرم میں دلہن کو سیر کرانے والے تھے اسی شکرم میں بیٹھ کر دلہن میکے سدھاریں۔ جس گھر میں اپنی توہین ہوئی تھی اس گھر کی بگھی اور گھوڑوں کا احسان اٹھانے کو وہ کیسے تیار ہوتیں۔ نادومیاں دھڑکتے دل کو ستھام بھی نہ سکے۔ ان کے سینے کے اندر کھن میں کھیلا ہوا رٹبر کا گولہ جیسے ٹپ ٹپ اچھلتا رہا لیکن ان کے ہاتھوں میں جیسے اس گولے کو پکڑ لینے کی سکت ہی نہ رہی۔ وہ چپ چاپ دلہن کو شکرم میں سوار ہوتا ہوا دیکھتے رہے سینے میں اچھلتے ہوئے رٹبر کے گولے نے جیسے اندر کے ٹھہرے ہوئے پرسکون پانی کو اوپر

اچھالا شکرم آگے بڑھی تو۔ سینے کے اندر اچھلتا ہوا پانی آنکھوں کے راستے پلکوں تک اسپنچا، اور ذرا سا رک کر آہستہ سے گالوں پر ڈھلک آیا لیکن دلہن نے اس طفسر نظر اٹھانے کی زحمت تک نہ کی۔ شکرم ابھی ڈیوڑھی کے اعلیٰ سے نکلی بھی نہ تھی کہ دروازے پر ایک گلی رکی اور نادومیال آہستہ سے برابر کے صطبل میں کھسک گئے۔

بہت آہستہ سے پاشاہ بیگم نیچے اتریں تو ان کو سہارا دیتے ہوئے یاسمن بوانے کہا کہ بیٹا اللہ نے تمہیں نشتر بننا کر بھیجا ہے دلہن بد مزاج ہسی لیکن نادومیال کی چپتی تو بس میں دوش بڑی بیگم صاحبہ کو نہیں دیتی سارا کیا دھرا دلہن کا ہسی نصیحت فصیحت بعد کو ہوگی بیٹا اب تو صرف خاندان کی لاج رکھنی ہے۔ یہی نام ہوگا کہ ذرا سا برامان کر بیٹے نے گھر سے میکے کا رخ کیا تو کسی نے روکنے سمجھانے کی تکلیف بھی نہیں کی اٹے گھر سے نکال دیا اور وہ بھی کراے کی شکرم میں پاشاہ بیگم سمجھ گئیں۔ پہرہ دار سے کہا کہ لپک کر بڑا پھانک بند کر دے اور خود گلی میں سہا ہو جائیں۔ پھانک پر پہنچ کر شکرم رک گئی تو دیکھتے کے دیکھتے پاشاہ بیگم کی گلی نے اس کو جالیا۔ دلہن سمجھیں گلی میں نادومیال ہوں گے لیکن پاشاہ بیگم برآمد ہوئیں تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ کہنے لگیں کہ اس قدر بے عزتی کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو تمہارے بھائی صاحب تو میرا منہ کالا ہوتا ہوا دیکھتے رہیں اور تم اس قید خانے سے نکلنے کے راستے مسدود کرتی پھر وہ جس گھر میں ایروں غیروں کی حکومت ہو اس میں مجھ نصیبوں جلی کی لاج رہ چکی بس۔ کس منہ سے واپس لے جانے آئی ہو۔ بہتر تو یہی ہے کہ اپنے بھائی صاحب کو زترین مشوروں سے نوازو کہ وہ اپنی اماں کی پسند کی کوئی شریف زادی کر لائیں۔ اسلام میں چار نکاح جائز جو ہیں۔ اور پھر نکاح بھی کون ضروری ہے کسی کو تمہارے چٹ پٹ کرتی بازارن کو اٹھالائیں اور نیند میں چونکنے نہ دیں۔ اس کے اللہ تلے سننے میں لطف جو ہے۔ اماں بھی خوش رہیں گی۔ بڑے بھائی صاحب نے تو مثال قائم کر ہی دی ہے یہ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں پھر نام بہت روشن ہو گا۔ اماں جان گلی کے چرلغ جلا لیں گی۔

پاشاہ بیگم کے ہونٹ سوکھتے رہے اور وہ زبان پھیر پھیر کر رہ گئی۔ بڑے باپ کی بیٹی تو وہ سبھی تھیں لیکن دلہن کے آگے ان کی ایک نہ چلی سو جتنی رہ گئیں کہ کیا کہا جائے کیا نہ کہا جائے۔ یاسمن بوا بھی اس وقت تک رہ چھپ رہ چھپ خود کو سنبھالتی آہستہ سنبھالتی پاشاہ بیگم پر نظر پڑی تو یاسمن بوا کے قدم جیسے زمین میں گرے کے گرے رہ گئے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ سسے قدم تک کانپ رہی تھیں۔ یاسمن بوا نے جھپٹ کر پاشاہ بیگم کو سنبھالا۔ سہارا دے کر لمبی میں سوار کیا اور تین لمبی نظروں سے دلہن کو دیکھا تو دلہن نے چھپاک سے شکرم کی چلیں جھٹک دی۔ پاشاہ بیگم لمبی میں سوار ہو کر اٹھی سیدھی سانسیں درست کر سکیں تو چلیں سے سر نکال کر سپرہ دار کو دیکھا کہ بھول دینے کا حکم دیا اور شکرم کی طرف منہ پھیر کر کہنے لگیں کہ اب یہ چھٹا تک صاف رنڈیوں اور کسبیوں کے لیے ہی کھلے گا اور تم اپنے سیکے میں اپنا اچار ڈالو اتنی رہو دلہن نے جواب دینے کے لیے چلیں سے سر باہر نکالا تو لمبی نہایت اطمینان سے تڑپڑ کر تکی آگے بڑھ گئی تھی۔

دلہن گھم گھم پھیں تو جیتے ہوئے دنوں کی فوج کی فوج جیسے دروازے میں سے نکل کر سامنے مارچ پاسٹ کرنے لگی۔

بکرا ذرا خچف تھا۔ نواب جنگ اپنے خاںسا مال پر بہم ہوئے۔ داروغہ مطبخ نے آٹھ آدمیوں کے لیے سخت کی اور بارہ فقیروں کو کھانا کھلا دیا فقیروں نے آدھا پیٹ کھانا کھا کر ہی رانی بیٹی کی صحت کے لیے پیٹ بھر کر دعائیں دیں لیکن یہ بات نواب جنگ کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی۔ اسی رات رانی بیٹیا کا بھارا ایک سو پانچ ڈگری تک جا پہنچا موسو طرح کے وسوسے اور وہاں نواب جنگ اور بیگم کے دل و دماغ پر لگدھول کی طرح منڈلانے لگے۔ اکیس روپیوں کی ریزنگاری منگوائی گئی اور رانی بیٹیا کے سیدھے ہاتھ سے چھو کر نواب نے اپنے سامنے غریبوں میں تقسیم کروادی۔ عشاء کی نماز کے بعد نواب نے سجدے سے سر اٹھایا تو

سیگم نے دیکھا جانا زبیمگی ہوئی تھی۔ آدمی آدھی رات تک نواب آیت الکرسی پڑھ کر بیٹھ گیا۔
 رہے صبح ہونے تک بخار کم ہوا۔ صدقہ دینے بکرا منگایا گیا تو داروغہ مطہج نے اس میں بھی اپنے
 نو عدد بچوں کا حصہ شامل رکھا۔ صدقہ اتار کر بکرا یتیم خانے کے حوالے کر دیا گیا اور داروغہ صاحب
 برٹن کر دیئے گئے۔ آج دہن کے سامنے بیتے ہوئے دفنوں کی فوج نے مارچ پاسٹ کیا تو انہیں
 فوجیوں میں سے ایک نے ان کے والد نواب جنگ کی ان سے بے پناہ محبت کی ایک تصویر
 ان کے سامنے سے گذار دی لیکن دہن نے اس تصویر میں یہ کہیں نہیں دیکھا کہ بکرے کے ساتھ
 داروغہ جی اور ان کے نو عدد بچے بھی رانی بیٹیا پر سے تصدیق کر دیئے گئے۔

فرزانہ آپادولھے والی تھیں پر اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ ہمیں خاطر ہی میں نہ لائیں
 ابابھلا میری توہین برداشت کر سکے ہیں کبھی۔ ”پاؤں مینز“ کا رسم آیا تو چاندی کے گنگن اور پٹا
 پر سونے کا ملمع تھا اور پھر مہر النساء کے ہاتھ پاؤں ہی کتنے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دلہا میاں
 سے وہ قدمیں کچھ نکلتی ہوئی ہی تھیں۔ اور پھر ویسے بھی مہر کے آگے سلیم صاحب بس نام ہی کے
 شہزادے تھے۔ کہاں مہر النساء لندن کی بیٹی ہوئی اور کہاں جاپان کے سلیم میاں۔ ستر روپے کلدار
 میں ابامیاں نے ”ٹائے امپوریم“ کو آرڈر دے کر مہر کو منگوایا تھا۔ پارسل کھلا تو کس احتیاط سے
 مہرورانی لکڑی کے ڈبے میں آرام کر رہی تھیں۔ تیس تیس روپے کے جاپانی سلیم صاحب سے
 مہر کو بیاہتے وقت ہم نے فرزانہ آپا کی خاطر یہ تک نہ سوچا کہ مہر اور سلیم کا جوڑ نہیں سلیم میاں
 تو بس نام کے شہزادے تھے۔ اس کے باوجود بھی ہم نے جنیز میں کوئی کسر اٹھانہ لگی۔
 ”پاؤں مینز“ کی رسم دیکھی تو میری آنکھ سے آنسو ہی تو بھل گئے۔

جاپان کے سلیم میاں سے لندن کی مہر و بیاہ دوں اور اس پر سیلیوں کے سامنے طمع
 کی پازیب اور گنگن بتلا کر اپنی آبرو گنوا بیٹھوں۔

ابامیاں اس قدر برہم ہوئے کہ بس رشتہ ٹوٹ ہی تو رہا تھا۔ فرزانہ آپا نے

فراست سے کام لیا اور گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کر دی۔ ابامیاں تو اس پر بھی راضی نہ تھیں گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کی بجائے زیادتی بھی ہو سکتی تھی لیکن مہر کی شادی میری شان کے مطابق ہونا ہی تھی۔

فرزانہ آپا نے مجھے بچکارا۔ سو بار تو چوما ہو گا میری پیشانی کو۔ بات اس قدر پچی ہو کر ٹوٹ جاتی تو بے عزتی کے سوا حاصل کیا ہوتا میں نے بھی سوچا فرزانہ آپا اور میں کچھ جدا نہیں۔ ان کی بے عزتی میری بے عزتی ہے اور میں نے ہاں کر دی۔

پھر شادیانے بچے، شہنائیاں بجیں۔

پلکوں پر رر کے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ دلہن بہت دل گیر ہو گئیں۔ جس کی گڑیا کی اتنی عزت تھی آج خود اس کی اس طرح تو بن ہوئی۔

بیٹے ہوئے ایام کی مارچ پاسٹ کرتی ہوئی فوج جانے کو نسی کو نسی تصویریں دلہن کے سامنے سے گذارتی رہتی لیکن شکرم صدر دروازے تک گئی تو دلہن چو نکلیں۔ آج وہ کچھ اس طرح اپنے میکے آئی تھیں کہ کوئی خوش آمدید کہنے والا بھی دروازے پر موجود نہ تھا۔

شکرم کا دروازہ کھلنا تھا کہ مراد خاں پہرہ دار کے پہلو سے دل آرام بواست پٹا کر اٹھیں تو یہ بھی بھول گئیں کہ مراد خاں نے ان کے دونوں ہاتھوں کو انہیں کے دو پیٹے سے کس کر باندھ دیا ہے۔ دلہن پر نظر پڑی تو بس چیخ ہی تو نکل گئی منہ سے اور وہ چھلانگ لگا کر مراد خاں کی چوڑی چکی پیٹھ کے پیچھے جا رہیں۔

دلہن نے بھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ طوفان بھلا کس کا انتظار کرتا ہے۔ دلہن کے سینے میں کتنے ہی طوفان پھر رہے تھے بس وہ آنسو پونہ پختی ہوئی دیوان خانے تک جا نہیں دل آرام بوانے بھی نوچ ناچ کر دہ پیٹ ہاتھوں سے الگ کیا اور الٹا سیدھا سینے پر ڈالتی ہوئی اندر بھاگیں۔ مراد خاں نے صرف اتنا سا کہ بادلے کتے میں نہ کہتی تھی کہ دروازہ

اندر سے بند کر لے۔ لیکن باولے کتے کو اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ جاتے جاتے دل آرام ہوا کا انہیٹھ گئی ہیں۔

دل آرام ہوانے دلہن کو بچ صحن میں جا لیا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دشمنوں کا مزاج پوچھتی رہ گئیں۔ لیکن دلہن جیسے پکا پھوڑا بنی ہوئی تھیں کسی نے ہلکا سا شتر لگایا اور پھوٹ بہیں۔ دل آرام ہوانے مزاج کیا پوچھا دلہن سسک سسک کر رونے لگیں۔ بڑی ہیلم صاحبہ یعنی دلہن کی ماں غالباً غسل خانے میں تھیں دلہن کی آواز سنیں تو بس گیلے بال جھٹکتی ہوئی صحن تک آئیں اور دہلیز پر بری طرح گرتے گرتے سنبھلیں۔ ماں نے سینے سے لگایا تو پھر کچھ نہ پوچھے بیچاری دلہن کس کس طرح روتی ہیں۔ پیٹ کر۔ پیر پیٹ کر۔ بڑی ہیلم صاحبہ پوچھتی رہیں اور جواب میں دلہن یہی کہتی رہیں کہ ایسے گھر میں میری شادی کیوں کی جہاں ایروں غیروں کے آگے میری سبکی ہوتی ہے۔

نواب جنگ نے تفصیلات سنیں تو بہت برہم ہوئے۔ ناشتہ کیا نہ دوپہر کو کچھ کھایا پیا۔ بے چین اور مضطرب دیوان خانے میں ٹہلے ٹہلے تصویر فریٹھیجے جاتے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور ٹہلنے لگتے۔ بیٹی کی بے عزتی ان کی بے عزتی تھی۔ چاہتے تھے کہ فوری انتقام لے بیٹھیں اور سمجھن کو وہ وہ بے بجاؤ کی سنائیں کہ عقل ٹھکانے لگ جائے ان کی۔ لیکن سگم نے اپنے نرم ہاتھوں سے ان کی غلامی کے کوٹ میں چھپی ہوئی پیٹھ کو سہلا سہلا کر انھیں ٹھنڈا کیا۔ دلہن نے خود اپنے ہاتھوں سے نواب جنگ کو کھانا کھلایا۔ کھاپی کر سنبھلے تو لا بریری میں جا بیٹھے بڑی بڑی شیشے کی الماریوں میں موٹی موٹی انگریزی خوبصورت کتابیں جمی ہوئی تھیں جلدوں کی سنہری اور ردھلی تحریریں اپنی کرنیں لا بریری میں آنے والوں پر چمکتی ہیں اور انھیں طرح طرح سے رجباتیں لیکن نواب جنگ سے لے کر ان کے ملے والوں تک کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ ان کا منوس وغنوار ستا تو صرف رحمن فراش متاجور و زانہ الماریوں کے

شیشوں کو صاف کرتا اور کبھی کبھی ڈسٹر سے انہیں بھی لگے دیتا تو وہ جیسے باوجود اپنی ساری ناقدریوں کے رحمن فراش کی ممنون ہو جاتیں۔ رحمن فراش سمجھتا کہ نواب جنگ انہیں کتابوں کی بدولت آج اس حد پر ہیں۔ لیکن کتابیں کسی طرح بھی رحمن فراش سے نہ کہہ سکتی تھیں کہ نواب جنگ نے انہیں کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اور اب انہیں سلور فش (SILVER FISHES) کا ایک خاندان کا خاندان پڑھ رہا ہے۔ چاٹ رہا ہے۔ اندر ہی اندر کہہ کھلا کر رہا ہے اور بہت جلد نواب جنگ کے دماغ کی طرح وہ بھی اندر سے بالکل خالی غولی ہو جائیں گی۔

میز پر پہنچ کر نواب جنگ نے کاغذ سامنے کھینچا تو سمجھا ہوا غصہ دبے پاؤں ان کے دماغ میں اس طرح داخل ہونے لگا جس طرح ان کے اطراف پھیلی ہوئی شیشوں کی مقفل الماریوں کی سچی ہوئی خوبصورت کتابوں میں سلور فش داخل ہو گئی تھیں۔ نواب جنگ نے قلم اٹھایا اور نادو میاں کو ان کے آباد اجداد کو۔ ان کے خاندان کو سب کو ایک سانس میں نوازا دیا۔

خط پہنچا کر ہر کارہ رسید لے آیا تو نواب جنگ کو سکون ہوا۔

کمرے میں مسہری پر اوندھے پڑے پڑے نادو میاں سوچتے رہتے کہ دلہن کو منا پھٹلا کر کس طرح واپس بلایا جائے۔ ان کی خاموشی اور بے چینی کو سارا گھر کا گھر محسوس تو کرتا لیکن کوئی بھی کلمے بندوں ہمدردی نہ کرتا۔ سمجھوتے کے لیے عملی اقدام کرنے کی تو بات دور رہی۔ وہ سبھی کسی سے کچھ نہ کہتے۔ روز صبح ٹوپی سر پر رکھ کر بی اماں کو آداب بجالاتے۔ بی اماں سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتیں کہ سارے زمانے کی خوشیاں نادو میاں کے حصے میں آجائیں۔ لیکن نادو میاں یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ان کی رہی سہی ساری کی ساری خوشیاں دلہن اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور بی اماں نے ہی دلہن کو اکسایا ہے کہ وہ نادو میاں کو لوٹ لے۔ نادو میاں کے گھر والوں کی طرف سے پہل کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ایسے اقدام سے ایک تو بی اماں کی شکست تسلیم کرنی پڑتی دوسرے دلہن کی مزاج داریوں کو برداشت کرتے رہنے کا سلسلہ جاری

رہتا۔ بی اماں کے وقار نے کسی کو اجازت نہ دی کہ نادومیاں پر رحم کھائیں اور ان کی
نخعی سنی گڑیا کو منالائیں جس کی طراری اور تلون کے باوجود وہ اسے محبت کرنے لگے تھے۔ دلہن
والے اپنی جگہ برہم تھے کہ جب تک نادومیاں اپنے کیے پریشیاں نہ ہوں اور معافی نہ مانگ لیں
اور آئندہ سے دلہن کی شان میں ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنے کا یقین نہ دلائیں۔ دلہن
کبھی ادھر کا رخ نہ کریں گی۔ نادومیاں کی خاموشیوں اور اداسیوں کو دیکھ کر بی اماں سناڑ
کے بعد دعائیں مانگتیں کہ اللہ پاک تو دلہن کو عقل عطا کر وہ جلدی آئے اور معافی مانگ لے۔

بی اماں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے سہمی نواب جنگ نے نادومیاں کو خط کے ذریعہ
اس قدر نوازا ہے کہ اللہ میاں بھی بیچ بچاؤ کے لیے درمیان میں پڑتے تو سبھی حامل کچھ نہ ہوتا
یا خود بی اماں یہ خط دیکھتیں تو سناڑ میں دعائیں نہ مانگتیں۔

چھ مہینے کی طویل مدت تک نادومیاں تڑپ تڑپ کر گزارتے رہے۔ دلہن ان کی زندگی
میں برقی رو کی طرح داخل ہوئیں ان کے دل و دماغ کو جیسے لمحے بھر کے لیے جھنجھڑا اور سہرے غائب ہوئیں
انڈیری رات میں ایک چھوٹے سے باغ کے تاریک گوشے میں ایک جگنو چمکا۔ نادومیاں
بیچارے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آسمان پر بجلی چمکی اور چمک کر دو چار لمحوں کے لیے اپنی پوری تابانی
کے ساتھ جیسے جامد ہو گئی۔ نادومیاں نے دیکھا تو بیچاروں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اب پتہ نہیں
وہ روشنیاں کہاں ہیں نادومیاں صفِ ملکین جھپکتے رہ گئے ہیں۔

دل کے تاریک نہاں خانے میں جیسے نورِ تنہا کی ایک کرن لجاتی آتی لیکن بی اماں
نے دل میں ناچتی ہوئی اس نخعی سی کرن کو مکڑ کر نادومیاں کی زندگی کو بے نور کر دیا۔
نادومیاں کچھ اسی طرح سوچا کرتے۔

دلہن زیادہ دنوں نادومیاں کے ساتھ رہتیں تو بہت ممکن تھا کہ دلہن کے قلعے سے
نادومیاں کے سوچنے کا انداز کچھ مختلف ہوتا۔ ابھی تو دلہن کی طراری، زبان درازی اور

اُجلی پرچھائیاں

گرتی دیواریں

تنگ مزاجی میں بھی نادومیاں کے لیے کشش تھی۔

شربتِ ناگلاس بی اماں نے نادومیاں کے مونٹوں سے لگایا۔ وہ ایک ہی گھونٹ لے سکے تھے کہ بی اماں نے گلاس ہٹالیا کیوں کہ بی اماں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس گلاس میں کچھ کڑواہٹیں اور تلخیاں بھی ملا دی ہیں جس سے نادومیاں کا منہ خراب ہو جاتا۔ یقینی ہے لیکن نادومیاں نے صرف ایک گھونٹ پیا تھا اور مونٹوں پر زبان ہی پھرتے رہ گئے۔ اور پھر اس میں ان بیچاروں کا قصور ہی کیا تھا۔ بالکل چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح وہ شہد چٹانے پر چٹخارے لیتے اور کوئین پلا دینے پر ابکیاں، کوئین کی شیشی کو زمین پر ٹپک کر شہد کی شیشی کو ہاتھ میں ستھام لینے کی سعادت مندی نے انہیں اجازت ہی نہ دی؟ گھر ماکھی چھٹیلاں ہوئیں تو نواب رمضان علی خاں گھر چلے آئے جو کئی سال سے اٹاؤے میں اسی جماعت میں پڑھ رہے تھے جس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ چھوٹے بھائی کی آمد پر نادومیاں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی بیڑی میں ان کا کوئی غمخوار بھی ہے۔

گھر میں ذرا چل پہل بڑھ گئی۔ گلابدن بوا دن میں تین بار صابن سے منہ دھونے لگیں۔ خواجہ سرانے زردوزی کے کام کا لال روپہ پھر نکالا۔ انجمن بوا کی بیٹی نے سبویاں پوتے والی سے ایک چھوٹا سا آئینہ خریدا جس کو نیٹے میں اڑس کر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ لیتی۔ گلابدن بوا براہِ صابن سے منہ دھوتی رہیں اور انجمن بوا کی بیٹی دن میں دس بار اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر زلفیں سنوارتی رہیں۔ البتہ بیچارے خواجہ سرانے زردوزی کے کام کا لال روپہ اتار چھینکا اور ساتھ ساتھ کبھی گلابدن بوا کو کو سا تو کبھی انجمن بوا کی دختر نیک اختر کو بد دعا میں دیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔

نادومیاں اب پہل قدمی کے لیے کبھی کبھار بھائی کے ساتھ باہر بھی نکلنے لگے کبھی کبھی نانک اور سینا بھی دیکھنے لگے۔ شام کا ٹھوڑا سا وقت وہ رمضان نواب کے ہمراہ

ادھر ادھر گزار لیتے لیکن دن اور رات انہیں دلہن کی کمی بری طرح محسوس ہوتی اور بچا کہ
اواس ہو جاتے۔

ایک دن صبح ہی سے رم جم جم پھوٹا رہی تھی۔ نادو میاں بہت دل گیر تھے
دن بھر یاد دل چھائے رہنے کی وجہ سے سارے ماحول پر اداسیاں مسلط تھیں۔ لیکن
نادو میاں کے دل پر تو گھٹائیں کچھ اس طرح چھائی تھیں کہ نہ کھلتی تھیں نہ بستی تھیں۔
کبھی ترنگ میں ہوتے تو نادو میاں بستر پر اوندھے پڑے عجیب عجیب حرکتیں کرتے
رہتے۔ کبھی گلے پر چھری پھیر کر سچنکے ہوئے مرغ کی طرح تڑپ کر دو تین منٹ میں ٹھنڈے
ہو جاتے۔ کبھی تکیوں سے چٹتے۔ کبھی سگریٹ تک رضائی اڑھتے جیسے رضائی کے
اندر رتھر تھر متھر کانپتے رہتے۔ کبھی اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرتے اور بہت سنجیدہ رہتے
چپ چاپ اوندھے پڑے ٹانگ ہلاتے رہتے۔ جانے کیا کیا ہوتا۔ نادو میاں بس رونے لگتے
یہ بھی نہ سوچتے کہ بڑے بھائی جان کو ٹھے سے چو آنی جان کو چپکے سے اٹھالائے۔ اس
واقعہ پر راز کے بڑے موٹے موٹے پردے ایک عرصہ تک پڑے رہے لیکن جب بی اماں
کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی مصلحتاً اس کو راز ہی رہنے دیا اور کچھ اس طرح اپنا رویہ
رکھا جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ کیوں کہ بی اماں نے سوچا کہ اگر یہ راز راز ہی رہے
تو صاحبزادے پر کم از کم ان کا رعب تو رہے گا ورنہ یہی سہمی آن بھی جاتی رہے گی۔
لیکن بہت جلد صاحبزادے کو معلوم ہو گیا کہ بی اماں کے کانوں تک ساری باتیں پہنچ گئی
ہیں لیکن انہوں نے اپنے رعب داب کی بقا کے لیے راز کا ایک پردہ چھوڑ لیا ہے۔
اس طرح دوسرے تو کسی نہ کسی طرح اپنے من کی کر لیتے لیکن نادو میاں بس
ٹانگ ہلاتے اوندھے پڑے رہتے۔

لیکن آج انہوں نے ارادہ کر ہی لیا کہ مضامین سے مدد لیں گے۔ کیوں کہ

مضومیوں یعنی نواب رمضان علی خاں ہی اس بھری دنیا میں بھاؤ تنہا انھیں ہمدرد نظر آئے۔ چنانچہ انھوں نے مضومیوں کو ہموار کر لیا کہ وہ ان کے خستہ صاحب اور اپنی دلہن بھانج سے ملیں۔ نادومیوں کی دکھی زندگی کا خاکہ کھینچیں اور دلہن کو لوٹ آنے کے لیے آمادہ کر لیں۔ نادومیوں نے مضومیوں سے اس قسم کی بات بہت دل کڑا کر کے کی تھی لیکن بات ختم ہونے تک ان کی ہلکوں پر دو چار خطے کسی نہ کسی طرح چمکتے ہی رہے۔

مضومیوں اپنی دلہن بھانج اور ان کے والد نواب جنگ سے مل آئے لیکن نادومیوں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ نواب جنگ کی برہمنی بدستور قائم تھی کہ ان کی بے عزتی ہوئی ہے اور اس توہین کا ازالہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ مضومیوں کی والدہ خود اپنی غلطی پر نادم ہوں اور دستِ صلح دراز کریں۔ نواب جنگ نے مضومیوں کو سمجھایا کہ یہ باتیں ٹبروں ہی کے طے کرنے کی ہیں بچوں کو ان مسائل کے طے کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ اور ہر ادھر کی باتیں کر کے مضومیوں کو لوٹ آئے، تو نادومیوں کے لیے تو انھیں کچھ نہ ملا۔ البتہ دلہن کی مسکراتی ہوئی نظروں کو انھوں نے دل و دماغ میں چھپا کر رکھ لیا۔ شادی میں وہ شریک نہ ہو سکے تھے نہ دلہن نے انھیں دیکھا تھا نہ انھوں نے دلہن کو۔ نواب جنگ البتہ مضومیوں سے واقف تھے۔ آج نواب جنگ نے دلہن کا ان سے تعارف کرایا تو مضومیوں کو بیچارے نادومیوں کی بھگی ہوئی آنکھیں یاد آئیں۔ وہ دلہن کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے رہے کیوں کہ ان آنکھوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنکھیں لاوے سے انھیں کچھ بھی مطلب نہ تھا۔ یہ آنکھیں اگر شعلہ بارہوں بھی تو مضومیوں کو توڑے ہی جھلس جائیں گے۔ ان شعلوں سے انھیں واسطہ نہ تھا وہ تو نادومیوں کے حق کے کی چیز تھی۔ مضومیوں تو صرف اس چمک سے ناتہ جوڑنا چاہتے تھے۔

مضومیوں گھر لوٹے تو نادومیوں منتظر تھے۔ نادومیوں نے دلہن کے بارے میں ساری باتیں دریافت کیں۔ گفتگو کے وقت وہ کیا کرتی رہیں۔ کچھ دہلی ہوئی ہیں یا موٹی ہوئیں۔

کچھ ان سے کہنے کے لیے تو دلہن نے نہیں کہا، وہ خاموش تھیں یا بہت ہنس رہی تھیں۔
مضومیاں نفی میں سر ہلاتے رہے اور نادومیاں کی اداسیاں بڑھتی گئیں۔

اس کے بعد مضومیاں دلہن بھاوج سے ملنے کے لیے برابر جاتے رہے اور بہت
جلد انہوں نے اس طرح آنا جانا شروع کیا کہ ان کی آمد و رفت کی خبر نہ نادومیاں ہی
کو ہوتی اور نہ ان کے خسر کو۔

ایک دن نادومیاں کو غیر متوقع طور پر دلہن کی چٹھی وصول ہوئی۔ دلہن نے
سوسو طرح ان کو لہجایا تھا۔ اپنے لیے پریشانی اور شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔ قسمیں کھا کر
انہیں یقین دلایا تھا کہ اب ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ آخر میں دلہن نے ان سے
رات کو چھپ کر ملنے کی خواہش کی تھی تاکہ نواب جنگ اور بی امالہ کے غصے کو کم کرنے کا کوئی
طریقہ سوچ سکیں۔ چٹھی ملی تو نادومیاں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی چٹھی طریقے پر طعنے
آنسو پونچھ لیتے۔ کبھی ہنسنے لگتے۔ کبھی چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر چٹھی کو آنکھوں سے
لگا لیتے۔ کبھی ہونٹوں سے۔

رات کو جب دیوار سچا نہ کر دلہن سے ملنے کے لیے پہنچے تو ان کا عجیب عالم تھا۔ دل
اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ چھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ فرط مسرت سے کانپ
رہے تھے دلہن سے ملے تو دلہن قدموں میں سمجھ بچھ نہیں۔ نادومیاں نے دلی دلی میں اللہ پاک
کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی طویل بے قراری اور محبت نے آخر میں دلہن کا دل موہ لیا۔ وہ تو بس
باور لے ہو رہے تھے کبھی دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ گھورتے رہتے۔ کبھی کچھ
بولنے کی کوشش کرتے اور آواز حلق میں اٹک جاتی تو دلہن کے سینے پر سر رکھ کر
زلفوں سے کھیلنے لگتے اور آنسو چھپا لیتے۔ غرض کہ نادومیاں کو اس وقت ہوش آیا جب کہ
موزن نے فجر کی اذان دی۔ اس رات نادومیاں نے جہاں دلہن میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں

وہیں یہ بھی دیکھا کہ ان کی صحت خراب ہو گئی ہے اور وہ بلت کرتے کرتے ابھائیاں لینے لگتی ہیں۔ ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ دلہن آہستہ سے نادومیاں کے پہلو سے اٹھ کر کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے باہر چلی گئیں اور جب واپس ہوئیں تو ان کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ جو نادومیاں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس کے بعد نادومیاں اپنی دلہن کے پاس چھپے چوری ایک آدھارا اور جلسے لیکن کچھ ہی دن بعد جب کہ مضومیاں اٹاوے کو لوٹنے کی تیاریوں میں تھے نادومیاں کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ دلہن حاملہ ہیں کیوں کہ نادومیاں چپ چپ کر اپنی دلہن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ نادومیاں نے اس خبر کو خاموشی سے سنا اور جانے اپنے کمرے میں اونٹھے پڑے کیا کیا سوچتے رہے۔ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچوائی گئی تو بس ننھا ان کی آنکھوں کے سامنے کھیلنے ہی تو لگا۔ بی اماں گھر میں اس قسم کی رونق کے لیے ترس گئی تھیں۔ بیٹیوں کو اللہ رکھے بچے تھے لیکن وہ بی اماں کے گھر کی زینت بننے سے تو رہے۔ رہ گئے بڑے نواب سوان کے بچے تو بازار ہی کی رونق تھے۔ بی اماں نے نادومیاں کی چوری چھپی ملاقات کی بات سنی تو ساتھ ہی یہ بھی سنا کہ کوئی ننھی سی جان بھی اب اس گھر کے والی وارث کی حیثیت سے آدھمکے گی۔ ورنہ وہ دلہن سے ہار نہ مانتیں اور نادومیاں کے لیے گھر کا نقشہ دوسرا ہی ہوتا۔ لیکن اب بی اماں اپنے دل کو نہ سنھال سکیں اور حٹ نادومیاں کو بلا بھیجا وہ مقطع بنے ٹوپی پہن کر آئے اور نظریں نیچی کیے کھڑے ہو گئے تو بی اماں نے بہت شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ آج ہی دلہن کو گھر لانے جا رہی ہیں اور انھوں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ نادومیاں نے اپنے پر قابو پایا۔

دلہن گھر میں آئیں تو اب ان کے اللہ تلے تھے۔ نئی نئی چیزیں ان کے لیے خاص طور پر پکوائی جاتیں۔ بی اماں نے حکم دے رکھا تھا کہ دلہن کی ہر بات، ہر خواہش پوری کی جائے

ان کو غصہ نہ کرنے دیا جائے۔ ماں کی معمولی معمولی حرکتوں کا شہینچے پر پڑتا ہے۔ خود دلن بھی ذرا غصہ کم ہی کرتیں لیکن ان ساری باتوں کے باوجود نادومیاں پہلے سے زیادہ اداس رہنے لگے۔ بٹھکی ہوئی روح کی طرح ڈیوڑھی کے بیرونی حصے میں جو بالکل خالی ٹیرا امتحانادومیاں گردن جھکائے گھومتے رہتے کبھی گھنٹوں کو نے میں بیٹھے رہتے۔ کبھی دلن کے پاس جا بیٹھے تو اس امیدیں کہ کسی نہ کسی طرح دلن سے کہہ سکیں کہ تم نے میرے سینے پر جو بہت بڑا پتھر رکھ چھوڑا ہے اس کو اپنے ہی ہاتھوں سے فوراً ساہر کا دو لیکن ایسی بات وہ دلن سے نہ کر سکے اور دلن ہی میں کہاں اس قدر ہمت تھی کہ وہ اس بوجھ کو ہٹا سکیں۔

نادومیاں اندر ہی اندر چھنک رہے تھے۔ زبان کھولنا ان کے بس کی بات نہ تھی، عزت کا سوال تھا۔ سارے خاندان کی عزت کا۔ اور پھر ان کی اپنی انفرادی حیثیت بھی تو تھی۔ بات کھل جاتی تو نادومیاں پر کیا گذرتی؟ دلن تو خیر عزت مند ہوتیں تو جیتی جاگتی مرجاتی لیکن نادومیاں بھی تو زندہ درگور ہو جاتے۔ بات کچھ اس طرح ہی تو پھیلتی کہ کبھی نادو کی دلن نے — نادومیاں کانپ کانپ جاتے — سو اسی لیے انھوں نے اپنے لب سی لیے۔ اپنے کمزور دل پر ایک بہت بڑی چٹان رکھ لی۔

ننھا پیدا ہوا تو شادیانے بجائے گئے۔ کپڑے تقسیم کیے گئے۔ مبارکبادیوں کے جواب میں شکریہ ادا کرتے کرتے نادومیاں کی زبان سوکھ گئی۔

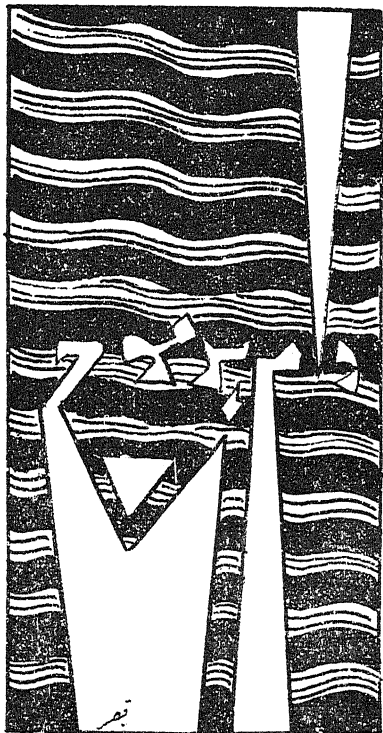
وہ باوجود یہ سوچتے رہنے کے کہ بچہ ابھی تین ماہ بعد تولد ہونا چاہیے تھا، مبارک باد پر اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے رٹا ہوا طوطا ہر منٹ دو منٹ بعد شکریہ کی رٹ لگاے۔ نادومیاں ننھا مبارک ہو، شکریہ.....

نادومیاں ننھے کا کیا نام سوچا ہے۔ شکریہ۔ نادومیاں آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ شکریہ نادومیاں، آپ پاگل تو نہیں ہو گئے، شکریہ۔ غرض کہ نادومیاں کچھ اسی طرح شکریہ شکریہ

کہتے رہے۔ اگر انھیں مبارک باد کی بجائے کوئی گالی دی جاتی تو بھی وہ نہایت اطمینان سے مری ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرتے۔

دلہن کا چلہ ہوا تو ننھے کا نام بھی اسی دن تجویز کیا گیا۔ نام رکھائی کے بتائے تقسیم کیے گئے۔ سارا خاندان مدعو کیا گیا۔ دلہن کو سجا سنوار کر پھر دلہن بنایا گیا۔ بی اماں نے شہر کے سب سے بڑے فوٹو گرافر کو بلایا پوتے کو پیٹے کے گود میں دے کر مہو پیٹے کے ساتھ اپنی تصویر کھجوائی۔
— اسی رات نادو میاں کچی مندر سے چلتے ہوئے اٹھے اور بے تخاصہ بھاگنے لگے۔ پکڑو پکڑو بھاگنے نہ پائے۔ میں جب تک زندہ ہوں دلہن کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ ان کی طرف آنکھ تک اٹھا نہیں سکتا۔ مگر اس کو پکڑو بھی، پکڑو لو۔ وہ چُپ رہا ہے۔ وہ چُپ رہا ہے۔ مردانے دروازے کے قریب دھڑے ہوئے تخت کو جس پر نوبت بجائی گئی تھی، وہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکے اور ٹکرا کر اس پر گر پڑے، ایک مہیب چیخ ماری تخت کا کونہ ان کے پیٹ میں دھنس گیا۔

اسی رات کونادو میاں نے کفن اوڑھ لیا اور نہایت خاموشی سے چپ چاپ اپنی عزت و آبرو کو اپنے ساتھ لیے زمین کے اندر جا چھے۔



باورچی خانہ کی چوکٹ پر کھڑا علی احمد کھانستارہا۔ اور اس نے کبھی ہوئی بیڑی بڑے
 پیار سے سلمیٰ پر دے ماری جو اس کی کبھری ہوئی لٹوں میں اٹک گئی۔
 سرخ مرچیں ہانڈی میں ڈال کر سلمیٰ نے ہانڈی پر صحنک ڈھانک دی اور اپنا آپنل
 منہ میں ٹھونس لیا لیکن اس کے بعد سچی وہ اپنی منہسی نہ روک سکی۔ علی احمد برابر کھانستارہا۔ سلمیٰ
 نے صحنک ہٹا کر دو ایک سرخ مرچیں ہانڈی میں اور ڈال دیں اور اطمینان سے ٹھنسا ہوا
 آپنل منہ سے نکال کر منسنے لگی۔ چیر چیر کی آوازیں گویا دال کے بگھار کا پروگنڈہ
 کر رہی تھیں اور اپنی کامیابی سلمیٰ پر قہقہے لگا رہی تھی۔ کیوں کہ علی احمد مسلسل کھانس رہا
 تھا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر رہے تھے۔ علی احمد جب کھانس کھانس کر ڈھال
 ہو گیا تو ہانڈی میں چیر چیر کی آوازیں ختم ہو گئیں اور سلمیٰ کی بے طرح پھیلی ہوئی باجھیں ذرا
 ساسمٹ گئیں اور اب لبوں پر صفت نیم نرم مسکراہٹ باقی رہ گئی، علی احمد کا چہرہ سرخ
 ہو گیا تھا۔ وہ جست لگا کر باورچی خانہ میں کود پڑا۔ سلمیٰ اٹھی اور ہرن کی طرح تڑپ کر
 ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے آگے کی طرف منہ زراحت کے لیے

بڑھادیئے اور بل کھا کر ہنستی رہی۔ اپنی دانست میں وہ جیسے سمجھ رہی تھی کہ مزاحمت کے لیے آگے بڑھے ہوئے اس کے نازک ہاتھ کسی خونی شیرنی کے پنجے میں جنھیں دیکھ کر علی احمد جھجک جائے گا۔ لیکن علی احمد فاسخانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتا گیا اور وہ تڑپ کر صحن کی طرف رہاگی لیکن صحن میں پہنچنے پہنچنے تک اس کی اوڑھنی اس کے سینے پر سے سانپ کی طرح رینگتی ہوئی علی احمد کی مضبوط گرفت میں آچکی تھی، اور اس نے نہایت اطمینان سے اس سانپ کو اپنی گردن میں لپٹ رکھا تھا۔ سلمیٰ صحن میں تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے صحن میں ادھر ادھر دیکھا۔ بوڑھی دادی اماں پان کے پیرے میں لونگ لگانے میں مگن تھیں۔ چھ بچا یک اس کی نظریں جھکیں۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے علی احمد اس سے انتقام لے رہا ہے۔ ہانڈی رسوئی گھر میں خاموش پڑی تھی لیکن وہ ابال وہ اتھل پھل جو لمحہ بھر پہلے ہانڈی میں مچیں ڈال کر سلمیٰ نے پیدا کر دی تھی کچھ ایسی ہی کیفیت علی احمد نے اس کے سارے بدن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ نہ سوچ سکی اور اس سے پہلے کہ دادی اماں کی نگاہیں پان کے پیرے سے ہٹ کر اس پر پڑیں وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچ گئی تھی۔ علی احمد کی مضبوط گرفت میں اس کی ساری ہستی اتھل پھل ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے علی احمد اس کے جسم میں سرخ سرخ مریں بھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بگھاری ہوئی دال کی ہنڈیا کی طرح وہ سبھی بالکل خاموش ہو رہی۔ علی احمد نے اپنی گرفت سے اس کو آزاد کیا تو اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ گالوں کو تھپ تھپاتے ہوئے علی احمد نے کہا کہ کان پکڑ کر کہتی جاؤ۔

”او بالم۔ آئندہ سے اس طرح دال نہیں بگھا روں گی کہ تم جو پٹے کٹے نوجوان ہو میرے سامنے بوڑھوں کی طرح کھانے لگو۔“

لیکن سلمیٰ نے کہا کہ

دو او بالم۔ روزانہ اسی طرح دال بگھاروں گی کہ تیری کڑیل جوانی کھانتے

کھانتے میری نظروں کے سامنے بوڑھی ہو جائے۔“

سلمیٰ نے یہ باتیں علی احمد کی پہنچ سے باہر ہو کر کہی تھیں اور وہ اب صحن میں تھی اس کا دوپٹہ اس کے سر اور سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب کی بار علی احمد نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے زبان چڑانے پر ہی اکتفا کیا۔

امروہ کے درخت کی ایک پتلی سی ٹہنی کو ہاتھ سے چھو کر سلمیٰ نے سبھی احمد کو اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گیا کہ آج مکے کا جواب اس کو اس چھڑی سے ملے گا اور آج سلمیٰ ہار جائے گی توجیت اسی کی رہے گی۔

آج سلمیٰ بہت خوش تھی۔ ننھی کو ہاف بائلڈ انڈا کھلانے کے بعد اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑا انعام حاصل کر لیا ہے۔ وٹامن سے بھرپور انڈا جس کی تعریف میں گوالیار پولٹری فارم کے مالک نے سلمیٰ کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی تھی۔ اس نے حساب جوڑ کر کہا تھا کہ ایک مرغی واقعی ایک سال میں سونے کا ایک انڈا ضرور دیتی ہے اس کے تجربے میں بوڑھیوں کا یہ مقولہ سو فیصد بلکہ ایک سو پانچ فیصد صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس نے فٹس میں پھرتی ہوئی سفید مرغیوں کو اور برڈرز میں پھدکتے ہوئے ننھے ننھے چوزوں کو بڑی دقت سے دیکھا تھا۔ لیکن سونے کا انڈا پیدا کرنے والی یہ ننھی مٹی چلتی پھرتی خوبصورت مشینیں اس کی دستانے سے باہر تھیں۔ فی الوقت تو اس کو روزانہ صرف ایک انڈا چاہیے تھا۔ وٹامن سے بھرپور ایک سیلڈ شیشی جسے بقول مالک گوالیار پولٹری فارم اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے سیل کیا تھا۔ اونٹلی وٹامن (ONLY VITAMIN) نوڈا وٹ فل آف وٹامن — (NO DOUBT FULL OF VITAMIN) صرف دو آنے میں

لیکن روزانہ صرف دو آنے کا چکر سلمیٰ کے لیے بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر نے بڑے پیار سے ننھی کے ملائم نکالوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا ”اس کو کچھ بھی تو بیماری نہیں ہے بس ذرا سی کمزور ہے بے بی۔ مگر بہت جلد پاؤں پاؤں پہلنے لگے گی۔ سر دیاں شروع ہو رہی ہیں۔ روزانہ ایک ہاف بائلڈ انڈا دے دیا کرو“ اور اس طرح سلمیٰ نے سر ہلا کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا جیسے انھوں نے ننھی کو میٹھا ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے کہا ہے یا پھر انڈے بھی تو نلکی کھول کر بالٹی لگا دینے سے لبالب بالٹی میں بھر جاتیں ننھی کو سینے سے چماتے ہوئے وہ بچوں کے وارڈ کی سیڑھیاں اترنے لگی تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں گھس آیا۔ اللہ میاں نے ماں کی دونوں چھاتیوں میں دو دھڑی دو دھڑ بھر دیا ہے۔ ایک طرف انڈے کی زردی اور سفیدی بھر دیتے تو۔۔۔ اس نے ننھی کو سینے سے چمایا تھا۔

راستے بھر سلمیٰ سوچتی رہی۔ روزانہ دو آنہ وہ کس مد سے نکال سکتی ہے۔ فوری اس کو ایک ترکیب سوچنی کہ گھر کے اجالوں کو ننھی پر سے قربان کر دیا جائے یعنی رات کو گھر کی لائٹ بہت کم جلائی جائے اور لائٹ کے بل کی بچت سے ننھی کو انڈے کھلائے جائیں۔ لیکن ننھی اس کو اندھیروں میں رہنے کی نظر آتی اور اپنے اس خیال سے گھر اگر اس نے پھر ننھی کو چوم لیا۔ اس کو ننھی ہی کے لیے روشنی کی بھی ضرورت تھی۔ وہ سارے گھر میں رہنے لگی پھرتی۔ ننھی آوازیں نکالتی۔ ہونٹوں سے پھر پھر کرتی گھر بھر کی چیزیں ٹوڑتی پھرتی۔ سو بچ پہاں تھر کہہ کر سلمیٰ ننھی کو دیکھا کرتی۔ کھٹکا داتے ہی سارا ماحول منور ہو جاتا اور ننھی کا چہرہ پورے چاند کی مانند کھل اٹھتا۔ سلمیٰ کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ساری روشنیاں اسی ہنستے ہوئے ننھے منے چہرے کی یہ دولت ہیں۔۔۔ منٹ دو منٹ کے لیے فیوز ہی اڑ جاتا تو ننھی ہنگامہ برپا کر دیتی۔ میاں علی احمد

لاکھ سمجھاتے ”ننھی میں تیرا بابا ہوں“ سلمیٰ کہتی ”ننھی یہ رہی میں تیری امی“ لیکن ننھی کو جیسے اندھیروں سے نفرت ہے وہ اپنے بابا اور امی کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اس کا ایک ہی مطالبہ رہتا۔ رات ہوئی ہے تو بابا اور امی کے ساتھ روشنی بھی چاہیے۔
لہذا سلمیٰ سوچتی رہی۔ لائٹ کے بل سے وہ کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔ ننھی کو اندھیروں سے نفرت ہے۔ ننھی کو اجالوں سے پیار ہے اور اس نے سوچا کہ ننھی مستقبل کی نقیب ہے تو وہ اجالوں سے پیار کرے گی ہی۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس نے مہینے بھگے سارے اخراجات کا جائزہ لیا۔ زندگی کی ہر ضرورت نے اپنی اہمیتوں کو اس پر واضح کیا۔ وہ بالکل اسی طرح ہر ضرورت کی منت سماجت کرتی رہی جیسے ساری کی ساری ضرورتیں مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں۔ اناج اور غلہ کی شہزادی سے اس نے بہت انکسار سے کہا کہ بھئی تم کچھ کمی سے مہینہ سببر کے لیے راضی ہو جاؤ۔ لیکن اس کو بالکل ٹکسا جواب مل گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے سفید سفید چاولوں کی قاب، پھولی ہوئی چیتوں کی پلیٹ اور بگھاری ہوئی ڈال کا کٹورہ سب کے سب اس سے گلہ شکوہ کر رہے ہیں کہ بھئی تم نے ہمیں گوشت کی بوٹی بوٹی کے لیے ترسا دیا۔ علی احمد گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ دسترخواں پر گوشت ہوتا ہے تو وہ منہ لے لے کر ہمیں سراہتے ہیں۔ لیکن تم نے ہمیں تعریف و توصیف کے قابل ہی نہ رکھا۔ اب تو وہ بیچارے اس طرح زہر مار کرتے ہیں جیسے نہ کھانے پر انھیں سزا بھگتنی پڑے گی۔ دال کے کٹورے نے پڑیکر کہا کہ بھئی ہم نے تمھارے پاس سوائے سرخ مرچوں کے اور کچھ نہ دیکھا۔ یہ دال ہمیشہ کی دال ہی رہی کبھی دالچہ نہ بن سکی۔ اب ہمارے لیے باقی ہی کیا ہے جو تم اس میں سے بھی بچت کی سوچ رہی ہو۔ سلمیٰ بدقت مسکرا سکی۔ اس نے ننھی کو پھر چوما۔ ننھی کے سر سے سرکتی

ہوئی منکی کیا پ کو برابر کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن اس کا ذہن اس کو اور سختی کو شکر پر چھوڑ کر پلک جھپکنے تک گم کے کمرے کے ایک گوشے میں دھڑے ہوئے صندوق تک جا پہنچا۔ لیکن صندوق بھی تو آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ سلمیٰ کی دو تین ساڑیاں۔ علی احمد کے ایک دو قمیص اور تلوں۔ ان ساڑیوں اور قمیصوں نے جیسے اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ سلمیٰ بی بی تم ہمیں گھر میں بھی تو دھو سکتی ہو۔ دیکھو نا۔ اب ہم میں اتنی سکت ہی کہاں رہ گئی ہے کہ تمہارے دھوبی کے مظالم سہہ سکیں۔ بڑی بے دردی سے وہ ہمیں پتھر پر ٹپک ٹپک کر چھانٹتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو تو ہمارا کیا حال ہو گیا ہے تم اگر اسی طرح ہمیں گھاٹ گھاٹ کی ہوا کھلو اور گی تو تمہاری یہ حسرت بھی دل ہی دل میں رہ جائے گی کہ تم کتر بیونت کے ہیں سختی کے خوبصورت فرانس میں تبدیل کر سکو۔ بس سبھی، آج سے ہم تمہارے نرم ہاتھوں ہی سے اشران کریں گے اور پھر اس طرح تمہارے ماہانہ چار روپے بھی تو بچ سکتے ہیں۔ بات سلمیٰ کی سمجھ میں آ سکتی تھی وہ کھل کر مسکرائی اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دھوبی کو جواب دے دے گی۔

وہ گھر پہنچی تو دلی محمد لائڈری والا اس کا منتظر تھا۔ دلی محمد کی ویسے کوئی لائڈری نہ تھی۔ وہ کپڑے دھو کر خود گھر گھر پہنچاتا پھرتا۔ خود نہ جاسکتا تو اس کی بیوی یہ کام کر دیتی لیکن اپنے نام کے ساتھ اس کو دھوبی کا استعمال گوارا نہ تھا۔ وہ جب بھی کسی کے گھر جاتا تو کہلا بھیجتا کہ دلی محمد لائڈری والا آیا ہے۔ کبھی کبھی زیادہ خوش رہتا تو کہتا دلی محمد لائڈری والے آئے ہیں۔ لائڈری کھول بیٹھنے کی حسرت اس کے دل میں بہت زمانہ سے تھی۔

سلمیٰ پہنچی تو دلی محمد لائڈری والے نے اس کو جھک کر سلام کیا۔ دلی محمد کی غیر متوقع آمد پر سلمیٰ سٹیمپا سی گئی جیسے اس کے فیصلے کی اطلاع دلی محمد کو ہو گئی ہو، لیکن اس

نے فوری خود کو درست کر کے ولی محمد سے پوچھا: ”تم کس طرح آدھکے ہولاندری والے سیٹھ۔ آج کپڑے لے جانے کی تاریخ بھی تو نہیں ہے۔“ لیکن ولی محمد بجائے اس کے کہ کچھ جواب دیتا، ننھی پر نظریں جمائے روئے لگا۔ سلمیٰ نے دلجوئی کرتے ہوئے سبب پوچھا تو اس نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا کہ بی بی جی میرا سچا شدید بیمار ہے۔ دواخانہ میں شریک کر کے گھر گھر پھرتا رہا۔ ہر جگہ سے مایوس ہو چکا تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اس بار میری تنخواہ پیشگی دے دیجئے بی بی اور دعا کیجئے کہ میرا لال جلد اچھا ہو جائے۔
 — سلمیٰ کی قوت گویا بی جیسے سلب ہو چکی تھی۔ وہ زبان تک نہ کھول سکی۔ کچھ سنبھل کر

اس نے آنسو چھپاتے ہوئے کہا، فکر نہ کرو ولی محمد تمہارا ننھا بالکل اچھا ہو جائے گا۔ اس کے آگے کچھ کہنے کی سلمیٰ میں ہمت نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ پچھلے پاؤں واپس لوٹ گئی۔ پٹروس سے دو روپے قرض لا کر اس نے ولی محمد کو دے دیئے اور نہایت ہی لجاجت سے کہا: — اس سے زیادہ مجھے کچھ نہ مل سکا ولی محمد تم تو جانتے ہو تنخواہ کے لیے ابھی دو دن باقی ہیں لیکن تم فکر نہ کرنا۔ وہ آتے ہی میں انتظام کر کے انھیں کے ہاتھ تمہارے گھر بھجوا دوں گی۔“ ولی محمد نے کچھ اس انداز سے سلمیٰ کو دیکھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی زبان صاف پڑھ سکے اور سلمیٰ نے اس کی آنکھوں کے پیام کو سمجھ کر کہا کہ میں تمہیں تمہارا حق ہی تو دے رہی ہوں، اس میں شکریہ کیسا، مہربانی کیسی؟

ولی محمد جا چکا تو سلمیٰ نے محسوس کیا کہ ننھی کی اٹنوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلمیٰ خوش تھی اور اس نے طے کر لیا تھا کہ ولی محمد کی علیحدگی سے ننھی کو اٹنوں سے مل سکتے ہیں تو پھر ننھی کو اٹنوں سے نہیں ملیں گے لیکن اگر اٹنوں نے گویا اس کے دل کے قریب نشتر چھو کر یاد دلایا کہ ننھی بہت جلد پاؤں پاؤں چل سکتی ہے اس کو صرف ایک اٹنوں کا روز کھلا دو۔

اُجلی پر چھائیاں

دامِ ہرمن

علی احمد گم آیا تو سلمیٰ نے اس کو کپڑے بدلنے نہ دیئے ولی محمد کے لیے سلمیٰ کی بے حد سے علی احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے بڑی محبت سے سلمیٰ کے کالوا چیت لگاتے ہوئے کہا کہ میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں لیکن تم ان گہری نیلی جھیلوں میں ڈوبنے سے تو مجھے بچا لو۔ سلمیٰ مسکرائی تو علی احمد نے اپنا رومال اس کی چھلکی آٹکھوا پر رکھ دیا۔

علی احمد ولی محمد کے پاس چلا گیا تو سلمیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ننھی کر چار پائی پر لٹا کر لوری دیتے ہوئے وہ خالی خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورتی رہی اس کی آواز ٹیری میٹھی اور بڑی سہمی تھی۔ وہ جب کبھی گنگنائی یا ننھی کو لوری دیتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود گیت بن گئی ہے۔ وہ اسی طرح گیت بن کر فضاؤں میں تیرتا پھرتی۔ مشروں کے مدوجزر کے سہارے وہ ماضی، حال، مستقبل کے سارے فاصلے طے کر لیتی۔ وہ مست ہو کر گنگنائی کرتی اور اس کی گوری آنکھیاں ننھی کے گھنے کالے بالوں میں کنگھی کرتی رہتیں اور اس کے حلق سے نکلتی ہوئی آواز ماضی کے دھندلکوں پر اُجلی اُجلی کر تیں بکھیرنے لگتی۔

میری بیبا تو نغموں کی جان ہے۔ اس قدر خوبصورت گلا خوش نصیبوں کا ہی حصہ ہے، میری اچھی بیٹی چلو بھی اس طرح نہیں شرما تے اچھے بچے۔ ہاں ہاں اچھا سا چھوٹا سا بکس لادیں گے، بھئی سب لادیں گے لیکن ہمیں اس طرح شرما تے والے بچے پسند نہیں۔ اب گائے کی میری رانی۔ اچھا بھی نور جہاں کا بدلی والا چاچا، جی سی۔ تو کونسی بدلی میں۔

بس ایک اور۔ ایک ہی۔ اب نہیں ستائیں گے تمہیں۔ لتا کا۔ سلمیٰ نغمت کی شہزادی بنی خاندان بھر میں دھوم مچاتی رہی بنگھوں کے سہارے اور

نے اپنی امی سے اپنی ضدیں منوائیں۔ چھوٹا سا بکس۔ نئی نئی اوڑھنیاں اور یہ ضدیں چاکلیٹ کے ڈبوں سے لے کر سینٹ کی شیشیوں تک پوری کی گئیں۔ دادی اماں اداس ہوئیں تو چٹ چٹ بلائیں لے کر سٹو کو اپنے پاس بٹھالیا۔ کچھ بھی سنا دے میری اماں بس تو گنگنا دے ذرا اور سلمیٰ نے گنگنا کر دادی اماں کو مامنی کی حسین یادوں کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

حقیقتہً ہو رہا ہے۔ ممتاز دلہن کے بچے کا لیکن سب کی نظریں تھیں سلمیٰ بٹیا پر۔ چچی اماں، چھوٹی اماں، بڑی بہنیں سب کی سب پیش بنیاں کر رہی ہیں۔ طرح طرح سے سٹو کو رنجاری ہیں۔ اس محفل میں سٹو گائے گی نہیں تو سپر ممتاز کبھی بات نہیں کریں گی اس سے۔ خوشی کی محفلوں میں گانے سے انکار نہیں کرتے بھی۔ بری بات سمجھی جاتی ہے اور سٹو کچھ شرمناک کچھ اتر کر گانے لگتی تو سب کے سب اس کو گھیر لیتے۔

سلمیٰ جب اپنی ہم عمر سہیلیوں کی جھوٹ میں ہوتی تو اس کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا۔ کوئی کچھ فرمائش کرتی کوئی کچھ فرمائش کرتی کچھ کرتی۔ وہ سب کی فرمائشیں یکے بعد دیگرے پوری کرتی۔ اپنی ہم جولیوں میں بیٹھ کر تان اڑاتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا کہ وہ بڑی ٹھکانا ہو گئی ہے اور واقعی کھل کر بے حجب گمان کی وجہ سے اس کی آواز میں بڑی سختگی پیدا ہو جاتی۔ اپنے سے بڑوں کے آگے وہ اس طرح اپنے من کا مظاہرہ نہ کر پاتی۔ جس کا اس کو بعض وقت رنج بھی ہوتا اور وہ گنا چکنے کے بعد سوچتی کہ میں نے اتنا اچھا نہیں کیا یا جتنا اچھا میں گنا سکتی ہوں لیکن اب کی میں بے حجب گناؤں گی۔ اس کی امی کہتیں کہ تم اس طرح ہمیں گنا کر سناؤ جس طرح اپنی سہیلیوں میں گنا کرتی ہو تو ہم تمہیں بہت عمدہ سنگار دان لادیں گے بالکل دلہن یا جی کے سنگار دان کی طرح۔

آخر ایک دن امی کے اصرار پر سٹو نے جی کڑا کر کے ایسا کایا کہ دوسرے دن اس کو

سنگار زوال مل گیا۔

ننھی کے کالے کالے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے سلمیٰ گنگنا رہی تھی۔

آجاری بندر یا تو آگیاں نہ جا

ننھی کی آنکھیں نیند سے بوجھل پھر رہی تھیں اور سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو اُتر رہے تھے۔ آج وہ اپنے لغوں کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ اور اس کا ذہن آج کے بچپن کے سہانے ایام کی تصویر کشی میں مہر و نفع تھا۔ وہ سوچ رہی تھی — کیسے بے فکری کے دن تھے وہ بھی۔ ہر خوشی حاصل تھی، ہر تنہائی تکمیل ہو جاتی تھی۔ ان لغوں کے سہارے اس نے دلوں کو مود لیا تھا۔ اس کی آواز کی ننھی نے ساری زندگی کو نغمہ بنا رکھا تھا۔ کاش میری ننھی بھی ان دنوں ہوتی۔ یوں تو آج بھی میں اپنی آواز سے سب کو مسحور کر سکتی ہوں۔ خاندان بھر میں آج بھی سب کے دلوں میں میرے لیے اتنا ہی پیار ہے آج بھی میری االی مجھے چوم چوم لیتی ہیں، آج بھی میکے بابا میری پیشانی پر لسی طرح بوسہ دیتے ہیں۔ آج بھی مجھے ان سب کا پیار جال ہے لیکن اس کے باوجود آج زندگی میں اتنی جراتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ آج میکے نفعے اپنے بابا اور امی سے ان کی چپتی ننھی کے لیے اُٹا بھی تو انعام میں حاصل نہیں کر سکتے۔ آج میں کھاتی ہوں تو امی کے کانوں میں گر امنوں بچے لگتا ہے جسے ابانے بڑے چاؤ سے ساڑھے تین سو روپے میں خریدا تھا۔ اور جو منہ ستر روپے میں ایک بیٹھ کے پاس رہیں ہو کر ڈوب گیا — ان ریکارڈس پر تھرکتی چوٹی سوائیاں جن کو بار بار سجا کر میں گیتوں کی لے سے لے ملاؤ تھی آج خود میکے کچھ کو چھیدی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور سچ کیا کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی کا سارا حسن ساری خوبصورتی — کیا اسی لیے آج خود میکے کان میری اپنی آواز کے لیے تو نہیں ترس رہے ہیں۔

آجاری نندیا تو آکیوں نہ جا
 نخی کی خوبصورت آنکھوں میں نندیا پچکے چپکے اس طرح آگئی جس طرح چاند
 دے پاؤں چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور سلی کی آنکھوں سے دو تین چمکدار سوتی
 اس طرح اس کے دامن میں گر کر کہیں غائب ہو گئے جس طرح جگ مک کرنے سے تارے ٹوٹ کر
 گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن کہاں گرتے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔
 دو مانوس ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ سچین اور دوشینز کی کہنت
 پیچھے چھوڑ کر پلک جھپکنے تک وہ ایک ہی لمحہ میں پھر اپنے حال سے چٹ گئی۔
 یہ کیا ہے سلو۔ علی احمد نے اپنی بھیگی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا
 لیکن ان ہاتھوں کا سہارا پا کر سلو کی آنکھوں نے علی احمد کے قدموں پر سارے سوتی
 لٹا دیئے۔ اور علی احمد نے پلکوں سے ان موتیوں کو چن کر اپنے دامن دل میں چھایا۔
 جسلمی کا آئینل اور علی احمد کا گریباں نم ہو چکا تو علی احمد نے ٹھوڑی کپڑا اس کا
 چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ سلو۔ دیکھو نا۔ بات کس قدر معمولی ہے اور تم کس قدر
 جذباتی ہیں مجھے بعض وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی بہت بڑی گیند میں کھڑی ہوئی
 مجھے پکار رہی ہو لیکن میں تمہیں جواب دینے کی بجائے تمہاری آواز باز گشت بن گیا
 ہوں۔ دو دلوں کا اس قدر ایک ہو جانا کس قدر خوبصورت سا نسخہ ہے۔ تم روتی ہو تو
 تمہارے آنسو پونچھ دینے کی بجائے میں تمہارے ساتھ رونے لگتا ہوں۔ اس طرح تو
 زندگی زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔

وہ مسکرائے لگا۔ کم سے کم سلی نے تو یہی دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس نے سلی
 کی بائیںہ میں چٹکی جھٹکے ہوئے کہا۔ لاؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ وہ ترکیب سوچتی ہے کہ
 بس طے سمجھو کل سے صاب گریٹ نہیں پیس گے۔ ٹیری پیس گے۔ ٹیری پیتے ہوئے انہیں

فراترم آئے گی اس لیے دفتر میں وہ اسموکنگ نہیں کریں گے۔ اسموکنگ کا پروگرام گھر پر ہی ہو گا اور نخی انڈا کھائے گی۔

اور آج نخی نے انڈا کھایا تھا۔ سلی اسی لیے بہت خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ آج زندگی میں پہلی بار علی احمد کو بٹری پتیا ہوا دیکھ کر بھی اس کے دل پر کچھ نہ گذری۔ علی احمد نے ٹری کا ایک لمبا کش کھینچا تو پھر دوسرا کش نہ لے سکا۔ سلی سے چھالیہ ٹاکڑا ملاگ کر منہ میں ڈالتے ہوئے دوسرا کش لینے کے لیے جب اس نے بٹری کو باجھوں میں دبایا تو سلی نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔ علی احمد جانتا تھا کہ سلی اس سے بھر دے کرے۔ نخی کے لیے کم سے کم اس کے جذبہ پداری کو سراہے لیکن نخی انڈا کھا چکی تھی اور سلی ناپتے اطراف مسرتوں اور خوشیوں کا ایک ایسا جال بن رکھا تھا جس کے غول کو کوئی مادہ، کوئی ساخہ اس وقت نہیں توڑ سکتا۔ علی احمد نے سلی کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ گلستاں بنا ہوا تھا اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اس کے بدن کا روال رزاں جیسے رقصاں تھا۔ آج اس نے نئی دنیا بسا رکھی تھی جہاں اس کو ہر چیز حاصل تھی، جہاں اس کا ہر قدم منزل تھا۔ علی احمد کی نظر برآمدے میں رہنمائی ہوئی نخی پر بٹری تو اس کو سلی پر بے اختیار پیار آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سلی کی اس بے پناہ مسرت میں زندگی کے سارے انسانی جذبے شامل ہیں۔ یہ خوشی جہاں نخی کے لیے مانتا ہے وہیں اس کے لیے بے اندازہ محبت کا منظر بھی ہے کیوں کہ سلی نے مصیبتوں کو شکست دے کر زندگی سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

اس نے سلی کو چیت لگاتے ہوئے کہا کہ سلو متھاری بیٹا نے انڈا کھایا ہے تو تم سمجھ رہی ہو کہ میزا پیٹ بھی بھر گیا ہے۔ آج اس قدر خوش ہو کہ ہمارے ناشتے کی بھی منکر نہیں سلی نے بہت محبت سے علی احمد کے پیٹ پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا کہ آج یہ پیٹ بھی صدف خوشیوں سے بھر گیا ہے، اسی لیے تو تم نے بٹری کو بہت شان سے دانٹوں

میں دبار کھا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغ مسلم کھا کر موٹا سا ساگار پیتا ہے۔
اور اب پلاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے بعد علی احمد رسوئی کے پاس کھڑا ہوا دل
کے بگھار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

پلاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے بعد میاں علی احمد کے لیے بگھاری ہوئی وال اور
گرم گرم چپاتیوں کے انتظام میں سسلی مصروف ہو گئی تھی۔
بی اماں اپنے آخری پیرے میں آخری لونگ ٹانگ چکی تھیں اور بہت احتیاط سے
ننھی کی گرفت سے سروط چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سسلی کی زندگی بہتی ہوئی ندی کی طرح شانت تھی۔ ننھی نے بیچ ندی میں کھڑے ہو کر
کچھ ایسا اودھم مچایا تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں ہی سے ساری ندی کی شاننی ڈول
گئی تھی لیکن علی احمد نے ایک چھوٹی سی نانہ ندی کی نرم موجوں پر مہادی تھی، اور ننھی اس
ناؤ میں بیٹھ کر جمی دھیمی پہننے لگی تھی۔

زندگی کی گاڑی راستے کی نامواری کے سبب ٹھہر گئی تھی۔ لیکن علی احمد نے ذرا
سادھکا دے کر ان راستوں سے گاڑی کو گذار دیا تھا اور اب یہ گاڑی جیسے مانوس راستے
کے چڑے کھلے سینے پر رینگتی ہوئی منزل کی طفس بڑھنے لگی تھی۔

ننھی کو روز ایک اٹل رہا تھا، چار دنوں میں اس نے چار اٹلے کھائے تھے۔
پھر دن طلوع ہوا تو دادی اماں کی طبیعت زیادہ اداس تھی زیادہ مضمحل تھی۔
رات بھر وہ نیند میں ٹہر جاتی رہی تھیں۔ خدا میرے احمد کو ترقی دے۔ اے معبود تو نے
علم کی دولت سے اس کو سرفراز کیا اب اس کو زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دے
ننھی پھول بن کر مہکے اور اس کی خوشبو سارے چمن کو معطر کر دے۔ پھر وہ یکایک
کہنے لگیں ”او بہورانی احمد کی دگری کا فریم ٹوٹ گیا تھا نا پھر تم نے بنوایا کیوں نہیں۔“

اچلی پرچھائیاں و ام ہر موج

آج ہی بنو ادو۔ بیٹی شگون ٹھیک نہیں۔ اتنا بہت سا علم پڑھ لیا ہے تیرے دولہے نے پگلی بی بی سے پاس کی دہن ہو کر علم کی حفاظت کرنا تو نے نہ سیکھا۔

اری سلو بیٹی یہ تیری ننھی تو لینگڑی کی ٹپی کا سہارا لیے بغیر بھی دو چار قدم چلی تھی ہے لے جی سنبھال اس کو۔ اس نے میری ساری گلیاں بکیر دیں۔

سلمیٰ نے بڑی بی بی کے جلنے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اما ننھی تو آرام کر رہی ہے۔ ڈگری کا فریم تو میں نے قرینے سے بنوایا تھا جس کی آپ تعریف کر چکی ہیں ماتھے پر پسیہ نہ آ رہا ہے۔ اب آپ آرام کیجئے اماں بخدا تر رہا ہے۔“

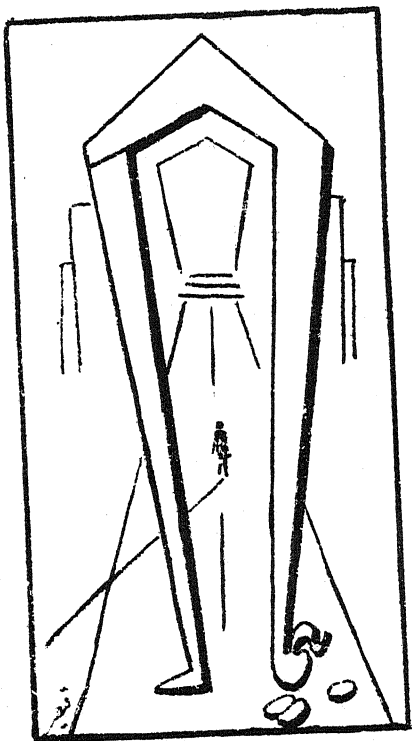
صبح ہوئی لیکن دادی اماں کا بخار نہ اتر۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں موسمی کے رس کا گلاس تھامے دادی اماں نے نجف آرا میں پوچھا۔ ”ننھی کو انڈا نہیں دے رہی ہو کیا؟“ سلمیٰ نے دادی اماں کے سوال کو ان سنا کر کے جواب دیا۔ ”اماں آپ شربت پی چکیے نا۔ دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ کو زیادہ آرام کرنا بھی تو چاہیے۔“ دادی اماں نے موسمی کا گلاس منہ سے لگایا اسے پی چکیں تو کچھ سوچ کر انھوں نے سلمیٰ کو پکارا۔ ”سلو بیٹی ذرا اس گلاس میں تھوڑا سا پانی لے آنا۔“

پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے دادی اماں آنکھیں بند کیے دیر تک کچھ پڑھتی رہیں۔ پڑھ چکیں تو سلمیٰ کو گلاس دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ”گیارہ نام میں بڑی تاثیر ہوتی ہے بیٹی۔ دم کیا ہوا پانی ننھی کو روز پلایا کرنا۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد پاؤں پاؤں چلنے لگے گی۔“

سلمیٰ نے ننھی کو گود میں اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگانا چاہا تو جلنے کیوں اس کی آنکھیں سبز آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر دم کے ہوئے پانی میں جا چھا۔

ننھی کے ہونٹوں سے لگاتے لگاتے سلمیٰ نے گلاس ہٹا لیا۔ لیکن ٹپکا ہوا
 آنسو دم کیے ہوئے پانی کا جزو بن گیا تھا۔ کوئی سوتی تو تھا نہیں جسے سلمیٰ الگ کر لیتی۔
 اس نے کچھ رک کر گلاس ننھی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ پی کر ننھی نے منہ
 پھیر لیا، اور سورتے ہوئے کہا: ”نندا کاتے، نندا دو۔“





رام دیال نے میڈیکل سٹریٹ کے ساتھ پھر رخصت بیماری میں مزید پندرہ دن تو سیک کے لیے درخواست بھیج دی۔ اس کا چھوٹا بھائی سُہما سہما چھونک چھونک کر قدم رکھتا ہوا اگزا منر صاحب کے اہل اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار بالکل اسی انداز سے وہ آفس آچکا تھا۔ رام دیال کی بیماری کی پرچھائیاں اس کی گھر والی پر اور اس کے چھوٹے بھائی دونوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے دیکھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی غذا اور کپڑا بھی رام دیال کی دواؤں اور انجکشنوں کی صورت میں ڈسینسری ہی سے خریدے جاتے تھے۔ وہ جب بھی آنا دزدیدہ نگاہوں سے آفس کلرکوں اور آڈیٹرس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے انھیں یقین دلانا رہا ہو کہ میرا بھتیجا بہت جلد صحت مند ہو جائے گا۔ وہ موت سے لڑ رہا ہے، اس کی جیت ہوگی، وہ پھر اپنی خدمت پر رجوع ہوگا، اور پہلے سے زیادہ تن دہی سے کام کرے گا، وہ گورنمنٹ کا احسان چکا دے گا، وہ مفت خور نہیں ہے، وہ مرے گا نہیں جناب آپ حضرات اس طرح گھور گھور کر نہ دیکھیں۔

میں نہایت بے چینی سے صیغہ میں اس کی واپسی کا منتظر تھا اس لیے بھی کہ ایک ہفتہ پہلے میں رام دیال سے ہاسپٹل میں مل آیا تھا۔ وہ روہت تھا لیکن طویل بیماری کی وجہ سے اس کا جسم پیلا پڑ گیا تھا اور لقاہت زیادہ تھی۔ بہت ہی آہستہ سے اس نے کہا تھا کہ کل مجھے یہاں سے DISCHARGE کر دیا جائے گا اور دس دن گھر میں آرام لینے کے بعد گیارہویں دن آفس میں رجوع ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ میری رخصت ۳۱ کو ختم ہو رہی ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں اس طویل بیماری کو تنگ آچکا ہوں۔ سہروپ اور اس کی سببانی نہ ہوتے تو مجھے اپنی زندگی اس قدر عزیز نہ ہوتی۔ زندگی واقعی بہت حسین ہوتی ہے، بہت پیاری ہوتی ہے لیکن تنگدستی میں صحت جواب دے دے اور آدمی اس کی طرف سے ناامید ہو جائے تو کبھی کبھی موت اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری زندگی میں ایسے مواقع آچکے ہیں لیکن سہروپ اور اس کی سببانی کے خیال نے مجھے موت سے نبرد آزما رہنے کی شکتی دی اور اب میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا۔ رسوئی گٹ سے پھر دھواں اٹھے گا۔ بجلی کے سوچے پرچی ہوئی گرد میری انگلیوں کے لمس سے صاف ہو جائے گی اور کھڑکیوں میں سے گزر کر روشنی چہرے ٹرک کے کنارے تک پہنچے گی۔ سہروپ کی سببانی کی بدھوتی پھر الگنی پر چھو لے گی، اس کے ہاتھ میں پھر سوئی آجائے گی اور میسے کوٹ کے بن پھر مضبوط ہو جائیں گے۔ سہروپ دیال کا نام اس کی کلاس میں پکارا جائے گا تو وہ غیر حاضر نہ رہے گا۔ اس کی نوٹ بکس کے صفحات اس کے فوٹن پن کی تپ کو چومنے کے لیے نہ ترسیں گے۔ اس کی نگاہیں جو مدت سے صفت میرے زرد چہرے پر جمی رہی ہیں پھر ان کتابوں کے سینوں کو گدگدائیں گی میری سائیکل پھر چمک اٹھے گی۔ اس کے پیٹے پھر گھومیں گے۔ میزے دروازے پر پھر تم دستک دو گے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے رام دیال سے وعدہ کیا تھا کہ

اب کی ملاقات اس کے گھر پر ہوگی، کیا وہ ابھی ہاسپٹل میں تو نہیں ہے؟ کیا ابھی اس کا رسونی گھر، بجلی کا سوئچ، اس کا کوٹ اس کی سائیکل، اس کے گھر کا دروازہ اس کے منتظر ہیں۔ سرورپ گردن جھکائے اگرزامنر صاحب کے کمرے سے نکلتا ہوا دکھائی دیا تو میں اس کی طرف لپکاتا کہ اس کے صیغہ میں پہنچنے سے پہلے ہی تفصیلات معلوم کر لوں کیوں کہ میرے سوا میرے بعض ساتھی بھی اس کے منتظر تھے اور صیغہ میں داخل ہو کر اس کو حسب معمول یکے بعد دیگرے جوابات دینے ہوتے تھے کہ بھیا اب اچھے ہو رہے ہیں، بھیا اب نسبتاً بہتر ہیں۔

سرورپ دیال چوں کہ زیادہ پریشان تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی سے ملے ملاگا اور ویسے وہ اس قدر شرمیلا واقع ہوا تھا کہ ہمیشہ ہی اس امر کی کوشش کرتا کہ کم سے کم لوگوں سے ملے اور چلتا بنے۔ وہ دفتر میں داخل ہوتا تو خود کو ایک مجرم محسوس کرنے لگتا۔ اپنے بھیا کی طویل بیماری میں بغیر نوکری کیسے ہر ماہ نصف تنخواہ لینے پر شرمندہ سا رہتا۔ سرورپ سے مجھے معلوم ہوا کہ رام دیال کی طبیعت یکایک اس رات خراب ہو گئی جس دن میں اس سے مل کر آیا تھا۔ دوا خانے سے اس کو خارج نہیں کیا گیا، اور آج کے تیسرے روز اس کا آپریشن ہو گا تنخواہ کے لیے میرے نام اُس نے AUTHORITY LETTER دیتے ہوئے کہا تھا کہ بھیا آپ کا بہت انتظار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ ضرور گھر گئے ہوں گے اور دروازہ مقفل دیکھ کر پریشان ہوئے ہوں گے لیکن دوسرے روز جب آپ ہاسپٹل نہیں آئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ آپ گھر نہیں گئے ورنہ آپ ہاسپٹل ضرور آتے۔ کل پہلی ہے، تنخواہ ہمیں کل ہی پہنچا دیجئے۔ میں شدید ضرورت ہے۔ آج اگرزامنر صاحب نے مجھ سے کچھ ترش روئی بُرتی بھیا کی بیماری کی طوالت سے وہ مجھے کچھ نزار سے نظر آئے۔ درخواست میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا کہ آپ ہی اس کو اسسٹنٹ صاحب کے پاس پیش کر دیجئے کیوں کہ اگرزامنر صاحب نے FILE طلب کیا ہے جب میں صیغہ میں واپس پہنچا تو بعض ساتھیوں نے رام دیال

کی ذخیریت پوچھی۔ اکثر نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن سیوانندم آج بھی اپنی بختوں کے ساتھ اپنے ہم عمر چچا سے سسرگوشی کرنے لگا۔ میں نے چھٹی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں مجھ سے ملیں اور جھجک گئیں۔

رام دیال ۳۵، ۳۶ سال کا لم ترنگ آدمی تھا۔ چھوٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں رخساروں کے اوپر ہی حصہ پر دونوں جانب کچھ اوردے اوردے دھبے جو ابھی ہوئی بڑیوں کے ساتھ بالکل نمایاں تھے۔ بے حد زبرد خشک، کٹر مذہبی، اسی لیے دفتر کے بہت کم لوگ اس سے مانوس تھے، اس لیے سبھی کہ اس سے مانوس ہونا بہت مشکل تھا کیوں کہ وہ یہ تو آروند گھوش کی تعلیمات سے متعلق بات چیت کر سکتا تھا یا عہدیداروں کی تجاویز سے متعلق یا پھر مضابطہ ملازمت کی دفعات سے متعلق، اگر آپ اس سے کسی کرنٹ ٹاپک **CURRENT TOPIC** پر گفتگو کرنا چاہتے تو صرف اس کی وہ فائلس جو زیرِ غور رہتیں، وہ انھیں سے متعلق گفتگو کر سکتا تھا پھر اس پر طرہ یہ کہ وہ مذاہب پر بات چیت شروع کرے گا تو وفرتیت تک لے جائے گا اور دوسری بات چیت ہوگی تو آروند گھوش کی تعلیمات پر ختم ہوگی اور پھر دوراں گفتگو میں اس کے جلوں میں ربط نہ رہے گا وہ بات کرتا رہے گا اور سوچتا رہے گا اور سوچتے سوچتے خیالات کی رو میں اس طرح بہہ جائے گا کہ زبان اس کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ قوت اظہار جواب دے دے گی اور وہ کچھ محبوب محبوب سامنے تکنے لگے گا۔ یہاں تک کہ خود آپ کو اس پر نرس آجائے گا اور آپ لقمہ دیں گے کہ ہاں بھی ہم نے آپ کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ آپ اپنی فرض شناسی کو مذہب کی صحیح تعلیمات کا سبب سمجھتے ہیں جن میں آپ کی انفرادیت کا بھی دخل ہے۔ لیکن یہ انفرادیت بھی مذہب ہی کی روشنی میں پر دانِ چرخی ہے۔ وہ بہت غلوں سے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گا اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس طرح آپ کو دیکھے گا جیسے آپ اس کے محسن ہیں کیوں کہ آپ نے اس کی بے ربط باتوں سے

اس کے مقصد کو متعین کر لیا ہے اور وہ صرف اسی لیے آپ سے مرعوب بھی ہو جائے گا کیوں کہ آپ بہت دور رس ہیں اور آپ نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اور بھی کئی خصوصیات تھیں اپنے عہدیداروں کی نظروں میں وہ بہت محنتی بہت فرض شناس تھا اور اس کے کام سے سب مطمئن تھے کسی کاروائی میں خود اس کو اختلاف ہوتا تو پھر عام طور پر یہ بات سمجھ لی جاتی تھی کہ اب یہ کاروائی نہیں ہوگی اور اسی لیے سارے دفتر میں یہ کہاوت بن گئی تھی کہ رام دیال کا کانپنج نہیں سکتا۔ وہ بہت پابند وقت تھا بقول آفس کے چوکیدار کے کہ رام دیال باہر آئے ہیں تو اس وقت ہونے دس بجے ہوں گے۔ آپ کی گھڑی غلط ہے آپ اسے صحیح کر لیجئے اور پھر رام دیال باہر ہونے دس بجے اپنی مینز پڑٹ جاتے تو پانچ ساڑھے پانچ بجے تک لٹمنے کا نام نہ لیتے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اس آدمی کو نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیشاب ہی آتا ہے۔ مینز پر لگی ہوئی فائلوں کی ڈو جبر کے نیچے وہ مع اپنے مذہب اور اپنی انفرادیت کے ساتھ ساڑھے سات گھنٹے تک دفن رہتا۔ کوئی الجھی ہوئی کاروائی ہوتی تو دفتر کے لوگ اسی سے مشورہ لیتے۔ وہ فون ٹین پن پر کیپ چڑھا کر گردن اٹھاتا اور ٹھوڑی کو منتہی پر رکھ کر گردن کو دائیں بائیں جھکے دیتا اور آپ علانیہ اس کی گردن کی ہڈی کے ٹخنے کی آواز سنتے اور آپ کو یقین ہو جاتا کہ اب وہ آپ کی دشواریوں کو سہل تر کر دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کاروائی کو سمجھاتے وقت وہ اپنے عہدیداروں کی فطرت سے لے کر ان کی تجاویز کی خامیوں تک ہر چیز پر روشنی ڈالے گا اور پھر اس بات میں مذہب آجائے گا آدمی کی اصلیت آجائے گی، دنیا کی بے ثباتی آجائے گی، روح اور جسم کا رشتہ موضوع بحث بن جائے گا اور کیا عجب کہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہنے پر مختصر سی نصیحت بھی آپ کو سننی پڑے۔ اور آپ یہ سب کچھ نہایت سعادت مندی سے برداشت کریں گے کیوں کہ وہ آپ کو کاروائی سمجھانے کے لیے راضی ہو گیا ہے اور آپ جب کاروائی

سمجھ کر اٹھیں گے تو ایک ایک نکتہ آپ پر واضح ہو چکا ہو گا، اور آپ کے نوٹس کی تیاری کے لیے کئی اسٹیکس آپ کے سامنے ہوں گے جن پر صاف ذکر کے وہ ضابطے کی کتاب آپ کے ہاتھ میں تھما دے گا جب پہلے پہل میرا پائنٹ منٹ ہو اٹھا تب بھی وہ رخصت بیماری پر تھا۔ میں نے اس کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں سنی تھیں کہ وہ عجیب الحلقہ آدمی ہے اور خرابی صحت کی وجہ سے کچھ چڑچڑاپن بھی اس کے مزاج کا جز بن گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ رجوع ہوا تو میں نے اس سے قریب ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی اور چارپانچ دن معمولی آداب سلام کے بغیر ہی گزر گئے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ وہ کس طرح مجھ سے مانوس ہوتا گیا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، وہ مجھ سے کچھ متاثر سا نظر آنے لگا جس کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس کی باتیں اخلاق و مروت بلکہ صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ صبر و تحمل سے سن لیا کرتا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کٹر مذہبیت اس کی خرابی صحت کا رد عمل ہے اور وہ اپنی مغلوچ انفرادیت کا پھٹا ہوا البادہ اڑھے کچھ بھی مذہب سے ستیزہ کار رہتا ہے لیکن ہر ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اور مذہب کی گرفت اس کے دل و دماغ پر زیادہ شدید ہو جاتی ہے، زیادہ دیر پا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دوزانو ہو کر عہدیداروں کی کج خلقی اور تنگ مزاجی کو بھی کسی مذہبی برگزیدہ شخصیت سے رجوع کر دیتا کہ وہ ان کے دلوں میں رحم و کرم پیدا کر سکتی ہے، انہیں اچھا انسان بنا سکتی ہے، انہیں راہ راست پر لا سکتی ہے۔ اس کو دو چیزوں سے بہت پیار تھا۔ آرونڈ گھوش کی نظموں اور مضامین کے مجموعوں سے اور اپنے فائلس سے۔ پائید سحری آشرم کی مطبوعہ کتابوں کا وہ شدید احترام کرتا تھا اور اپنے فائلس سے اس کو شدید محبت تھی۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی دونوں چیزیں اس کی شخصیت کی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ صرف ان کا احترام نہیں کرتا صرف ان سے پیار نہیں کرتا بلکہ ان میں پناہ لیتا ہے۔ فائلس کو وہ بہت سجا کر رکھتا کیلنڈر کے نمبر کاٹ کاٹ کر

فائلس پرچھپا کر رہا۔ پورے دفتر میں رام دیال کی متعلقہ فائلس آنکھ بند کر کے چن لی جاسکتی تھیں۔ نوٹنگ کچھ اس احتیاط سے کرتا کہ لکھتے وقت ایک لفظ بھی نہ کاٹتا۔ کچھ حذف کرنے کی ضرورت ہوتی تو نہایت چابکدستی سے بربریا بیڈ کے ذریعہ قلم زد فی الفاظ میٹ دیتا اور سچ کاغذ کے اس حصہ پر اس احتیاط سے لکھتا کہ روشنائی نہ پھیلے پاتی۔ فائلس بہت قرینے سے فائل بورڈس میں بندھی ہوئی اس کی الماری میں سچی ریتیں۔ میں نے کبھی اس کو فائل تلاش کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس فائل کی ضرورت ہوگی وہ فوری رجسٹر کھولے گا نمبر دیکھے گا اور ایک منٹ الماری کے پاس کھڑے رہنے کے بعد دو سال پرانا فائل بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ کو شاید یس کر تعجب ہو گا کہ رام دیال کے خوابوں کی دنیا میں بھی فائل کا دخل تھا۔ میں نے اس ذہنیت کا آدمی نہیں دیکھا۔ اس کے شعور اور تحت الشعور میں بھی اس کے فائلس بس گئے تھے۔ صدر دفتر کی آٹھ پارٹی متفیق کے لیے آئی تو ایک فائل ہاوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوئی۔ ہم سب کو حیرت ہوئی کہ رام دیال کی متعلقہ فائل اور وقت پر نہ ملے اور سچ ایسی صورت میں جب کہ رام دیال اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس دن وہ بہت دل گرفتہ رہا۔ صیغہ کی ساری الماریاں چھان ماریں اور کوئی سا تبیحے شام گھر لوٹا۔ دوسرے دن وہ بہت بے چینی سے اسٹنٹ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو اس نے بہت رازدارانہ انداز سے کہا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ بہت مسکراتے ہوئے کھویا ہو فائل اسٹنٹ صاحب کی الماری کے دوسرے خانے سے نکال کر مجھے دے رہے ہیں۔ آپ نے خواب میں بھی مجھ سے ہمدردی کی ہے اور میرے ساتھ فائل کی تلاش میں اپنا سارا دن خراب کیا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں سہولوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا خواب غلط نہ ہوگا۔ رات کو جب آنکھ کھلی ہے تو سچ میں سو نہ سکا۔ جی چاہتا تھا کہ فوری صبح ہو جائے اور میں دفتر پہنچ جاؤں۔ آپ یقین کیجئے کہ رات ہی کو دفتر پہنچ کر اسٹنٹ صاحب کی الماری

اُجلی پر چھائیاں جیسار

کھولنا میسے بس میں ہوتا تو میں رات ہی کو اس کام سے نیٹ لیتا۔ لیکن اس قسمتی کو کیا کروں کہ اسٹنٹ صاحب اب تک نہیں آئے ہیں اور دوسری کوئی چابی الماری کو نہیں لگ سکتی مجھے اس بیوقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ دفتری کام سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ مضحکہ خیز نہیں توادر کیا ہے۔ اسٹنٹ صاحب کی الماری سے فائل برآمد ہو بھی جائے تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی۔ ہمدردی تو رام دیاں سے ہے کہ فائل اس کی زندگی کا ایک جز بن گئی ہیں چیرا سی نے اسٹنٹ صاحب کے آنے کی اطلاع دی تو ہم دونوں الماری کھولنے کی تیاری سے ان کے اجلاس پر پہنچے، چابیاں حوالے کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ فائل ان کے پاس نہیں ہے لیکن رام دیاں نے ان کا جلد پورا ہونے سے قبل ہی الماری کھول دی اور منٹ و منٹ بعد فائل نکال کر اسٹنٹ صاحب کے سامنے رکھ دی وہ کچھ پشیمان سے ہو گئے اور زور سے گھنٹی بجا کر چیرا سی کو یا فی اللہ کے لیے کہہ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو رام دیاں کی آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں۔ جانے کیوں وہ روٹنے کو تھا اور اپنے تخت الشعور کو بشارت ایندلی سمجھ رہا تھا۔ ایک دن قبل جس فائل کے لیے سارے دفتر میں تہلکہ مچا ہوا تھا وہ آج بغیر کسی جستجو کے رام دیاں کے خواب کی تعبیر بن گئی تو یہ بات سارے دفتر میں گونجنے لگی۔

ایک بار سیرقان ہو جانے کی وجہ سے اس نے رخصت لے رکھی تھی۔ میرا اس زمانے میں اس کے گھر آنا جانا نہ تھا کیوں کہ دوسروں کی طرح خود میسے کے لیے بھی مسئلہ بہت اہم تھا کہ اس سے کس قسم کی باتیں کی جائیں اور اس خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی یہاں تک کہ میں عیادت اور مزاج پر سی کے معمولی فرائض کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ باوجودیکہ اس کے اپنے بارے میں میری رائے معلوم کیے بغیر ہی وہ مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ مجھے

اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا، اپنا دکھ درد مجھ سے بیان کرتا تھا اور کم از کم نماز جمعا ادا کرنے کے لیے شد و مد سے نصیحت کرتا۔ اس نے ایک دن میسر پاس آدمی بھیجا کہ وہ شام کی ٹرین سے پانڈیچری جا رہا ہے، اس لیے میں اسٹیشن پر ضرور ملوں میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹنے میں دو چار منٹ باقی تھے میں نے تاخیر سے پہنچنے پر معافی مانگی تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کو میں نے بے وجہ تکلیف دی۔ میری صحت چوں کہ خراب ہے اس لیے میں نے سوچا کہ میرے سے پہلے کم از کم یہ حسرت تو کھلی جی جائے کہ میں نے پانڈیچری کے آشرم کی زیارت نہیں کی۔ پتہ نہیں کہ میں واپس آ بھی سکوں گا یا نہیں، اس لیے آپ سے طے بغیر چلے جانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ واقعی رام دیال اب واپس نہ آ سکے گا اور یہی اس سے آخری ملاقات ہے۔ لیکن رام دیال خلاف توقع واپس آیا اور اپنے ساتھ دو ایسی چیزیں پانڈیچری سے لیتا آیا جو بعد کو اس کی شخصیت کا اہم جز بن گئیں اور آج آپ ان کا تصور کیے بغیر رام دیال کے ہرے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ اہم چیزیں اس کی ڈاڑھی اور زلفیں تھیں۔ البتہ اپنی کھوئی ہوئی صحت اس کو پانڈیچری کے آشرم میں بھی نہ مل سکی تھی، اگلے اخراجات زیادہ ہو گئے تھے اور وہ مقروض ہو گیا تھا۔

رام دیال کے مزاج کا تلون اور بڑھ گیا۔ وہ معمولی سی بات پر سبھی الجھ پڑتا۔ پانڈیچری سے لوٹنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی بچی کچی ہنسی بھی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ رام دیال جو عہدیداروں کی ذرا سی خفگی پر دن دن بھرا اس ہو جاتا اس میں اس قدر تغیر نہ آیا تھا کہ وہ اب ان سے حجت کرتا۔ مجھے افسوس تو اس بات کا تھا کہ یہ حجت کوئی خود اعتمادی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ تھا جو خود اعتمادی کے چھن جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس کی خود اعتمادی پر کٹر مذہبیت نے پھرے بٹھا دیئے تھے اور

صحت کی خرابی کی وجہ سے اس نے ہر پہرہ بندی کو قبول کر لیا تھا۔ اگر وہ صحت مند ہوتا تو ہو سکتا ہے اس کے نہ ڈاڑھی ہوتی نہ زلفیں اور نہ وہ دفتر کی سیاست کو کسی اوتار سے رجوع کرتا۔ ایک بار مددگار متعلقہ سے کسی بات پر اس کی ٹھن گئی مددگار صاحب نے رام دیال سے جواب طلب کیا اور تا حکم ثانی دفتر کے کام سے باز رہنے کا حکم صادر فرما دیا۔ یہ رام دیال کی ڈاڑھی اور زلفوں کا زمانہ تھا۔ اس نے تین دن تک کوئی جواب پیش نہ کیا بلاناغہ حسب معمول وقت پر دفتر آتا۔ اپنی سیلی سی تھیلی میں سے آئینہ نکال کر میر کی ادھ کھلی دراز میں رکھ لیتا اور دو دو تین تین منٹ تک بغیر ہلک جھپکائے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا رہتا۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا اور دو تین منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا۔ پھر آنکھیں کھول دیتا اور اپنے چہرے کو آئینے میں نکلتا۔ لوگ اس کی طشہ اشارہ کرتے، اس پر ہنستے، چہبتیاں کسی جانتی لیکن یہ سب کچھ بہت آہستہ آہستہ ہوتا اس لیے کہ اگر رام دیال سن پائے تو کوئی نیافتہ جاگ اٹھے۔ دو دن اسی طرح گزر گئے دوسرے سکشن سے لوگ آکر دیکھتے، زیر لب مسکراتے اور دوسرے تماشہ بینوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے۔ یہاں تک کہ رام دیال نے اس کے خلاف ہونے والے تبصروں کو تار لیا لیکن کسی سے الجھنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی کیوں کہ اگر بات بڑھتی تو یکدہن رام دیال کو پورے دفتر سے مباحثت مول لینی پڑتی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار نہ کر سکا۔ ان دنوں میں بھی اس سے انجان رہا لیکن دوسرے دن دل کڑا کر کے میں نے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس آئینہ بینی کا مقصد کیا ہے۔ رام دیال نے جواب دیا کہ —

”I WANT TO CULTIVATE MY INDIVIDUALITY“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ شخصیت اور انفرادیت کی نشو و نما آئینہ بینی سے کس طرح ہوتی ہے اور مددگار نے جو جواب طلب کیا ہے اس پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بات کو طول دینا میں نے مناسب

نہ سمجھا اور چپ ہو کر اپنی مینر پر اکر فائلس پر جھک پڑا۔ تیسرے دن رام دیال آئینے کی بجائے آرونڈ گھوش کی فریم میں جڑی ہوئی لچھوٹی سی تصویر اپنے ساتھ لے آیا۔ اور اگلے دو دنوں کی طرح آئینہ بنی کی بجائے تصویر بنی میں لگا رہا۔ دفتر ختم ہونے سے پہلے مددگار نے ایک دن کی مہلت دیتے ہوئے سختی سے جواب طلب کیا تو رام دیال ... زندگی میں پہلی بار منتظم سے اجازت لے کر وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ چوتھے دن اس کے ساتھ نہ آئینہ تھا نہ آرونڈ گھوش کی تصویر۔ مددگار کے اجلاس پر وہ معذرت نامہ چھوڑ آیا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

آپ کو شاید رام دیال سے ہمدردی نہ ہو لیکن آنتوں کی بیماری کا شکار ہو کر اس نے ایسی رخصت لے لی تو مجھے اس کی جائداد پر منصرمانہ ترقی دے دی گئی کیوں کہ وہ سکند گریڈ ایڈیٹر (AUDITOR) تھا۔ ترقی ملی تو آپ یقین کیجیے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میری دلی تمنا تھی کہ رام دیال صحت پا کر جلد واپس آجائے اور یہیں سے میری ہمدردیاں اس سے وابستہ ہوں۔ وقتاً فوقتاً میں اس کی مزاج پرسی کے لیے جانے لگا۔ جب بھی جانا اس کو یقین دلاتا کہ وہ جلد ہی صحت پا کر لوٹے گا اور اس کی سچی ہوئی ٹیکس زیادہ دن اس کے ہاتھوں کے لمس کی منتظر نہ رہیں گی۔ شروع شروع میں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے میرے غلوں کی صداقت کو سمجھا بھی یا نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ میری ہمدردی کا معترف ہوتا گیا۔ کسی ساتھی کی طویل رخصت بیماری کے سلسلے میں منصرمانہ ترقی مل جائے تو آپ اس کا اندازہ غالباً نہیں کر سکتے کہ ایسی ترقی سے خوشی نہیں ہوتی بلکہ اس کے دکھ درد کا احساس اور شدید بوجھ جاتا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لینے وقت مجھے رام دیال بے طرح یاد آتا جو بیماری کی حالت میں نصف تنخواہ پر گذر بسر کر رہا تھا اور اسی ترقی کی وجہ سے میں اس سے زیادہ ملتے رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ انھیں ملاقاتوں سے اس کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں سے مجھے واقف

ہونے کا موقع ملا۔ عیادت کے وقت اس کے لیے کچھ چھل لے جانا میرے لیے سکون کا باعث ہوتا اور وہ اس معمولی تحفے سے اس قدر ممنون ہوتا کہ مجھے شرمندگی ہوتی کیوں کہ میں اسی کے پیسوں سے اس پر احسان کر رہا تھا لیکن کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی مجھے اس ذمہ ازیت سے نجات مل گئی۔ کیوں کہ ایک ساتھی کے دوسرے محکمے میں منتقل ہونے کے سبب سناری کا سہا ظ کرتے ہوئے مجھے اس کی جائیداد پر ترقی دے دی گئی اور سیوانندم نے رام دیال کی جگہ منصرمانہ ترقی حاصل کر لی اور اس تاریخ سے وہ کبھی رام دیال کا بھی خواہ نہ رہا۔ یہ اس کی فطری خباثتیں تھیں جو میں نے اپنے کسی دوسرے ساتھی میں نہیں دیکھی۔ لیکن آدورفت کا یہ سلسلہ میں نے اب بھی جاری رکھا۔ اور سیوہ لے جلتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہونے لگی۔

دوسرے دن رام دیال کی تنخواہ لے کر جب میں ہسپتال پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی معدہ میں ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے آنتیں سڑ گئی تھیں۔ اس پر غنودگی طاری تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں نہ نیگا نکت تھی نہ بیگانگی نہ شکوہ سخاۃ شکایت۔ صرصر کہہ رہی تھی، موت سے چٹکیں تھیں اور کچھ ایسی وحشت تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ آروند گھوش کی تصویر اس کے سر ہانے پڑی تھی جس کو وہ کبھی گھنٹوں گھورا کرتا تھا۔ لیکن آج اس تصویر میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ رام دیال کی آنکھوں سے آنکھیں چا کر سکے۔ اس کی بیوی پائنتی بیٹھی سکیاں لے رہی تھی اور سر روپ مجھ سے نظریں ملنے کے بعد آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈاکڑوں سے معلوم ہوا کہ کل گیارہ بجے تک زندگی اور موت کی جنگ کسی قطعی فیصلہ پر پہنچ جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیوانندم اپنی ساری خباثتوں کے ساتھ آخری اور بھرپور وار کر رہا ہے اور جیت سیوانندم ہی کی ہوگی۔ میں نے رام دیال کی تنخواہ آہستہ سے جیب سے

نکال کر سروسپ کے ہاتھ میں رکھ دی اور بغیر کچھ کہے سنے واپس لوٹ گیا۔ سروسپ نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

صبح جب میں ہاسٹل پہنچا تو سروسپ مجھے ہاسٹل کے گیٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ گیٹ کے پہلو کے ہوٹل کی جانب اس کو جاتا ہوا دیکھ کر میں نے بھی اپنا رخ بدل دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رام دیال ابھی زندہ ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو مجھے دیکھنے بغیر ہی وہ اس انداز سے مجھ سے مخاطب ہوا جیسے جانتا تھا کہ اس کی پشت پر میسر ہاتھ کے سوا دوسرا ہاتھ رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا کہ جیتا کا آپریشن رات ہی کو ہو چکا ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ پنج بجائیں گے۔ رات ہی کو آپریشن نہ ہو جاتا تو شاید جیتا بچ نہ سکتے۔ رات کو جب آر۔ ایم۔ او نے ان کا معائنہ کیا تو ان کی حالت بہت نازک تھی، اسی وقت سہول سرجن صاحب کو فون کیا گیا، اور مشورہ کے بعد آپ کے رام کو موت کے منہ سے جین لیا گیا۔ آر۔ ایم۔ او بڑے اچھے آدمی ہیں اور کل رات بھابی نے ان کے قدم پکڑ لیے تھے۔

لیکن اس کے باوجود کبلی کے سوچ چربی جھوٹی گڑ کسی دوسری ہی انگلی نے صاف کر دی ہے۔ رسونی گھر سے آج بھی دھواں اٹھتا ہے۔ کٹر کیوں سے گزر کر روشنی ٹرک کے کنارے تک آج بھی پہنچتی ہے۔ لیکن سروسپ کی بھابی کی دھوٹی الگنی پر پھر کبھی نہ جھولی۔ رام دیال کے کوٹ کے ٹخن پھر مضبوط نہ ہو سکے جیب اور کالر پھر نہ سل سکے۔ سروسپ دیال اپنی کلاس سے آج بھی غیر حاضر ہے اور ہمارے دفتر میں پرومیشنری کر رہا ہے۔ اس کی نوٹ بکس کے سادہ صفحات اس کی فون ٹین پن کی نب کو چومنے کے لیے آج بھی ترستے ہیں یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ رام دیال کی سیکل ۴۴ روپے میں ایک بنیے کے پاس رہن ہے جس پر ماہانہ پانچ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی محبوب اور مقدس کتابیں چوک میں

پُرانی کتابوں کی دکانوں پر آپ کو دستیاب ہو سکتی ہیں جس پر رام دیال نے بہت احتیاط سے اپنا نام لکھا تھا۔ اس کی متعلقہ فائلس، دوسری فائلس کی ڈبیر میں آج بھی ایک ہی نظر میں پہچان لی جاسکتی ہیں۔ سروپ دیال کی بھابی اس آشرم میں فائز کرتی ہے جس آشرم سے چارمیل کا لباس سٹے کر کے سروپ دیال روزانہ دفتر آتا ہے ہمارے دفتر میں ایک اور رام دیال جنم لے رہا ہے جس میں خود اعتمادی ہے اور جو شکست خوردگی کو موت سمجھتا ہے کیونکہ رام دیال مرا نہیں ہے وہ ہاسپل میں صحت پا رہا تھا کہ یکا یک رات کو کہیں غائب ہو گیا۔ سنتے ہیں کہ اس نے اینڈیجری کے جنگلوں میں زندگی کے راز کو پایا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رام دیال زندہ نہیں ہے وہ مر چکا ہے اور سروپ دیال مر کر بھی کبھی نہیں مرے گا۔ اس لیے کہ اس نے زندگی کے اس راز کو پایا ہے جس کو رام دیال نہ پاسکا اور پھر ہمارے دفتر میں کتنے ہی سروپ دیال جنم لے چکے ہیں۔

م
ن
ق
ا
ب
ج



مجھے یقین ہے کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹ جائے گا۔ میں اس دن خوش ہو گیا یا نہیں قطعی طور پر اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسٹیشن کے حدود سے لے کر رائل ہوٹل اور اسٹار بار اور دوسری سمت عابدس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکر تک اللہ کی ساری مخلوق سارے بندے حسن منائیں گے۔۔۔۔۔ خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملتے پھریں گے۔ یہ نہ سوچیں گے کہ کون اجنبی ہے، کون بیگانہ ہے۔ ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کے باوجود، بیگانہ ہونے کے باوجود اس خطرناک وبا سے، اس خوفناک دشمن سے متحدہ طور پر سب کے سب بیزاریں۔ اس کی حکومت صرف ان ہی حدود تک محدود ہے جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی مشرق میں اسٹار بار سے مغرب میں عابدس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکر تک۔ شمال میں درگاہ یوسفین سے جنوب میں رائل ہوٹل تک۔ لیکن اس کی راجدھانی ناپلی اسٹیشن ہے۔ ورنہ وہ سارے شہر کو اپنے ایک پیر سے روندنا پھرتا۔ راجدھانی کی اہمیت کے مد نظر قریب قریب ہندوستان بھر کے باشندے اس کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ آپ دلی سے آرہے ہوں، بمبئی سے

آرہے ہوں، بجاڑے سے آرہے ہوں، آئیں گے تو ناپمیلی اسٹیشن پر ہی۔ بس
 پلیٹ فارم پر آپ نے قدم رکھا اور آپ اس کی زد میں آئے۔ وہ ترس کھا کر آپ کی طرف
 نظر اٹھائے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ اور اگر بجلی کی سی تیز رفتاری سے اس کے ذہن
 میں یہ خیال آجائے کہ آپ سے ملنا چاہیے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو آپ سے ملنے سے
 نہیں روک سکتی۔ اور ہاں ہے سچی تو برا منکسر المزاج۔ ایسی ایسی شاہراہیں، ایسے ایسے
 ہٹول، بار، پیروں کی خانقاہیں، ان سب پر حکومت کرنے والا دھڑام سے آپ کے قدموں
 میں گر جائے گا۔ آپ اچھل پڑیں گے بغیر متوقع طور پر آسمان سے کوئی چیز ایک دم آپ کے
 قدموں میں آگرے تو اس طرح اچھل پڑنا بالکل فطری عمل ہے۔ لیکن عین اس وقت
 وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کے پیروں کو پکڑ لے گا۔ آپ یا تو ٹرک پر گر جائیں گے
 یا بمشکل تمام اپنے بازوؤں کو فضاؤں میں لہرا کر سنبھل جائیں گے۔ اس کا انکسار اور
 بڑھے گا۔ وہ آپ کے قدموں سے چمٹ کر رہ جائے گا۔ اس طرح کہ آپ ایک قدم نہ بڑھا
 سکیں گے اور بالکل بے بس ہو کر اپنے اطراف دیکھنے لگیں گے کہ شاید کوئی آپ پر ترس
 کھائے۔ لیکن آپ یہ سب بھول گئے ہیں کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد جہاں آپ اس کے ہاتھوں
 میں بے بس ہو گئے ہیں وہ سچی تو وہی علاقہ ہے جہاں اس کی حکمرانی ہے۔ لوگ
 عادی ہو چکے ہیں۔ سب اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اطراف بے شمار دکانیں ہیں۔ زیادہ تر
 پان کی دکانیں اور بوتل ہیں۔ پنواری گلواریاں بنا تار ہے گا۔ ہونٹوں کے بیرے آوازیں
 لگاتے رہیں گے۔ کوئی آپ کی طرف نظر اٹھا کر سچی نہیں دیکھے گا۔ آپ مجبوراً اور بے بس
 کھڑے کھڑے ہر راہ چلنے والے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھیں گے، لیکن کب تک دیکھیں گے۔ کچھ
 سوچ کر اپنی جیب میں اپنی انگلیاں ٹھونس دیں گے۔ حیدرآباد کی پہلی شاہراہ
 پر آزادانہ چلے پھرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کوئی چمکدار پیسہ کوئی آدھائی آپ کو

سٹرک پر چھینک دینی ہوگی۔ وہ آپ کے قدموں کو چھوڑ کر اس پیسے یا ادھ اتی پر جھپٹے گا اور آپ اپنی پتلون کی کمریں یا پاجامے کا پانچہ، یا دھوتی کا پخلا سر اور دست کر کے اپنے اس حملہ آور کو نظر بھر کر دیکھنے کے لیے پلیٹس گے تو وہ انتہائی تیز رفتاری سے ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا موٹروں، رکشاؤں اور سیکلوں سے بچ بچ کر سٹرک پر دھس کر قرض کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یا پھر نظر ہی نہ آئے گا۔

میں جس شخص کی باتیں کر رہا ہوں وہ کوئی تیمور لنگ نہیں ہے جو اپنے لاؤشکر کے سہارے حکومت چلاتا ہو۔ گیارہ بارہ سال کا ایک چھریا سا کھلے رنگ کا لوٹرا ہے جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ گالوں کے اوپر کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی ہیں اور ہونٹوں کے اوپر یا پیشانی کے نیچے (صحیح مقام انھیں کے درمیان کہیں ہوگا) ناک کچھ اس طرح چکی ہوئی ہے جیسے کوئی سینڈک پاؤں سیمٹ کر جبت کرنے سے پہلے سکر گیا ہو۔ وہ سامنے کھڑا ہو کر ہاتھ پسارے گا تو جانے کیوں یہ احساس ستا رہے گا کہ چٹ سے اب اس کی ناک اپنی ناک پر سوار ہو جائے گی۔ بہر حال اس کی شخصیت میں اس کی کٹی ہوئی ٹانگ اور مینڈرک جیسی ناک کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے جسم میں معلوم نہیں خون ہے یا نہیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی شریانوں میں خون کے بدلے پارہ ہی پارہ دوڑتا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ آپ کے آگے کھڑا ہوگا تو اس کی ٹنڈ منڈ کٹی ہوئی ٹانگ جو قمیص کے دامن کے نیچے چھپی ہوئی ہوگی جھٹ سے دامن ہٹا کر آپ کو دیکھنے لگے گا اور اس سے پہلے کہ آپ اس کو غور سے دیکھیں جھٹ سے دامن کے نیچے چھپ جائے گی اور جب تک آپ دیاسلانی سے اپنا سگریٹ جلا کر مپلا کش لیں وہ پھر دامن کے نیچے سے آپ کو تانے لگے گی۔ جلنے کیوں ذہن اس طرح سوچے گا کہ اس کے دامن میں ایک چھپا ہوا خنجر ہے جو آہستہ سے آپ کی ایک ٹانگ کو آپ کے دھڑ سے الگ کر دینے کی تاک میں ہے

آپ کچھ اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کھڑا کھڑا اچھل پڑے گا اور وہ اس ایک چکر لگا کر زمین پر اپنی ایک ٹانگ ٹکائے بالکل اسی طرح کھڑا ہو جائے گا جیسے پہلے کھڑا تھا ہونٹوں پر سینکڑے رکھے ہوئے ہاتھ پیرے دامن کے نیچے خنجر چھپائے۔

بھیک مانگتے ہوئے بے شمار اپاہجوں کو دیکھا ہے۔ میں نے تو وصف نہ دیکھا ہے آپ تو بھیک بھی دی ہوگی۔ یا کبھی جیب خالی ہونے پر معذرت بھی کی ہوگی۔ لیکن برہان سے آپ کا سابقہ نہیں پڑا۔ اس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ اس کا ڈھنگ سب سے الگ۔ بھیک دے کر بھی آپ کو اس سے استدعا کرنی پڑے گی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ یعنی یہ نہیں کہ مانگنا ہی چھوڑ دے۔ لیکن اس دھڑلے سے نہیں کہ دینے والا کانپ کانپ جائے۔ اس کی گنگنی بندھ جائے۔

اب آپ ہی انصاف کیجیے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا۔ دور کرنے میں کھڑا ہوا چپ چاپ آپ کو دیکھتا رہے گا۔ آپ سامنے سے گزر جائیں گے۔ آپ کی طرف دھیان ہی نہ دے گا۔ یہاں تک کہ آپ اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس موقع میں نظریں پھیر لیں گے کہ یہ لوٹنا نظر ملتے ہی گلے کا ہار ہو جائے گا لیکن وہ بس سے مس نہ ہوگا۔ آپ اس کی غیر متوقع خاموشی پر کین انکبیوں سے اس کی طرف دیکھیں گے۔ نظریں ملیں گی تو وہ فوری منہ پھیر لے گا۔ آپ نہایت اطمینان سے آگے بڑھ جائیں گے بمشکل دس قدم جاسکیں گے کہ وہ بجلی کی طرح اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا آپ کو آ لے گا۔ اس طرح کہ آپ محسوس بھی نہ کر پائیں گے کہ کوئی پیچھے سے حملہ کر رہا ہے اور وہ دھڑام سے آپ کے قدموں میں گر کر دونوں ہاتھوں سے سر ختم لے گا۔

بلا مبالغہ آپ بھی گر جائیں گے۔ کوئی نیکی آئے تو ہواؤں میں بازو پھیلا بھاؤ تبا کر سنبھل جائیں گے۔ لیکن اپنی چاروں طرف سے راہ گیروں کو زیر لب مسکراتا

دیکھ کر کچھ خفیف ہوں گے۔ خود بھی کھسیانی ہنسی ہنس دیں گے اور فوراً حجب سے ایک پیسے کی بجائے ایک انی نکال کر جھکیں گے اور اس کے ہاتھ میں تنہا دیں گے، اور کچھ ایسا ظاہر کریں گے جیسے اس کی اس حرکت پر آپ نے برا نہیں مانا۔ لیکن سچ پوچھیے تو آپ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پا سکیں گے اور اپنے دل میں نفرت کا ایک خزانہ چھپائے چکے سے آگے بڑھ جائیں گے۔ برہان کی کینگی پیر دراصل آپ کی شرافت نے فتح پائی ہے، ورنہ ہر شخص بخوڑی اس طرح اس کی خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتا۔

لیکن باوجود اپنی شرافتوں اور نیکیوں کے آپ سبھی تو آخر آدمی ہیں۔ مہینے دو مہینے میں گاہے ماہے اس راستے سے آپ کو گدزنا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ اب مہینوں آپ اس طعنہ نہیں آئیں گے، اور برہان کی یہ بدتمیزی آپ کے ذہن سے دوسری لمحے محو ہو جائے گی، اور اگر اپنے دفتر کے لیے آپ کو روزہ ہی اس راستے سے گزرنا پڑتا ہے تو دوسرے دن بھی برہان قاطع (اکثر لوگ اس کو اسی نام سے پکارنے لگے ہیں) آپ سے یہی سلوک کرے گا۔ اس کے بعد تو یقیناً ہے آپ گر کشتن روز دوم کے مصداق نہ صرف روز اول ہاتھ سے کل جانے پر افسوس کریں گے بلکہ اپنی برہی کو سبھی نہ چھپا سکیں گے اور کان پکڑ کر برہان قاطع کو اپنے قدموں میں سے اٹھائیں گے اور ایک طمانچہ اس کے گال پر رسید کرنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ایک اور دھول جمائیں گے اور اچھی طرح سمجھا دیں گے کہ آئندہ سے اگر ایسی حرکت کی تو پھر مار مار کر چمڑی ادیٹروں گا اور ایک دمڑی نہ دوں گا۔

آپ اس کو مار رہے تھے نا، یقیناً مہینے میرا جی خوش ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو مشورہ دوں آپ اس کو اس طرح ماریں، اس طرح ماریں۔ اس لیے کہ

مجھے اس سے نفرت ہے۔

میں اس بات کا سخت مخالف ہوں کہ ہم جو ترقی پسندی کا لیلل اپنی پیشانیوں پر چھپا کر چھپاتے ہیں، سینوں پر لٹکا کر فخر محسوس کرتے ہیں، انسان دوستی پر قلم کھینچتے اور کاغذ کالے کرتے ہیں، ذرا سی مخالفت پر اسجائے تو کیا اپنے جانے پہچانے کے لیے نفرت اور بغض کا ٹھاٹھ پیش کرتا سمندر اپنے تنگ و تاریک سینوں میں چھپا لیتے ہیں۔ کیوں کہ سینے میں دبے ہوئے سمندر کی ساری موجیں ٹبری زیرِ پٹی ہیں۔ اس لیے جب تہوِ تیز ہوتا ہے تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ چہرے پر سیاہی کھنڈ جاتی ہے اور روح کتنی ہی سیاہ چادروں میں اپنے کو چھپائے عالمِ نزع میں روشنیوں اور اجالوں سے بیزار نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ کیا آدمی آدمی کو معاف نہیں کر سکتا؟

لیکن برہان قاطع کے تعلق سے میں خود اس مجرمانہ جذبے کا شکار ہوں۔ گوش کرتا ہوں کہ اس کو معاف کروں۔ بات آئی گئی ہوئی ہے تو سچوں بھی جاؤں لیکن صاف اس دن تو ٹبری بے عزتی ہوئی ہے نامیری۔ میری بجائے آپ بھی ہوتے تو اپنی انسان دوستی کی ساری قدروں کو برہان قاطع کی ناقدری کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھ کر فساد برپا کر دیتے۔

میں بنیاد رکھا، یوسفین کے قریبی محلے، آغا پور سے میں شقل ہوا تھا۔ روزانہ شام کو چل قدمی کرتا ہوا رائل ہوٹل پہنچتا۔ دو چار احباب اور جمع ہو جاتے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک یہیں بیٹھے گپ لڑاتے۔ لیجے میں تو اپنا پردہ گرام آپ کو سندنے لگا جس کی میاں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں تو ایک دن جب میں جنگی آفس کے برابر کی سرائے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو پوچھیے مت مجھ پر کیا بیت گئی۔ کتابیں بغل میں دبائے جگالی کرنے کے انداز سے پان چباتے، گنگنائے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ بس پتہ

نہیں کیا ہو گیا، ایک دم ایک جھکسا لگا۔ دونوں بازو ہوا میں لہرائے جس ہاتھ میں کتابیں تھیں اس ہاتھ نے بڑی محبت سے پاس ہی بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کے سر پر چہت لگا دی اور کتابوں نے اس کے قدموں میں بکھر کر ایک حلقہ بنا بنا لیا جیسے اس کو محصور کر لیا ہو۔ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میں حیران و ششدر کھڑا اس لڑکی کا منہ دیکھتا رہ گیا جو قبول صورت تھی جس کو میری کتابوں نے حلقہ بنا کر محصور کر لیا تھا، جس کے سر پر میں نے محبت سے چہت لگا دی تھی جس کا شور ہر برابر کی دکان پر پان خرید رہا تھا۔ جس سے میں انگریزی میں معافی مانگنے کے لیے ذہن میں کوئی اچھا سا جملہ بنا رہا تھا جو اردو کا ترجمہ معلوم نہ ہو۔ لیکن میں ابھی کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ اس نے خود گل افشانی کی۔ ”نان سنس، ایڈیٹڈ، گدا“

لیجے میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے قدموں میں کتابیں سمیٹ لی تھیں تو اس نے لب نازک کو خنک دے اور گل ہائے دشنام مجھ پر بھجوا دیے لیکن میں بد نصیب اپنا ذہنی توازن جیسے قریب قریب کھو بیٹھا تھا۔ نزاکت آواز پر سچی تو دھیان نہ دے سکا۔ نہ صرف اس نے مجھے انگریزی میں نوازا بلکہ ”گدا“ کہہ کر اپنی اردو دانی سے بھی مجھے مرعوب کیا۔ میں سمجھ گیا کہ گدا اس نے اس ”سجک منگے“ لنگڑے لونڈے کو کہا ہے جو میرے قدموں سے چٹا اطمینان سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے ایک مذک سکون ہوا کہ اس نے ہم دونوں ہی کو قصور وار ٹھہرایا ہے اور اس ٹکڑے گدے کو بھی معاون جرم سمجھا ہے، میں تو مجرم تھا ہی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اس سے انگریزی میں گفتگو کا آغاز کروں لیکن سچا ہوں لوگوں کا جو مرد کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور عورت کی ہمدردی میں اپنے باپ داداؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ میں تو ٹھٹھا اجنبی راہ گیر جو ان سڑکوں کے لیے سچی ابھی بنایا تھا۔ بے شمار لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مجھے نصیحتیں نصیحتیں کیں بعضوں نے شرافت کا

اصلی چھایاں

برہان قاطع

ثبوت بھی دیا۔ مجھے بے قصہ ٹھہرایا اور اس جھک منگے، ٹکڑے ٹکڑے لوٹے کو برہان
 بھلا لکھا۔ میری جان میں جان آئی۔ ایک اتنی میں نے کمال کر ٹکڑے پر بھینک دی۔ وہ اب
 تک میرے قدموں سے چٹا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک اتنی مجھے کچھ اور پہلے ہی
 پھینک دینی چاہیے تھی۔ لیکن میرا تو ذہن جیسے ماؤنٹ تھا۔ سوچ بچار سے بالکل عار
 اس نے میرے قدم چھوڑ دیئے۔ اٹھا اور ایک اتنی پر بجلی کی طرح گرا۔ میں ابھی
 اپنی پتلون کی کریمیں ہی ٹھیک کر رہا تھا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا زمین پر بھجری
 ہوئی میری ساری کی ساری کتا میں اٹھائے میرے پاس پہنچ گیا۔ مسکراتے ہوئے
 کتا میں پیش کیں۔ میں نے لے لیں تو اس نے نہایت اطمینان سے ہنستے ہوئے مجھے
 سلوٹ کیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔ میں نے بھی سوچا کہ اب
 نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ کتا میں بغل میں دبالیے لئے دگ بھر تاکے بڑھا۔ دو چار قدم
 ہی چل سکا تھا کہ جیسے کسی نے کتا میں چپکے سے کہہ دیا۔ ”اس نے تجھیں گدھا کہا ہے۔“
 میرے لیے اس وقت سوائے مسکرا دینے کے چارہ ہی نہ تھا۔ فقیر کا غصہ ہی جب فقیر کی
 جھولی میں رہتا ہے تو میں کس شمار میں۔ میں تو ٹھہرا فقیر گزیدہ۔ خیر صاحب پلٹ کر دیکھنے
 کی جرات کی کہ کہیں محترم کے شوہر جو اتنے لمبے پورے عرصے میں کہیں غائب تھے۔ پچھا
 تو نہیں کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود محترم پچھا کر رہی ہیں۔ اسنوں
 نے ہاتھ سے اشارہ کیا، میں ٹھہر گیا۔ قریب آئیں تو مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی اردو
 میں میرا شکریہ ادا کرنے لگیں۔

”مجھوت شکریہ ہے آپ کا مٹر۔“

میں سمجھا طنز کر رہی ہیں، اس لیے میں نے کہا۔ ”میدم میں پھر ایک بار
 معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں قصور میرا نہیں بلکہ.....“

— میڈم نے بات کاٹ دی۔

”ام کو تم اکسیکوز کرو۔ ام گالی تم کو نہیں دیا۔ ایک کمرنل گوٹنڈہ امارا پچھا پچھا پڑا۔ ام کو چھڑنا مانگا۔ ام بھوت ڈر گیا مسٹر۔ ام امارسی سے آیا۔ ابھی گاڑی سے اترا۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے رستم کی طاقت مجھے عطا کر دی ہے۔ میں نے بہت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا۔ لمبے میں پتہ نہیں تھوڑی سی رعونت کہاں سے آدھکی۔

”آخر تم جانتی کیا ہو؟“۔ نہ میں نے اس کو آپ سے مخاطب کیا نہ اب وہ میڈم رہی۔
”امارا انکل نکل کنٹہ میں رہتا ہے۔ ام کو نکل کنٹہ تک۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا“ میں نے بھی بات کاٹ دی۔

میں نے دیکھا وہ واقعی گہرائی ہوئی تھی۔

پاس ہی کھڑے ہوئے رکشا والے سے میں نے بات کی۔ اس سے پوچھ کر اس کو صحیح پتہ سمجھا دیا اور تاکید بھی کی کہ احتیاط سے لے جا کر انھیں ان کے گھر ہی پر چھوڑ دے ورنہ نئی نوٹلی میں بھٹک جائیں گی۔

بڑی شرافت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا اور خوش خوش مڑ کر ایک قدم بھی دجا سکا تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اس کا ایک پاؤں رکشا میں ہے اور ایک پاؤں سڑک پر ٹکا ہوا ہے جس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے لنگڑا لوٹنڈا اطمینان سے سڑک پر لیتا ہے اور وہ چیخ رہی ہے۔

میں نے لپک کر اس کو تسلی دی ”گھبراؤ نہیں میڈم، یہ وہ گوٹنڈہ نہیں ہے جو ناگیور سے تمھارا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ تو وہی لنگڑا لوٹنڈا ہے۔“

یہ دیکھ کر میرا پارہ بہت چڑھ گیا کہ وہ نہایت اطمینان سے مجھے ٹھٹھکے گھوم رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔

میں نے کان اینٹھ کر اس کو اٹھایا۔ دو ٹاپچے رسید کیے، لیکن اس نے اپنی پرس سے اتنی نکال کر جھپٹ سے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”یہ تم نے کیا کیا میڈم۔ ایک پیسہ بھی نہ دیتے اس پاجی کو۔“
لیکن اس کو میسٹریٹاپچوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ اس نے اطمینان سے ہنستے ہوئے میڈم کو سلوٹ کیا اور مجھے خوشونت سے گھورتا ہوا اچھلا لگا لگا کر فٹ پاتھ سے ٹرک پر آ گیا۔ اور سڑکوں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا جیسے ٹرک پر رقص کرنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور رکشا میں سوار ہونے سے قبل اپنی پرس سے تھوڑی سی ریڑگاری نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔
”ام تھوڑی پیسہ ہاتھ میں رکھتا۔“

وہ اور زیادہ گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہیں ناگیور سے تعاقب کرنے والا نہ آدھلے۔ میں نے سوچا ذرا کی ذرا اس کا خوف دور کرنا چاہیئے۔ اس لیے اس سے کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔
”تم تھوڑی پیسہ کیوں ہاتھ میں رکھتا؟“

”اوہ کورا سے میں مانگنے والا ملے گا تو ام دایٹ لیٹ۔ ون ڈب ان کو دے گا۔
پاؤں پکڑنے کو مت بولے گا۔“

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ”مت بولے گا“ میں نے دہرایا۔
وہ بھی ہنسنے لگی۔

وہ سمجھتی ہوگی کہ یہاں بھیک مانگنے کا طریقہ یہی ہے کہ جھپٹ سے بھکاری پاؤں پکڑ لیتے ہیں پھر سینے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر بھیک لے کر منستے اور سلوٹ کرتے ہیں۔ میں نے بڑے پیار سے اس کی بیٹی پر ہاتھ رکھا۔ اس کو کوئی اعتراض نہ تھا میں نے کہا ”تم اطمینان سے چلی جاؤ اب کوئی بھکاری تم کو نہیں ستائے گا۔ تم پاؤں پکڑنے کو بولے گا تو مجھے نہیں پکڑے گا۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ اس شہر کا یہی دستور ہے کہ بھکاری پاؤں ستھا کر بھیک مانگتا ہے؟“

اس نے حیرت سے پوچھا ”سب پکڑنے کو نہیں مانگے گا؟“ میں نے کہا ”کوئی بھی پکڑنے کو نہیں مانگے گا۔ ادھر آئے گا تو یہ لوٹدے پکڑنے کو مانگے گا۔ یا پھر میں پکڑنے کو مانگے گا۔“

”تم مانگے گا۔“ اس نے پہلے تعجب سے پوچھا پھر بے اختیار ہنسنے لگی۔

”تم آؤنا امارا اکل کا ہوم۔“

”آؤنا۔“

اچھا بھئی آ جاؤں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ تنھا کر اس کو رکشا میں سوار کرایا اور وہ چلی گئی۔

”ہاتھ ہاتھ میں۔ مورے ڈڈاں ڈڈاں، ڈاں۔ سلوٹ صاحب۔“ وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ناک چٹ سے اچھل کر جیسے میری ناک پر سوار ہونے والی تھی۔ اس کا ہنسنے کا ہوا پاؤں قمیص کے دامن میں سے مجھے تاک رہا تھا۔

”کیا چاہتا ہے۔ لگا دوں کیا ایک دھول۔“

”وہ بی بی جی اچھی تھیں۔“

اُعلیٰ برچھائیاں
برہان قاطع

”بی بی جی“ میں نے دہرایا۔
”وہی صاب“ اور اس نے اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی ایک جگر مگر کرتی
چوٹی مجھے دکھلا دی۔

میں سمجھ گیا کہ کھلا ہٹ میں کتنی کی بجائے چوٹی اس نے دے دی تھی۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ہاتھ پاتھ نہیں۔ مورے ڈڈاں، ڈڈاں۔
سامنے ٹرک پر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی، اور وہ اپنی ایک ٹانگ پر اُچھلنا
ہوا اچھلا وہ بن چکا تھا۔

دو سکر دن میں رائل کی طرف نہ جاسکا تیسرے دن شام کو دکان پر کھڑا ہوا
پان بنوار ہاتھ کا برہان آدھمکا۔

”کل آئے ہیں آپ۔“ اور بی بی جی کی طرف رہ گئے ہوں گے؟

”بی بی جی کی طرف؟“ میرا ذہن فوری منتقل نہ ہوا۔

”وہی صاب، اپنی گوری گوری میڈم چوٹی والی“

”اچھا جی! اب مجھے یہی کام رہ گیا ہے کہ جس میڈم سے تم کو چوٹی مل جائے اس
کی خیریت سے تمہیں اس کا کہنا رہا ہوں۔“

برہان قاطع نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں اس سے علانیہ جھوٹ بول رہا
ہوں، اور بڑے معنی خیز انداز میں سکڑنے لگا۔

میں نے اس کی سکڑا ہٹ کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم نے پرسوں اس سے بھی وہی ذلیل حرکت کی! مہیک مانگنے کا یہی نیا ڈھنگ
تم نے کیوں اختیار کیا ہے؟“

وہ کھڑا سکڑا رہا اور میرے سوال کے جواب میں ایک ہاتھ سے قمیص کا دامن

اٹھا کر اپنا تنکا پیٹ بیچا نے لگا۔

میں نے لہجے میں تنھوڑی سی برہمی کو شامل کرتے ہوئے کہا۔

”پھر مجھ سے بد معاشی کی بات کرتا ہے، میں تجھ سے بھیک نہ مانگنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شریف لوگوں کو بیچ ٹرک پر اس طرح رسوا کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟“

”سید سے مانگنے پر لوگ پسینے دیتے بابو جی،“

”پیر کپڑے لینے سے دے دیتے ہیں؟“

”ہاں! پر میں سب کے پیر نہیں کچڑتا بابو۔“

”کیوں؟“

”سب اچھے دل کے نہیں ہوتے بابو۔“

”اچھا۔ تو جانتا ہے کہ ٹرک پر اتنے تمام چلنے والوں میں کون اچھے دل کا

ہے کون بُرا؟“

”ہاں صورت دیکھ کر کچھ کچھ تو جان لیتا ہوں۔“

میں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے، پاس سے گزرتے ہوئے ایک پہلوان کی طفر

اشارہ کیا جس کا سر گٹھا ہوا تھا جس کے گلے میں تعویذ تھا اور جو مہین سے کرتے ہیں سے

اپنے چوڑے چکلے سینے کی سنایش زیادہ کر رہا تھا اور سٹرک چرل کم رہا تھا۔

”پکڑ لے نا اس کے پاؤں۔ تب جانوں۔“

وہ اس کو گھورنے لگا۔

میں نے ڈرایا۔ ”دیکھو کیا رہا ہے، مارے ٹھوکرؤں کے دم لے لے گا تیرا۔“

میں بس اتنا کہہ پایا تھا کہ وہ ایک ٹانگ پر جھلکتا ہوا جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا

اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قیصر پہنچ کر دھڑام سے اس کے قدموں میں گر کے اس سے

چمٹ گیا۔ پہلوان ایک دم اچھل پڑا تو برہان قاطع کا سر اور دھڑ بھی ٹرک سے کچھ اوپر اٹھا ہوا سا محسوس ہوا۔ یعنی جبارت کر کے اچھلے وقت بھی اس کے قدم اس نے ستھام رکھے تھے۔ میری جیت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پہلوان نے جیب سے کچھ نکالا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جھک کر اس کو اٹھایا۔ اس کے سلوٹ کرنے پر پیٹھ ٹھونک کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پنواری بھی میری اور برہان قاطع کی باتیں سن چکا تھا اس لیے وہ بھی کسی غیر متوقع حادثے کا منتظر تھا۔ وہ ہنستا ہوا کہنے لگا۔

”مار دیا بازی۔ بڑا حراف ہے صاحب یہ حرافی“

میں نے پنواری سے پوچھا ”لوٹا اس سے واقف تو نہیں ہے؟“

گوہران پنواری نے یقین دلایا کہ وہ اس کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

میں نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھوئیں کی ایک چادر ہوا میں پھینک دی،

اور اس کی اوٹ میں اپنی آنکھوں کو چھپا لیا۔ ابھی یہ چادر پوری طرح میری آنکھوں کے آگے سے ہٹنے لگی نہ پانی تھی کہ برہان سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں نے ہاتھ ہوا میں ہلا کر دھوئیں کی چادر کے ٹکڑے کر دیئے تو اس کے کھلے ہوئے ہاتھ پر ایک آنہ اور ایک ادھاتی چمک رہی تھی۔

”تو کب سے جانتا ہے اس کو؟“

”بس ابھی سے۔ جب سے آپ جانتے ہیں۔“

”پھر!“

”پھر کیا با بوجی؟“

میں کچھ بول کھلا گیا۔ اور اس کیفیت کو چھپانے کے لیے میں صرف غصے ہی کا

سہارا لے سکتا تھا۔

”ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے پاجی!“
”جھوٹ نہیں بولتا بابو جی۔ اللہ قسم جھوٹ نہیں۔“

”پچھرا!“

”پچھ کیا؟“

”ابے ڈر نہیں لگا تجھے اس کے پیر کھڑتے ہوئے۔“

”بالکل نہیں لگا ڈر۔“

”کیوں؟“

”بابو جی وہ تو مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ سینہ تان کر چل رہا تھا۔ اس کو اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ ہے نا۔ بس۔“

وہ رک گیا اور اس کی ناک جیسے چٹ سے اچھل کر میری ناک پر سواری کرنے کی تیاری میں تھی۔

”تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا۔“

”بس۔ بول دیا نا۔ ایسا آدمی کبھی کسی بچے کو اور مجھ جیسے لنگڑے کو مانیں سکتا بابو جی۔“

میں نے ایک اور دھڑکیں کی چادر مہو میں پھینک دی اور اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چادر ہٹتی تو وہ سڑک پر قرض کرتا ہوا سڑک کو غبور کر رہا تھا۔

میں حسب معمول رائے ہوٹل پہنچا تو خلاف توقع آج سیکر سائیکلوں میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ بے دلی سے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ چائے پی۔ سگریٹ کا سیکٹ نکالا تو وہ خالی تھا۔ سوچا کہ اب واپس ہی کیوں نہ لوٹ جاؤں۔ گیٹ پر آیا تو

سامنے مجمع تھا۔ سگریٹ کا پیٹ خرید اور سگریٹ جلا کر اپنی راہ لی۔ مجمع کے قریب پہنچا تو حسب توقع نہ وہاں کوئی مداری تھا، نہ مسمریزم کرنے والا اور نہ کوئی دوائی بیچنے والا۔ دو آدمی جھگڑ رہے تھے۔ سارا مجمع جیسے جھگڑا چکا رہا تھا۔ حالانکہ سب کے سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی مجمع میں شامل ہو گیا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے دو واہ صاحب واہ، آپ تو تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔
 ”و تو حضرات سٹرکوں پر منہ کے بل گر کر خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے تعلیم نہیں پائی ہیں؟“
 کسی دوسرے نے کہا۔

”ٹھیک ہے مولانا۔ پردہ کوئی آپ کے بازو برابر کا آدمی تو نہیں ہے۔ ذلیل سی کینہ اور سفلہ سی، اچانچ ہے، اور پھر ٹانگ برابر کا لونڈا ہی تو ہے۔“
 کسی تیسرے نے کہا۔

”ہاں جی گوشمالی کی ہوتی۔ چائٹا رسید کیا ہوتا۔ دھپیا دیتے۔ لیکن اس طرح تو بڑناڑا مار کر جھکس تھوڑی نکال دیتے ہیں۔ خوب علم پانی صاحب خوب شرافت دکھائی۔“

”اجی بڑے آئے حمایت کرنے والے، گھر لے جا کر پرورش کیجیے۔ آل اولاد نہیں ہے تو فرزند ہی میں قبول کیجیے۔ میں نے جو کیا درست ہی کیا۔“
 اور کسی کرخت آواز کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔

”کون ہے رے سالے جھٹل ٹٹل۔ کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے! — ذرا میں بھی تو دیکھوں — بیٹے اپنی صورت بھول جاؤ گے۔ جرواسالی پہچان نہ سکے گی۔“
 اور منجلے میاں پرلے نائروں کی دکان سے چھلانگ لگا کر مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ چھلانگ لگانے سے قبل اپنے ہتھ کی گانٹھ اس

برہان قاطع

اجلی پر چھائیاں

نے مضبوط کر لی تھی اس کے بعد میں مجمع میں آگے نہ بڑھ سکا، اور خیریت اسی میں معلوم ہوئی کہ دور سے نظارہ کروں۔ اور عواقب کو پیش نظر رکھوں۔ میں دس قدم پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

منجلے میاں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ مولوی صاحب آپ کے پیرکڑیاہوں آپ سچ میں نہ آئیں بس ایک ہاتھ دکھا دوں سالے کو۔ دوسرا ہاتھ لگاؤں تو جیل کووں کی نسل چھکلی کی اولاد۔ بیسیوں آوازیں مل گئیں۔

”منہیں سمجھی نہیں“

”جہانے سمجھی دو منجلے میاں“

کسی نے مخالفت کی۔

”جہانے کیوں دیں، مولوی صاحب سے بدزبانی کر رہا تھا۔ جہادے بڑے

بھائی ایک پرائے ٹائٹل کا ہاتھ“

شاید وہ پکار رہا تھا۔ ”ارے میری مائی تو چھوڑ دے شیطان“

دوچار پولیس کے جوان بھاگے آئے۔ لوگ چھٹنے لگے۔ کچھ نیٹیوں نے پولیوں کی

جگہ لی۔ لیکن فوری ادھر ادھر ہو گئے۔ چھٹتے چھٹتے جمع چھٹ گیا۔ منجلے میاں بڑبڑاتا ہوا اپنی دکان میں گھس گیا۔

بانی ٹنڈا ٹائی والا جنٹلمین مجھے نظر نہ آیا۔

میں اطمینان کا سانس لے کر قریب پہنچا تو سعید یہ ہول کی سیڑھیوں پر برہان

قاطع اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ آس پاس کے دکان والے رکشہ والے اس

سے ہمدردی کر رہے تھے۔

اس کی ناک پر خراشیں تھیں اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا بینڈک پیر تلے آکر دب گیا ہے جس کو اٹھا کر برہان نے اپنی پیشانی کے نیچے جھالیا ہے اور جو ذرا سے دھکے سے گر جائے گا۔ لیکن اس کو اس بینڈک کی پروا نہ تھی۔ وہ رہ رہ کر اپنی پسلیوں کو اور کم کو دبا رہا تھا۔

”آوارہ“ کے راہگیوں کی طرح اونچی تلون پہنے، دیب کمار کی طرح بال جھائے نیل کی شیشیوں کا اسٹینڈ ہاتھ میں سنبھلے ایک نیل مالش والا ٹنڈا برہان قاطع کی طرف بڑھا پڑنے یا رک کی طرح اس کی پیٹھ ٹھونکی، سر پر ایک چپت لگا کر کہا ”چل پہلو ان ٹھوک بجا کر میرے گل کے لیے تیار کر دوں تجھے“

برہان قاطع سیڑھیوں پر دراز ہو گیا تھا اور مالش کرواتے ہوئے عجیب عجیب صوتیں بناتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”اللہ قسم بوٹی بوٹی الگ کر دی۔ ذرا آہستہ ہاتھ دھرنا راجہ بھائی“ اور راجہ بھائی اس کی کچھ سنے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھر رہا تھا۔ برہان بعض وقت منہ بناتا۔ بعض وقت کراہتا۔ بعض وقت ”مر گیا باپ“ کہہ کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ ”ہے ہے نہیں سمجھنا تمہا باپ اتنا مارے گا۔ راجہ بھتیجا مر گیا۔ ذرا ہاتھ روک لے باپ“

راجہ بھتیجے نے گلے کی انگلی سے پیشانی کے پسینے کا بوندیں پونچھ کر پسینہ ٹپکاتے ہوئے برہان قاطع کو دیکھا تو وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہاں شاباش۔ چل۔ چ۔ ا۔ ل۔ کھڑا ہو جا۔

اور بدقت تمام برہان قاطع کھڑا ہو سکا۔

مجھ سے نظریں ملیں تو سلوٹ مار کر مسکرائے لگا۔

میں نے پوچھا ”کیسے چوٹ آئی ماہر نفسیات؟“

وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

میں نے وضاحت کی کہ ”تم نے غلط آدمی کے پاؤں کیسے ستھام لیے۔ چہرہ دیکھ کر نہ پہچان سکے کچھ؟“

”بالکل نہیں پہچانا بابو جی، پاؤں کیٹیں حرامی کے۔ اللہ قسم کیا ٹھوکر ایں لگا یا ہے۔“
”وتم ان حرکتوں سے باز کیوں نہیں آتے، چھوڑ کیوں نہیں دیتے اس طرح مانگنا۔“
”پھر کس طرح مانگوں بابو جی؟“

”جیسے سب مانگتے ہیں!“

”نیں دیتا بابو جی کوئی۔ اللہ قسم۔“

”دے گا سبھی۔ نہیں کیوں دے گا۔ سب کو آخر دیتا ہی ہے۔“

”آج سے چھوڑ دوں گا بابو۔“

”ہاں۔ شریفوں کی طرح مانگا کرو۔ تمہیں پتہ ہے لوگ تمہیں برہان قاطع پکارنے لگے ہیں؟“

”ہو بابو جی۔۔۔ کیوں پکارتے ہیں؟ بس ایک بار مولوی صاحب بولے اور سب پکارنے لگے۔“

”اس لیے کہ تم راہ چلتوں کو لوٹتے ہو۔“

”نیں جھوٹ بات، میں کاں لوٹتا ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔

دوسرے دن سے اس نے اس طرح مانگنا ترک کر دیا۔ روز ہی شام کو رائیل ہو جاتے وقت پنواڑی کی دکان پر اس سے ملاقات ہوتی۔ سلوٹ کر کے چپ چاپ کھڑا ہو جاتا۔ میں دوپیسے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بادل نا خواستہ مسکراتا تو جواب

میں اس کی مسکراہٹ سے محروم رہتا۔

تین دن اسی طرح گزر گئے۔ گوجران پنوار نے کہا ”اس دن سے بڑا شریف ہو گیا ہے لہذا کسی کو نہیں چھیڑتا۔“ اس دن جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا صاب۔ اس لڑے کو جبروت تھی اسی بات کی۔“

چوتھے دن پنوار کی دکان پر وہ مجھ سے نہیں ملا۔ میں نے پوچھا ”گوجران کیا بات ہے، آج برہان نہیں آیا؟“

”جبرو آیا ہے۔ ابھی ابھی تھا۔ وہ ٹھیک نہیں ہونے کا صاب۔ پھر وہی کرنے

لگا پاجی۔“

میں نے لوگ سچینک کر گھوری سنہ میں رکھ لی۔ کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ برہان قاطع دکھائی دیا۔ سر اُٹے کی دیوار کے پاس کونے میں کھڑا وہ موت رہا تھا۔ مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے نظریں پھیر لیں۔ میں سمجھ گیا وہ مجھے چکر دے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں جب وہیں ٹھہر گیا تو وہ مجبوراً میری طرف بڑھا۔

”تم نے پھر۔۔۔!“

اور اس نے جملہ پورا ہونے سے قبل ہی اعتراف کیا۔

”نیں کرتا تھا بالو جی۔ پر کیا کروں۔ دن میں ایک ٹیم سبھی بھر پیٹ نہ کھا سکا۔“

کل تو صف ”سچھٹا نوں“ پر رہ گیا۔ اللہ قسم بالو جی آج پیٹ بھر کھایا ہوں۔“

میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، اور پھر کہتا سبھی تو کہا کرتا۔ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا تو اس نے خود پوچھا ”خفا ہو بالو جی“ اس کی آواز رندہ لگی تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ برہان کبھی روہی نہیں سکتا اس کو میں نے بری طرح پٹتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت بھی وہ مسکرا رہا تھا۔ لوٹا ہے برا زمین کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے؟

میں نے کمن اکھیوں سے اس کو دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں
میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا تو برہان میرے قریب آگیا۔ کہنے لگا۔

”بابو جی، تین دن سے فاقہ کر کے آج میری ماں پڑوس میں آٹا قرض مانگنے چھوٹے
ٹیکسی ڈرائیور ہے نا، اس کے گھر گئی تھی۔ سالے کی جروا گھر پر نہیں تھی۔ ماں کو بہن بہن
پکارتا تھا۔ تین دن فاقوں کا حال سن کر یاں کہا ہاتھ کپڑا نا حرامی“

اس نے کچھ رک کر جھپک کر کہا۔

”میری ماں بڑی بہادر ہے۔ دو جھانپڑ میں ٹھیک کر دیا بیٹا کو۔“

اس کی آنکھوں میں اب بھی باقی نہ تھی۔ شاید ماں کی بہادری پر وہ فاختانہ
طور پر مسکرا رہی تھیں جو ان میں چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں سوچنے لگا برہان قابلِ فتنہ ہے یا نہیں۔ میں نے اس سے زیادتی کی
ہے۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس کی رگوں میں پارہ نہیں انسانی خون دوڑ رہا ہے۔
یہ ایک وہ چہرہ کہنے لگا۔

”ٹوٹا صاحب بول رہے تھے کہ ماں کا کسی سے نکاح کرادوں وہ بڑی اچھی ہے
میری ماں معلوم نہیں ہوتی بابو جی۔۔۔ وہ اتنی خوبصورت ہے مگر۔۔۔ اور برہان جملہ
پورا کیے بغیر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اس کے بعد برہان سے اپنا رویہ بدل دیا۔ انسانیت کے کتنے مستحسن
پہلو اس ہمدردانہ جذبے میں پنہاں تھے اس کا مجھے کچھ علم نہیں اس لیے کہ میں نے شعوری
اور غیر شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ وہ فتنہ جو برہان کے تعلق سے اُٹھ رہا ہے
میرے ذہن میں پیوست کر رہی ہے اس کو اپنے دل و دماغ سے اکیڑھ سینکوں۔

لیکن میں آج سچی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ گوجران پٹواری کی دکان پر گھوری سے لونگ نکال کر جب میں گھوری منہ میں رکھتا ہوں اور دیاسلانی سے سگریٹ جلا کر دھوئیں کی چادر ہوا میں پھینک دیتا ہوں تو ایک لنگڑا لوند جس کے جسم میں انسانی خون نہیں پارہ ہے، موٹروں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا سڑک پر قرض کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو سوائے میسے ہر راہ گیر کا پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرے لیے اس کی ان حرکتوں میں کوئی نیا پن نہیں رہا جس طرح دوسرے لوگ اس کی حرکات سے مانوس ہو گئے تھے۔ میں بھی اس کو اسی طرح دیکھ کر گذر جاتا جیسے سگریٹ کاکش لگا رہا ہوں یا پان کی پیک سڑک پر تھوک رہا ہوں۔ لیکن ایک دن اس نے پھر مجھے جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

آفس جاتے ہوئے میں نے گوجران پٹواری کی دکان پر رک کر حسب معمول پان لینا چاہا تو وہ دکان کے پیٹ بیٹھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر سچی گوجران نے پان بنانے کی زحمت زکی تو میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے گوجران؟“

وہ بہت دکھی تھا۔ اس نے کہا۔

”وہ آپ کو معلوم نہیں صاحب؟ اپنے برہان نے مولوی صاحب کو فخر کی نماز پڑھتے وقت چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔“

”برہان نے؟!“۔۔۔ مجھے یہ بات کچھ ناممکن سی معلوم ہوئی۔

میری حیرانی دیکھ کر گوجران کہنے لگا۔ وہ مولوی صاحب تھے نا۔ برہان کی ماں سے ان کے تعلقات تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی ماں سے وعدہ کرتے کہ اس سے نکاح کر لیں گے

لیکن سنا ہے کہ پیسوں وہ صاف انکار کر گئے۔“

میں جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

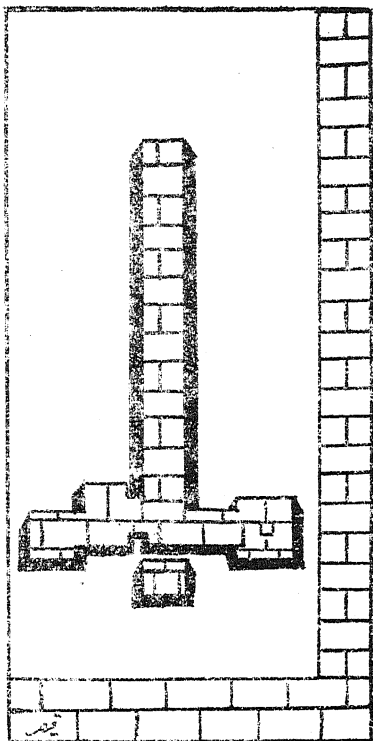
گو جبران دکان بند کر کے جانے لگا تو میں نے پوچھا ”کیا آج دکان بند کر چکے ہو؟“

گو جبران نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا —

”آج کام میں کچھ جی نہیں لگ رہا ہے صاب! برہان بہت یاد آ رہا ہے۔“

جانے کیوں میرے قدم سبھی دفتر کی جانب نہ بڑھ سکے اور میں گھر لوٹ آیا!





خانوس بچھ گئے۔ قمقمے گل ہو گئے۔ لیکن نواب کبیر سین خاں برآمدے میں
ٹہلے ہی رہے۔

آرام گاہ میں داخل ہوئے بڑے نواب صاحب کو پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے۔
گلابدن بوا پلنگ پوش کی سلوٹیں صاف کرتی ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے
آدھا جسم زمین پر اور آدھا جسم پلنگ پر پھینک کر بس دو چار بار پلکیں جھپکا سکیں اور
پھر جیسے فرشتوں نے انہیں آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھالیا۔ انہیں اپنے ٹوٹے ہوئے
بدن کی کچھ سدھ بدھ نہیں رہی۔ نواب صاحب خواب گاہ میں داخل ہوئے تو
انہیں گلابدن بوا کی جبارت پر بے اختیار پیار آ گیا۔ آنکھ کھلی تو گلابدن بوا نے دیکھا
کہ فرشتوں نے انہیں نواب صاحب کی گود میں پھینک دیا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ
جس کا نمک رگ رگ میں ہو اس کی ہو رہنا سچی تو نمک حلائی ہے۔ اور صبح ہوتے
ہوتے گلابدن بوا، گلابدن بیگم بن گئیں۔

سرفراز علی بے چارہ اڈیلیوں کا صدر تھا۔ یہ اعزاز نواب صاحب نے دیا تھا

نواب صاحب کے ایک موٹھی دشمن نے جب ان پر حملہ کیا تھا تو سرفراز علی نے ہی اپنی جان پر کھیل کر نواب صاحب کو بچا یا تھا۔ نواب صاحب بھی جو ہر کے قدر داں تھے۔ نوازا اور دل کھول کر نوازا۔ انعام اکرام اور روزمرہ کی بات تھی۔ پھر ساری دیوڑھی سرفراز میاں، سرفراز میاں کہہ کر منہ سکھاتی تھی۔ لوگ نواب صاحب سے نظریں چار نہ کر سکتے تھے اور سرفراز علی کی نظروں کو تلکتے تھے۔ سرفراز علی مہربان ہو جاتے تو نواب صاحب کی مہربانیاں بھی شامل حال رہتی۔ زمین بوس ہو کر فرشی سلام کرنے والوں کی جانب نواب صاحب کی نظر اٹھ جاتی تو گویا سلام قبول ہو جاتا۔ لیکن سرفراز علی کی بات الگ تھی۔ نواب صاحب سے راز دار نہ بنتیں ہوتیں۔ لوگ محسوس کرتے کہ معمولی باتیں کے پرکتر رہا ہے۔ لیکن جب گلبدن بوا، گلبدن بیگم بن گئیں تو ساری دیوڑھی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

گلبدن بوا، سرفراز علی کی بیاتہا بیوی تھیں، اور سرفراز میاں لوگ کہتے ہیں کہ بوا پر جان چھڑکتے تھے۔ بوا بھی سرفراز علی کو اپنے سر کی قسمیں دیتی رہتی کہ نواب صاحب کے لیے مال فراہم کرنے کرتے کہیں خود کسی کے نہ ہو رہنا۔ اور سرفراز علی کسی کے نہ ہوئے۔ بھرے بازار سے اٹھا کر انھوں نے نواب صاحب کی خلوت میں بیٹھ کر کو داخل کیا اور پھر اس تاریخ سے ان کو اپنی مالکن سمجھا اور پھر ان کی تعظیم و تکریم کی۔ ایک قصہ تو اس طرح بھی مشہور تھا کہ نواب سکندر حسین خاں کی والدہ کو سرفراز علی نے لائیں مار کر ٹرین کے ڈبے دھکیل دیا نواب صاحب جب اپنی جاگیر گئے تھے تو ان کی نظر ایک لڑکی پر پڑ گئی۔ یہ نواب صاحب کے بہار کے دن تھے۔ بس حکم ہوا کہ محل میں داخل کر دی جائے۔ لڑکی کے ماں باپ اگر راضی نہ ہوں تو انھیں تین دلا یا جائے کہ ہم لڑکی سے

باضابطہ عقد شرعی کریں گے۔

لڑکی والے نہ مانے۔ بیکر ملکر کر بے زبان گائے کو اسٹیشن تک لایا گیا۔ ٹرین چھوٹے ہی کو تھی۔ بیچاری نے سوار ہونے میں پس و پیش کیا۔ سرفراز علی نے کچھ کر دیا اس کی چوڑیوں پر جڑیں اور بڑھتی ہوئی ٹرین میں ڈھکیل دیا۔ دو ستر دن دیوڑھی میں جب وہ پاندان کھولے مسند پر بیٹھی تھیں تو سرفراز علی نے سرو قد ہو کر بیگم کو سلام کیا اور ہاتھ باندھے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ آنکھیں تک چار نہ کریں۔ لیکن آج دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اپنی بیوی بھی مالکین بن گئی تھیں۔ نواب صاحب کے معتد خاص نے تجلی میں سرفراز علی کو بہت سمجھایا۔ تین دن سے سرفراز علی نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو کر سوچ گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت رونے سے سارے آنسو ختم ہو گئے ہیں اور اب آنسو کی جگہ خون نے لے لی ہے۔ لیکن جیسے یہ خون بھی آنکھوں تک پہنچ کر خشک ہو گیا تھا۔

معتد صاحب نے راز میں بات چیت کی تو لوگوں نے سرفراز علی کی سسکیاں تین دن بعد پھر نہیں۔ گلبدن بیگم نے مہر معاف کر دیا، سرفراز علی نے طلاق دے دی۔ نواب صاحب نے جو گراں قدر قسم سرفراز علی کو بھیجی تھی وہ لوٹاتے ہوئے سرفراز علی نے نہایت ادب سے ایک خواہش کی کہ گلبدن بیگم کو صرف ایک بار دیکھ لینے کی اجازت دی جائے۔ نواب صاحب نے اس کو مناسب نہ سمجھا، ٹال جانا چاہا لیکن گلبدن بیگم سے مشورے پر انھوں نے جب کوئی مضائقہ نہ سمجھا تو سرفراز علی کو اجازت دے دی گئی۔ گلبدن بیگم چھ پر جلوہ افروز ہوئیں، نواب صاحب ذرا سا اوٹ میں چھپ گئے۔ سرفراز علی طلب کیے گئے۔ نظریں اٹھیں۔ انھوں نے گلبدن بیگم کو دیکھا اور دوسری لمحے دوسرے

ہو کر فرشی آداب بجالایا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیوانہ وار بھاگے۔ اس کے بعد سنتے ہیں کہ سرفراز علی نے کبھی دیوڑھی کا رخ نہیں کیا اور کسی خیراتی ہسپتال میں مر گئے۔

گلبدن بواجب نواب صاحب کے عقد میں آئیں تو پورے دس ماہ بعد نواب

قلندر حسین خاں پیدا ہوئے۔ دو تین ماہ پہلے تولد ہو جلتے تو آج یہ چلتا پھرتا ناور

درخت جس کے ٹھنڈے سائے میں دیوڑھی کے لوگوں کو اپنی باقی زندگی بتانی تھی کسی

سوکھے ٹٹھکی طرح کسی گوشے میں دھوپ چھاؤں اور سرد گرم سہتا رہتا۔ لیکن نواب صاحب

کو یقین تھا کہ بلا شرکت غیر سے زمین کی آبیاری انھوں نے کی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہے

پودے کو پروان انھوں نے چڑھایا ہے۔ اسی لیے تو نواب قلندر حسین خاں کے متعلق

لوگ کہتے تھے کہ بس باپ کے منہ سے ٹپک گئے ہیں۔ چال ڈھال، رنگ روپ، دھوری

ہڈی، عمر سے زیادہ گوشت پوست اور چربی۔ نواب صاحب کو اگر جوانی بخش دی

جائے تو اللہ میاں بھی پہچان نہ سکیں کہ باپ کو نسا ہے اور بیٹا کو نسا؟۔ اسی لیے

تو وہ نواب صاحب کے چہیتے تھے۔ ورنہ دیوڑھی بھر میں کتنے ہی ایسے ننھے بچے درخت

پر کونے میں پڑے سوکھ رہے تھے جن کے متعلق نواب صاحب کو شبہ تھا کہ تخم کسی نے

بویا ہے تو کھادا انھوں نے دی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہو گا تو کھا دیکسی اور نے دی ہو گی

۔ دونوں کام نواب صاحب نے نہیں کیے۔ جب اس بات کا یقین ہو جائے کہ فصل

اپنی نہیں تو کون در در سر مول لے۔ کون جھکڑوں سے بچائے۔ کون پتے اور ٹہنیاں

گن گن کر پروان چڑھائے۔ آخر قدرت کے تفویض بھی تو کچھ کام ہیں۔

نواب قلندر حسین خاں نے حضور اکابر اس طرح مہر لیا تھا کہ ان جیسا بیٹا شہر

بھر میں ایک آدمی تھا۔ باپ کے سامنے ہوتے تو نظریں زمین سے ہٹانے کی ہمت نہ

ہوتی۔ ہاتھ باندھے، ٹوپی اوڑھے اس طرح مقطع بنے رہتے کہ اب سجدہ کریں گے اب سجدہ کریں گے۔ نئی نویلی شادی ہوئی تھی، لیکن کبھی بھی اسخوں نے آبا حضور کے آرام کرنے تک جملہ عروسی کا رخ نہ کیا۔ دلہن انتظار کرتی کرتی تنھک جاتیں۔ تنہائیوں سے اکتا جاتیں، پھر ماحول کی اجنبیت سے مجبور ہو کر تنہائیوں سے سمجھوتہ کر لیتی، تنہائیوں کی ہور مٹیں۔ لیکن نواب قلندر حسین خاں ان ساری باتوں سے بے نیاز آبا حضور کے آگے مسجد کے پیش امام یا درگاہ کے مجاور بنے رہتے۔

اس وقت بھی جب کہ نواب صاحب آرام نگاہ میں بستر پر کپڑوں میں بدل رہے تھے نواب قلندر حسین خاں نے فانوس اور قمقمے گل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ جگمگاتی دیوڑھی نے چشم زدوں میں سیاہ لہا دہ اوڑھ لیا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جملہ عروسی میں قید تنہائی کاٹنے والی دلہن نے چپکے سے اپنے دل کی دنیا کے اندھیکے ساری دیوڑھی میں گشت کرنے کے لیے چھوڑ دیئے اور ان اندھیزوں میں نواب قلندر حسین خاں آبا حضور کے خراٹوں کی آواز سننے کے لیے بے قرار ٹھل رہے تھے۔ اس لیے کہ آبا حضور جب تک سو نہ جائیں وہ کس طرح اپنی منتظر دلہن کے پاس جا سکتے تھے۔ انھیں اپنے اجاڑ سے تر کے میں بھی چند چیزیں تو ملی تھیں۔ بزرگوں کا ادب، بڑوں کا احترام

یہ ان کا زیور تھا، اور وہ اس زیور سے ہمیشہ آراستہ رہتے اور پھر آبا حضور کے آگے سیدھی سیدھی سانس لے لینا ہی ان کے لیے بہت تھا۔ جھلا آبا حضور کے جاگتے وقت ان کا ذہن دلہن کا خیال کرنے کی گستاخی بھی کر سکتا تھا۔ اللہ اللہ کہ آبا حضور نے خرخر شروع کی اور وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں ساری حویلی کا چکر کاٹ کر پائین باغ میں داخل ہوئے جہاں ان کی دلہن ان کے انتظار میں جاگ

دلہن کے کمرے میں بھی نواب قلندر حسین خاں دبے پاؤں داخل ہوئے۔ سوچا اگر دلہن سو رہی ہیں تو خود بھی چپ چاپ لہجی تان لیں تاکہ دلہن کو ان کے اس قدر تاخیر آنے کا اندازہ نہ ہو سکے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار انہوں نے یہ حرکت کی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دس پندرہ منٹ بستر پر گر دیں بدلتے رہتے پھر خود ہی دلہن کو جگا لیتے۔ دلہن بھی اس طرح کچھ دیر سے بیدار ہوئیں جیسے ابھی ان کی آنکھ لگی تھی۔ کبھی کبھی تو واقعی چوکھٹ پر نظر جمائے آہٹ کی منتظر وہ جاگتے جاگتے سو جاتیں۔ کبھی جاگتی رہتیں تب بھی لحاف میں منہ چھپائے پڑی رہتیں، زبان سے کچھ نہ کہتیں۔ لیکن آج خلاف توقع چنگ پر بیٹھی ہوئی وہ سکھیاں لے رہی تھیں۔ نواب قلندر حسین خاں کو دیکھا تو نظر بچا کر آنکھیں سے آنکھیں خشک کرنے لگیں قلندر حسین خاں سیدھے سادے نواب تھے۔ ساحل سمندر پر رہیں گے لیکن طغیانوں کا اندازہ نہ طوفانوں کی آمد کا پتہ۔ پانی سے اسے اور بچا ہو جاتا تو ڈوبتے وقت انہیں اس کا اندازہ ہوتا کہ وہ ڈوب رہے ہیں لیکن ابھی تو طغیانیاں دلہن کے سینے میں چل رہی تھیں بادل منڈلا رہے تھے۔ کھل کر کب برسیں گے اس کا خود دلہن کو علم نہ تھا۔ آج دو چار قطرے برس پڑے تھے تو نواب قلندر حسین خاں نے محسوس کیا کہ گھٹائیں اُٹا کر چھاری ہیں تو کبھی کبھی ٹوٹ ٹوٹ کر برس گئی بھی۔ انہوں نے صبر برداشت ہی پوچھا کہ بیگم نصیب دشمنان طبیعت ناساز تو نہیں۔ آپ اتنی رات تک جاگ کیوں رہی ہیں؟ — دلہن جو دیوڑھی بھر کے لیے دلہن بیگم تھیں اور نواب قلندر حسین خاں کے لیے صرف بیگم — کچھ بھی نہ کہہ سکیں — بستر کی شکنوں نے نشتر بن کر دلہن کو کچھ کے دیئے۔ دیواروں پر رنگی

ہوئی کتنائیوں نے دلہن کے کانوں میں سرگوشیاں کیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی چٹھی چٹھی آنکھوں نے دلہن کو اشارے کیے۔ کہہ دو دلہن۔۔۔۔۔ آج ہی کہہ دو۔۔۔ کہ تم دیوڑھی کے طول طویل احاطے میں سمجھتی ہوئی زخمی روحوں سے واقف ہو گئی ہو۔۔۔ ایسی روحوں سے جن کے ماضی کو..... بڑے نواب صاحب نے حرف غلط کی طرح محو کروا دیا ہے۔ ان روحوں کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مستقبل۔ لوح پاک میں ان کے ناموں کے متوازی ان کی تقدیر صرف تین لفظوں میں لکھی گئی ہے۔ پیدائش، عقد، موت۔ پیدائش سے لے کر موت تک اتنی لمبی پوری مدت میں ان کو نہ کوئی نیکی کرنی ہے اور نہ کسی بدی سے ان کا واسطہ ہے۔ اللہ نے اشرف المخلوقات کو پیدا کیا اور بہت سے کام اس کے تفویض کیے لیکن اللہ نے انھیں صرف ایک ہی کام دیا اور وہ تھا نواب صاحب سے عقد کر لینا۔ اس کے بعد اللہ نے اور کوئی کام سونپنے کی ضرورت نہ سمجھی۔۔۔ درو دیوار چرخ رہے تھے۔ تم نے بھی نواب ابن نواب سے عقد کر لیا ہے دلہن! استخاری زندگی کا مقصد سبھی پورا ہو گیا۔ تم جس لیے پیدا ہوئی تھیں وہ تم کر چکیں۔ اب اپنے مستقبل کو نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر بالکل بھول جاؤ۔ اب تمہیں مستقبل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کچھ نہیں ملے گا۔۔۔ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا چاہو گی تو یہ بھی ممکن نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ماضی کی دل فروش کن یادیں بھی حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر تم تک نہیں آسکتیں۔

چٹھی چٹھی آنکھوں سے کب تک درو دیوار کو گھورتی رہو گی دلہن۔ اپنی ہی سگی ساس کا عالم دیکھو۔ تنہا رہے شوہر کو جس کو کھانے جنم دیا ہے جس کے بطن سے وہ پیدا ہوئے ہیں آج وہ دیوڑھی کے درو دیوار میں اپنا ایک ایک آنسو اس احتیاط سے

دُعا کرتی پھر رہی ہے کہ کہیں بڑے نواب صاحب یا نواب قلندر حسین خاں اس کے اس بحرِ مانہ فعل سے واقف نہ ہو جائیں۔ ماں کے پیروں تلے اولاد کے لیے جنت ہوتی ہے دلہن۔ لیکن تمھاری حویلی کی ساری ماؤں نے یہ جنتیں بھی نواب صاحب کے والے کر دی ہیں۔ اس میں تمھارے شوہر کا کیا قصور ہے۔ ان جنتوں کے حصول کے لیے وہ نواب صاحب کے قدموں میں بچھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ نواب صاحب ان کے باپ ہیں۔ اور نواب صاحب کے پہلو میں وہ جو سولہ برس کی حسینہ ہے اس کا احترام تمھارے شوہر پر صرف اس لیے لازم ہے کہ وہ نواب صاحب کی چھیتی بیوی ہے اور نواب صاحب نے اس کے قدموں تلے کی جنت ابھی نہیں چھینی ہے۔

لیکن دلہن تمھارے لیے ابھی وقت ہے۔ تم نے اپنے پیٹ میں جس چیز کو بے پناہ محبت سے چھپا رکھا ہے اس کے لیے وہ جنت بھی چھپا رکھو جو تمھارے تلووں کے نیچے ابھی تک محفوظ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی گلبدن بیگم کی طرح — دلہن نے سر کو زور سے جھکادے کر ان وحشتناک خیالات کو زمین پر پٹک دیا۔ وہ قریب قریب کانپ رہی تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ صدائیں گھر کے در و دیوار سے نہیں آرہی ہیں بلکہ خود ان کا ذہن اپنے شوہر کے خلاف سوچنے کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، یا کوئی شیطان ہے جو درغلز رہا ہے۔ دلہن نے آیتیں پڑھ کر سینے پر پھونک لیں، اور توبہ استغفار کر کے طے کیا کہ کل ہی سے وہ پانچ وقت نماز پڑھیں گی تاکہ اپنے بیکار ذہن کو شیطان کا کارخانہ بننے سے بچالیں۔

نواب قلندر حسین خاں کو ہر گھڑی یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ آبا حضور کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کریں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آبا حضور کے ہورہنے

میں عزت، حکومت اور دولت ہر شے ان کے قدم چومتی رہے گی، اور واقعی انھیں ہر چیز حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود گلبدن بیگم دیوڑھی بھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دوسری بیگمات گلبدن پر اس لیے رشک کرتیں کہ قلندر حسین خاں نے نواب صاحب کا دل موہ لیا ہے۔ نواب صاحب چوں کہ ہر کام نواب قلندر حسین خاں کے مشورے سے کرتے تھے اس لیے گلبدن بیگم کی اہمیت دیوڑھی بھر کے لیے مسلم تھی۔ سرکنیں سوچتی کہ قلندر نواب کے ذریعہ گلبدن بیگم جو چاہے نواب صاحب سے کروا لیتی ہیں۔ ان کی پانچوں انگلیاں تو گئی ہیں ہی — دیوڑھی کی ایک ایک چیز قلندریاں کے ہاتھوں اونے پونے ہو رہی ہے لیکن گلبدن بیگم برابر کی حصہ دار ہو کر رہی ہوئے ہیں کرتی ہیں سمجھتی ہیں کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملک میں جھپکانے کی طاقت بھی وہ سب سے چھین لیں گی جن آنکھوں نے دیوڑھی کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے، سر درگرم دیکھا ہے وہ رات کے اندھیروں کو دوڑتے ہوئے بادلوں کا سا کیس طرح سمجھ سکتی ہیں۔ وہ نکھرے ہوئے دن کے ابلے کو لہراتی ہوئی بجلی کی چکاچوند کس طرح مان سکتی ہیں۔ لیکن گلبدن بیگم ہیں کہ آئینل بھپلا کر اشکوں کی پونجی اس احتیاط سے جمع کر رہی ہیں کہ جیسے پلوں میں باندھے ہوئے انھیں موتیوں کے سہارے مستقبل کے دن کاٹ لیں گی۔ جیسے انھیں قلندر نواب سے واسطہ ہے نہ نواب صاحب سے — گلبدن بیگم یہ سب کچھ سن کر کڑھتیں۔ اس لیے کہ جس طرح بات چلتی تھی حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ سچ ہے کہ نواب صاحب دیوڑھی کی ہر وہ چیز بیچ رہے تھے جس سے ان کے اجداد کی شان و شوکت وابستہ تھی، نام و ناموس وابستہ تھا، عزت و توقیر وابستہ تھی لیکن اس میں گلبدن بیگم کا کیا درد تھا وہ تو صرف

اتنا جاننا تھیں کہ جب سے نواب صاحب بمبئی کی ایک ٹری جبری اسٹمر الر کی کو اٹھا لائے تھے اس دن ان کے اپنے ہاتھوں میں بجتی ہوئی سہاگ کی چڑیاں جامد ہو کر اپنا نغمہ بھول گئی تھیں۔ اپنی اس چہیتی چھوٹی بیگم کے لیے جب سے نواب صاحب نے دیوڑھی کے قریب ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان لے رکھا تھا اس دن سے دیوڑھی ویران ہو گئی تھی اور ان ویرانیوں نے آہستہ آہستہ سمٹ کر، سکڑ کر ان کے اپنے دل میں پناہ لے لی تھی۔ اور اب یہ ویرانیاں جو دیوڑھی سمیر پر سلطنتیں گلبدن بیگم کے سینے میں گھٹ گئیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ دیوڑھی بھر کے مشنہ کہ غم کے سوا بھی کوئی غم ایسا ہے جو ان کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ بھی دن تھے جب نواب صاحب کے التفات سے ان کی زندگی بھی چین در چین تھی۔ پھر اس چین میں ایک ننھا سا پودا اُگ آیا۔ گلبدن بیگم نے خون دل سے اس پودے کو سنبھا، جب یہ تناور درخت بن گیا تو وہ اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے باقی دن گزارنے کے لیے اس کے نیچے آ بیٹھیں۔ لیکن نواب صاحب کے چھوتے ہی چھوٹی سوئی کے پودے کی طرح اس درخت کے سارے پتے جیسے مرجھا گئے۔ ٹھنڈے سارے گرم دھوپ کی تازگی سے جیسے کھیل گئے اور اب گلبدن بیگم چلچلاتی دھوپ میں کھڑی ہانپ رہی تھیں۔ اور یہی غم گلبدن بیگم کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ وہ اپنے دکھ درد کا مقابلہ دوسری بیگمات کے رنج و غم سے کرتی تو انہیں خود پیریزس آنے لگتا۔ فستے پانوں کے تو اولاد ہی دستی، وہ اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح کاٹ رہی تھیں۔ سراج خانم سے نواب صاحب نے آنکھیں پھیر لیں تو سکندر حسین خاں نے کسی قیمت پر باپ کو معاف نہیں کیا۔ نواب صاحب نے ڈرایا دکھایا لیکن آخر کو

انہیں اپنی لاج رکھنی پڑی۔ آج ماں بیٹے ناں جو رہیں کھا کر رہی سہی ہنسی خوشی سے تو سہرہ کر لیتے ہیں اور پھر دیوڑھی بھر میں قدر و منزلت معراج خانم ہی کی ہے۔ کیا مجال جو گھر کے نوکر چاکر ان سے کوئی گستاخی کریں اور یہاں یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو کبھی ان کے اشارے پر دیوانہ وار ناپتے تھے آج سیدھے منہ بات نہ کہ نہیں کرتے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ معراج خانم کو بھی پیا نہیں چاہتے لیکن ان کی عزت تو دیوڑھی میں نیلام نہیں ہوتی۔ اللہ رکھے جان جو ان بیٹا ہے، دکھ درد کی خبر تو رکھتا ہے۔ ماں پر بات آتی ہے تو سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ لیکن قلندر حسین خاں کی ماں بھی جیسے نواب صاحب ہی تھے اور باپ تو نواب صاحب تھے ہی۔

گلبدن سلیم سے نواب صاحب نے سہاگن چھین لیا تو قلندر حسین خاں نے پیری کا عصا چھین لیا۔ اور کبھی کبھی گلبدن سلیم سوچتیں کہ کہیں مرحوم سسر نواز علی کی بددعاؤں نے یہ دونوں نعمتیں تو ان سے نہیں چھین لیں۔ اور یہی سب باتیں سوچ سوچ کر ان کا جی کڑھتا رہتا۔ وہ اپنا دکھ درد کس سے کہہ سکتی تھیں۔ ہونٹوں کی مستی مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھنا کے تو زمانہ ہوا نواب صاحب نے چھین لیے تھے لیکن پیٹ کی اولاد نے ماں کی مانتا کو ماں کے سینے ہی میں دفن کر دیا، اور اب گلبدن سلیم مانتا کا مزار سینے میں چھپائے دو دودن نواب قلندر حسین خاں کی صورت کو ترستیں۔ اولاد کا یہ دکھ تو وصف ان ہی کا حصہ تھا۔ اس دکھ میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ ہونٹوں کی مستی، مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھنا کوں کی دولت سے تو نواب صاحب نے دیوڑھی میں سسکیاں لیتی ہوئی حوا کی سب ہی بیٹیوں کو کب کا محروم کر دیا تھا۔ نواب صاحب کی دین تھی نواب صاحب نے ہی سب سے چھین لی۔ اللہ دیاں زندگی

اُٹھی پر چھایاں
 بخشا ہے تو زندگی چھین لینے کا حق بھی اس نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ نواب صاحب
 اپنی بیویوں کے خدائے مجازی تھے ہنسیاں بخشے تھے تو ہنسیاں چھین بھی لیتے تھے۔ یہ کوئی ایسا
 جرم تو تھا نہیں۔ غرضیوں سے کھیل لیتے تھے زندگیوں سے تو نہیں کھیلتے تھے۔ قانون نے
 خدا کو زندگیاں چھین لینے کا حق دے رکھا تھا۔ دینا کے کسی کورٹ میں اس پر مقدمہ نہیں
 چلایا جاسکتا تھا قانون نے اسی طرح نواب صاحب کو خوشیاں چھین لینے کا اذیتکار
 دے رکھا تھا، دینا کے کسی کورٹ میں ان پر بھی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ اور اس
 راز کو حویلی کی چار دیواری میں سمجھتی ہوئی تشنہ اور بیمار روصیں اچھی طرح
 جانتی تھیں۔ لیکن بات یہ تھی کہ نواب صاحب نے پھر بھی اپنا فرض ادا کر دیا
 تھا، یعنی خوشیاں دے کر خوشیاں چھین لی تھیں۔ لیکن اللہ میاں تو زندگی دے
 کر بس سچول بیٹھے تھے۔ انھیں اپنا فرض یاد آنے تک سانسوں کی آمد و شد
 کو زندگی سمجھنا ہر ایک کے لیے ضروری تھا۔

گلبدن بیگم سوختیں عجیب کا روبرو ہیں سانچے بادشاہ کے، عجیب مصلحتیں ہیں۔
 سب کچھ دیکھنے والا سب کچھ سننے والا ہم بندوں سے اس طرح نظریں پھیرے ہوئے
 ہے جیسے ہماری بربادیوں پر ہم نہیں تو وہ خود قانع ہے۔ اگر اللہ میاں عورت رہتے
 اور نواب صاحب سے۔ استغفر اللہ۔ یکا یک یہ خیال گلبدن بیگم کے ذہن میں برقی و
 دوڑا کر گذر گیا۔ وہ دیر تک دل ہی دل میں تو بہ کرتی رہیں پھر گر گر کر اگر التجائیں
 کہیں کہ سچے بادشاہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے یا پھر اس دماغ سے سوچنے کی ساری قوتیں سلب
 کر لے جو تجھ سے بھی گستاخی کا ارتکاب کر بیٹھا ہے۔ پھر انھیں خود پر ترس آ گیا کہ نواب صاحب نے ان
 کا سہاگ چھینا پٹ کی اولاد چھینی اور اب خدا تک کو چھین لینے کے درپے ہیں۔ یہ کیسے صبح و شام
 ہیں۔ یہ کیسے شب و روز ہیں۔ یہی زندگی ہے کہ یہاں سب کچھ نواب صاحب کا ہے۔ اور
 وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بے بسی پر رونے لگیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ اڑ دیوں کے

صدریاں سرفراز علی ان کے سینے پر سر رکھ کر ان کی دھڑکنیں کو گن رہے ہیں۔

”چھوٹی بیگم بچہ ہی گئیں آج — سنا بی بی کچھ یہ“

گلبدن بیگم اس طرح چوکیں جیسے وہ خود سرفراز علی کے ساتھ کھڑی گئی ہیں۔

پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے گلبدن بیگم نے نظریں اٹھائیں تو بوڑھی بوا

ساتھ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی — صوفے کا سہارا لے کر قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔

گلبدن بیگم نے ڈرتے ڈرتے بہت آہستہ پوچھا۔

”کس کے ساتھ بوا۔ اوکس نے پکڑا؟“

”قلندر نواب کے ساتھ بیگم۔ بڑے سرکار نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”ہائیں۔“

گلبدن بیگم کے دل کو اپنی مٹھی کی مضبوط گرفت میں لے کر جیسے سرفراز علی نے

سارا خون پھوڑ لیا۔ وہ کھٹی کھٹی آنکھوں سے غلامیں گھورنے لگیں اور ان کے ذہن نے

جلنے کیوں اس طرح سوچا کہ نواب صاحب ڈیوڑھی کے گرے ہوئے حصے کا وہ طلبہ ہیں

جس کے بڑے سے ڈھکے پیچھے چھپ چھپ کر قلندر میاں چھوٹی بیگم سے ملنے کے لیے

جایا کرتے تھے جو سولہ سال کی سی لیکن پھر بھی ان کی ماں تھیں۔



آج اس نے پھر پی رکھی تھی

اپنے ساتھی کے کاروبار کے گھاٹے سے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دماغ
 بوجھل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے مضبوط کوڑا مقل تھے۔ وہ مقفل کوڑوں کے سامنے کھڑا
 اپنی بڑبسی پر مسکرا رہا تھا۔ جب ہوٹل میں نیا کھلا تھا تو کوئٹہ پر بیٹھ کر بیروں کو بلانے
 کے لیے بل بجاتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ اب اس کی زندگی ان ویرانیوں اور
 سناٹوں سے بہت دور نکل آئی ہے جو اس کی روح اور دل پر حکمران تھے۔ چھتے
 ہوئے ریڈیو اور سامع خراش گھنٹی کی ٹرنگ ٹرنگ میں اس کو اپنے مستقبل کی
 چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ اس کو یوں نظر آتا تھا کہ اس کے بچوں اور بیوی کی آواز
 بھی ریڈیو اور گھنٹی کے شور میں گھل مل گئی ہیں۔ جب ہوٹل کا یہ ریڈیو خاموش
 ہو جائے گا، یہ گھنٹی نہ بجے گی تو اس کے ہنستے کھیلنے بچوں کے دیکتے ہوئے چہروں پر
 مردنی چھا جائے گی۔ اس کی بیوی کے سرخ گال جن پر زلفیں بکھر کر وہ لکڑی ابر میں
 چپے ہوئے زہرہ و مشتری سے تشبیہ دیتا ہے راکو میں دبے ہوئے انگاروں کی طرح

وہ اسی قسم کی بہت سی باتیں سوچتا رہا اور بھاگ کر اس نے ایک اسکپاچ
حسینہ کا دامن منہام لیا۔ جس نے اس کے ذہن کو سکون بخشا اس کے قلب و روح
کو مسحور کیا، رجھایا اور اپنا لیا۔

”جان ہیگ دنیا کی سب سے خوبصورت شے کا نام ہے۔“
”تم بدھو ہو۔ بکو اس مت کرو یا رٹھنگو۔ یہ فراریت و راریت نہیں ہے یہ
اصطلاحیں تم بزدلوں نے وضع کر رکھی ہیں۔“

”جان ہیگ دنیا کی عظیم ساحرہ ہے۔ تم میں اس کی بارگاہ تک پہنچنے کی جرات نہیں
ہے تو پھر تم اس کے پیچھے تباہ کیا ہو سکتے ہو۔“

”تم کافی ہاوس کے اٹلچکول ہو۔ کافی پیو۔ گرم کافی سرد کافی لیکن کبھی کبھی
جان ہیگ کا دامن منہام کر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”یورفل میں صوبوں سے بھاگ کر شراب میں پناہ لینے کو جرم سمجھتا ہوں۔ یہ
خودکشی کے مترادف ہے، اور خودکشی پاگلوں کا شیوہ ہے۔“

”اور جان ہیگ آدمی کو پاگل ہونے سے بچاتی ہے۔“

”اچھا اب چل دیئے مانی ڈیر ٹھنگو۔ گڈ بائی، کل ملیں گے۔“

رکشاشیں بیٹھے وقت اس کے پیر لڑکھارے تھے۔ اس نے آج بہت پی رکھی
تھی اس کے سامنے چھٹی ہوئی ٹر پکشا والا چل پڑا تو وہ سوچنے لگا کہ یہ ٹر کس جس کے
سینے کو میں نے بار بار روندنا ہے اور جو میکے پیروں کی گرمی سے مانوس ہے۔ شاید
میرا گذر نہ ہوئے پھر راہ گیر سے پوچھے — لیکن نہیں اس نے تو اپنے سینے میں بے شمار

آدمی اور آدمی

اجلی پر چھائیاں

یادیں دفن کر رکھی ہیں۔ کوئی آتا ہے تو مسلسل آتا ہے اور نہیں آتا تو کبھی نہیں آتا۔

لیکن یہ سڑک بالکل خاموش ہے۔ صدیوں سے اسی طرح چپ چاپ راہ گروں کے پیروں میں بچھی ہوئی ہے جیسے اس کو نہ کسی کے آنے کی خوشی ہے اور نہ کسی کے جانے کا غم۔

بالکل ہندوستانی عورت کی طرح۔

جانے اس کو سڑک کے ساتھ ہندوستانی عورت کا خیال کیوں آیا، اور پھر اس کی نظروں کے آگے اس کی بیوی کا چہرہ جم کر رہ گیا۔ یہ مہل خیال ہندوستانی عورت کی توہین ہے۔

لیکن جیسے اس کی بیوی نے آہستہ سے اس سے کہا کہ تم پھر حقائق سے گہرا رہو، تم نے عورت کی کوئی ایسی توہین تو نہیں کی — کیا میں ایک ایسی سڑک نہیں ہوں جس کے سینے کو تمہارے ماں باپ اور تم مسلسل روند رہے ہو — اور میں خاموش تماشا بنی بنی دیکھ رہی ہوں۔

اس نے سر کو جھٹکا دے کر رکشا کے اترے ہوئے باپ پر سر ٹپک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اب کچھ بھی نہ سوچے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے تینوں بچے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے خیالات کی درآ میں ذہن کا مہنس آنکھوں کا حصہ تھا، اور اب پیوٹے سدا رہا بن جائیں گے۔ گھر پہنچ کر رکشا والے نے اسے جگایا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے سوچ دیا یا تو اس کی آنکھیں چند عیا گئیں اور وہ میز پر اپنی عینک تلاش کرنے لگا جو پہلے ہی سے اس کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے سامنے لٹکتا ہوا بلب نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی نظر آ رہا تھا تو

مُضداد دھندلا، کبھی بہت روشن روشن اور کبھی بلب کے اوپر ایک بلب اور سوار ہو گیا تھا۔ ایک بلب آہستہ آہستہ چھت سے زمین کی طرف ٹیڑھ رہا تھا اور وہ زمین سے چھت کی طرف اوپر ہی اوپر اٹھ رہا تھا یا شاید کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ فرش ہی پر اپنے پیر جمائے رکھنا چاہتا ہے لیکن زمین خود نیچے ہی نیچے کہیں جا رہی ہے اس کیفیت کو شاید اس نے ایک ثانیہ کے لیے محسوس کیا اور آنکھیں مل کر ہوشیار ہو جانے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن آنکھوں اور ہاتھوں کے درمیان کوئی چیز اسے مزاحمت کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے عینک اتار کر میز پر پھینک دی اور یہ سمجھ کر کہ عینک اس نے اتاری نہیں ہے بلکہ لگائی ہے صوفیہ پردہ راز ہو کر جگمگاتے بلب کو گھورنے لگا۔

اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ صف گستاخ ہی نہیں بلکہ کمینہ اور سفلہ بھی ہے۔ اس کا باپ بہت متمول تھا۔ زمینات کے علاوہ بڑے بڑے کئی مکانات اور نقدی کا مالک۔ اتنی بڑی جائیداد رکھنے والے باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ خود کو بھی کم از کم تنکا بھوکا تو نہ سمجھ سکتا تھا۔ لیکن بہت جلد اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنا کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو زندگی میں کئی بار اپنی مفلسی اور نکبت کا شدید احساس ہوا، اور آج یہ احساس شدید تر ہو گیا تھا کیوں کہ ہوٹل دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل کے مالک نے اس کو میزبانی کی اہم خدمت سے علیحدہ کر دیا تھا اور آج سے پھر اس کی زندگی اس کے باپ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے خاندان کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بہت ضدی ہے اور اسی ضد کی وجہ سے وہ زندگی کی بہت ساری نعمتوں سے سب کچھ رکھ کر بھی محروم ہو گیا ہے

اُعلیٰ پر چھائیاں
آدمی اور آدمی
لیکن وہ اپنی ضد کو اصول پرستی سمجھتا، اور اس کا باپ اس کی اصول پرستی کو
اس کی کمینگی سمجھا کرتا۔

جب تک وہ چھوٹا تھا اس کو زندگی کی ساری مسرتیں حاصل تھیں۔ ایرگن
لے کر چڑیاؤں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ بڑھتا رہا۔ پھر ٹولیوں پر لے کر خرگوشوں کے
پیچھے بھاگنے لگا۔ میس بھیگس تو وہ غزالوں کا دیوانہ بنا ہوا جنگلوں میں پھرتا رہا۔
لیکن جب اس کے باپ کو پیش مل گئی اور انھوں نے ضلعوں کی زندگی ترک کر کے
شہر میں مستقل سکونت اختیار کی تو ان دنوں وہ خود ایک غزال چشم حسینہ کے تیر نظر کا
شکار ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ سے اس کے اختلافات کا آغاز اسی
واقعہ سے ہوا۔ وہ پٹھان قوم ہی کی ایک شریف اہل خانہ لڑکی تھی۔ لیکن اس کے باپ کا
کہنا تھا کہ ”وٹ پاتھ پر ہاتھ پھیلانے والے بہت سارے فقیر بھی شریف اہل خانہ
ہوتے ہیں۔ برقع پہن کر گھر گھر اپنا دکھ درد بیان کرتی پھرنے والی عورتیں بھی خاندان
کی شریف ہو سکتی ہیں۔ نواب حکیم الملک کے بیٹے کا پوتا جس نے سیس اور شراب میں اپنی
ساری پونجی لٹا دی ہے اور تریجھ گلے میں ڈال کر درگاہ کا مجاور بن بیٹھا ہے وہ بھی
شریف زادہ ہے لیکن ان سب سے زیادہ ”شریف الاشراف“ ہے تو وہ رویہ ہے جو
ہر شخص کی کمینگی پر پردہ ڈالنے کی قوت رکھتا ہے۔ کسی کی بُرائی کی پردہ پوشی کرنا عین شرافت
ہے اور اس شرافت کا اگر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ رویہ ہے۔ تم جس لڑکی کے چکر میں
ہو، اس کے گھر اس شریف ترین شے کا گدڑی نہیں۔ جوانی کے جوش میں تم اندھے
ہو گئے ہو۔ میں جہاں دیدہ ہوں، اور پھر ذرا سن رکھنا صاحبزادے میں پٹھان ہوں۔

اصلی پرچیاں آدمی اور آدمی

تم میرا نطفہ ہو کر مجھ سے اکڑ فوں نہیں کر سکتے کہ چکا ہوں اور مگر کہوں گا کہ تمہاری بیلی گھر میں بہو بن کر نہیں آ سکتی۔ کبھی نہیں آ سکتی۔ عشق کیے جاؤ اور تڑپ تڑپ کر مجنون کا نام روشن کرو۔“

وہ بھی تو آخر ٹھکان باپ کا ٹھکان بیٹا ہی تھا۔ وہ وہ مجنوں کا نام روشن کیا ہے کہ باپ کا نام بھڑک کر سمجھ جانے ہی کو رہ گیا تھا، اور یہ سب اس نے کافی سوچ سمجھ کر کیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اپنے ٹھکان باپ کے سامنے ٹھکان بن کر ڈٹ جانے سے ہی بات بن سکتی ہے۔ بات منوانے کے لیے ان کو یہ دکھانا ضروری تھا کہ جو مور ز عتاب ہے، جو راندہ درگاہ ہے وہ بھی ان ہی کا بیٹا ہے جس کی شیرانو میں بدستی یا خوش قسمتی سے انھیں کا خون دوڑ رہا ہے۔

اس کی اس باغیانہ روش نے آخرش اس کے باپ کو مصالحت پر مجبور کر دیا۔ وہ راتوں کو گھسے غائب رہنے لگا۔ کبھی کبھی حالت نشہ میں وہ گھر لوٹتا تو نشہ اتنا نہ رہتا جتنا وہ ظاہر کرتا۔ بلند آواز میں جیسے کسی کو مخاطب کر کے کہتا ”میں نے ایسا کوئی بہت بُرا قصور نہیں کیا ہے۔ میری کینگی بہت ادنیٰ درجے کی ہے اور میرے باپ کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ میری بڑی سے بڑی کینگی کی بھی پردہ پوشی کر سکتا ہے۔ ادھر بیٹا جرم نہیں ہے اور میں کونسی ہزاروں کی رقم کا تمہارا مقروض ہوں۔ تم فکر نہ کرنا میں تمہاری ساری رقم لوٹا دوں گا، لیکن کہے دیتا ہوں کہ سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے میرے گھر نہ آنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جاؤ اسی وقت چلے جاؤ۔ میرا غصہ بہت بُرا ہے۔ میں ٹھکان باپ کا ٹھکان بیٹا ہوں سمجھے۔“

اس کی ماں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اپنے کسر کے کوڑوں کو زور سے بند

کر لینے کے بعد اس کو علانیہ سنائی دیتا کہ اس کے ماں باپ میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں، اس کی ماں بڑی بجا جت سے اس کے باپ کو سمجھاتی ”کیوں تنہا کر رہے ہو اس کو آج شراب کو منہ لگایا ہے، کل بازاری عورتوں کا منہ چاٹا سچے سچے مصطوت اسی میں ہے کہ پیر میں بڑی ڈال دی جائے۔ کشتی ہو جائے گا تو میرے سبغاں بس کا روگ نہ رہے گا۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بھی تمہارا ہی بیٹا ہے۔ اپنا کیا اس طرح بھی بھوتا ہے کوئی؟ یاد ہے اس بے شرم فرنگی کے پیچھے پڑے تھے تو ہزاروں روپے بھونک دیئے تھے اس پر سبھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ چند دن گود گرم کر کے اس نے بہت کچھ بٹور لیا اور ایک ٹافی کے ساتھ بھاگ گئی۔ جاتے وقت کجخت نے تمہیں عمر بھر کا روگ لگا دیا۔ اور پھر ان دنوں اسلم میری گود میں ہمکتا تھا۔ گھر میں سب کچھ رکھ کر تم بازار کے ہو رہے تھے۔ مجھے سلگتے ہوئے کوٹلوں پر کروٹیں لینے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور پھر کیا میں یہ بھول جاؤں گی کہ اس بے سوا کو کشمیر کی سیر کو لے جاتے وقت تم نے میرا منہ اس چہرہ نہ دیکھا تھا تو نہ دیکھتے لیکن اسلم بھی تو نہ یاد آیا تھا۔ آج وہ اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی پر ریکھ گیا ہے تو جائز طور پر اپنی بیوی بنا کر گھر لانا بھی تو چاہتا ہے۔ لیکن تمہیں یہ شرافت کیوں پسند آئے گی۔ تمہیں سیدھا راستہ بھایا ہے کبھی۔ کانٹے بھی ہوئی پگنڈی پر چلو گے اور وہ بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرح جیسے نخل پر چل رہے ہو۔“

اسلم خاں کا نشانہ تیر بہدف تھا۔ ماں نے سرگوشیاں بہت دھیمے سروں میں شروع کی تھیں لیکن بات ختم ہوتے ہوتے سر جا کر لمبی تانوں کی حسروں کو چھو رہے تھے اور اس کا باپ بھیگی تلی بنا جیسے کھمبانوچ رہا تھا۔ لیکن یکایک شاید اس کے ذہن کو کسی نے بجلی کے تاروں سے شاک پہنچا دیا۔ وہ ایک دم برجم ہو گیا۔ یہ اس کی

ہمیشہ ہی کی عادت تھی۔ بات کرتے کرتے کوئی معمولی سی بات بھی اس کو ناگوار خاطر ہوتی تو وہ ایک دم اس طرح غصے میں آتا کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ وہی شخص ہے جو آپ سے ایک ثانیہ قبل مسکراتا ہوا باتوں میں مصروف تھا یا پہلے ہی سے فقے کے نہریلے اثرات اس کے بدن میں سرایت کر رہے تھے اور جب یہ زہر نس نس میں پھیل گیا ہے تو اس کے چہرے سے رس کر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک جھپکنے تک ہو جاتا آپ سوچتے ہی رہ جاتے کہ آپ نے تو کوئی ایسی دل شکنی کی بات نہیں کی تھی۔

آپ کو مختصر ایک واقعہ ہی کیوں نہ سنا دوں۔ ایک بارجب کہ اسلم خاں اور اس کے بیوی بچے معتوب ہو گئے تھے اور ماہانہ صنف پچاس روپے گزربہر کے لیے مقرر کر کے ان کو علیحدہ کر دیا گیا تھا تو ایک دن ایک رشتہ دار نے اسلم خاں کی سعی سفارش کی اور اس کے بال بچوں کی زبوں حالی کا نقشہ اس کے باپ کے سامنے رکھا ایک ہی لمحہ میں ساری فضا مکر ہو گئی۔ خاں صاحب بالکل بچھے ہوئے شیر کی طرح گر جئے لگے۔ قربانی اور صدقے کے فضائل کی ایک موٹی سی کتاب اٹھلائے اور فرمایا کہ ”صاحب سنان ابن صفیان ابن خلکان شرقی الغریب الافاقی نے صرف ساڑھے تین آنے میں ایک سال گزربہر کی تنہی۔ نیتیں اور اعمال نیک ہوں تو اللہ برکت دینے میں دریغ نہیں کرتا لیکن لوٹنا تو مرتد و ملحد ہے۔ صاحبزادے کو اللہ کے وجود ہی سے انکار ہے ایسے میں پچاس تو کیا پانچ سو میں بھی برکت نہیں ہو سکتی۔ آپ کو ترس آتا ہے تو کیجئے کافروں کی سرسپتی۔ میں تو مسلمان پیدا ہوا ہوں مسلمان مروں گا“ بات کفر و اسلام تک جا پہنچی تھی مولانا اپنا سامنے لے کر واپس لوٹ گئے۔

آج بھی خام صلوٰۃ سناقتی رہیں تو خاں صاحب بہت دیر تک خاموش

اُجلی پرچھائیاں آدمی اور آدمی

رہے لیکن خانم کے طنز کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ گرج کر کہنے لگے ”ہاں ہاں دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہوں۔ برابر جھونکتا ہوں، ہمیشہ جھونکتا رہوں گا۔ لیکن جو کچھ کرتا ہوں باپ دادا کے برتے پر تو نہیں کرتا۔ خود کیا ہے۔ محنت مشقت کر کے۔“ خانم سچی تو آخر چٹھان تھیں، شیرنی جب اپنے بچوں کی سلامتی کے لیے سچرتی ہے تو کہتے ہیں کہ جنگل پر حکومت کرنے والے شیر صاحب بھی دم لانے لگتے ہیں۔ بیگم غرائیں ”اے چھوڑو بھی تمھارے باپ دادا نے چھوڑا ہی کیا تھا جو تم اتراتے ہو وہ تو میرے باپ نے داماد بنا کر احسان کیا تم پر۔ اتنی بُری خدمت دلائی اور رہے بھی ایسے محکمے میں کہ آج لکھتی بنے بیٹھے ہو۔ یہ سب کچھ تمھارے اجداد کی میراث ہے نا جس پر تم اکر رہے ہو۔“

بات بالکل راست ہو گئی تو خاں صاحب نے محسوس کیا کہ اس برہمی کے پیچھے بہت سی صداقتیں بھی ہیں۔ خانم بے وجہ بُرا نہ لکھتیں تو وہ بھلا کیوں خاموش ہوتے۔ ذرا سا آواز کو دھیمّا کر کے وہ خانم سے کچھ مصالحت کرنے والے ہی تھے کہ اسلم خاں کے کمرے سے گلاس ٹوٹنے کے چھناکے نے انھیں اپنی طفس متوجہ کر لیا۔

اسلم خاں سمجھتا تھا کہ اس وقت جب کہ آتش و باروت کی گرم فضا مصالحت کی ہوا کے خاک جھونکوں کی زد میں آ رہی ہے اس کو ایک ہائیڈروجن بم استعمال کرنا چاہیے جس سے دل و دماغ کو بچر ایک جھٹکا لگے اور سارا ماحول مکدر ہو جائے، جل اٹھے اور اس نے گلاس فرش پر دے مارا اور دیو داس کا سہیگل بن کر انتہائے غم میں تہقے لگانے کا پارٹ ادا کرنے لگا۔

ٹوٹے ہوئے گلاس کا چھناکا اور قہقہے کی گونج اس کی ماں کے دماغ پر شل بن کر گری اور کہنے شرابی نے اپنے کان کو اڑوں سے لگا دیئے تو اس کی

ماں کہہ رہی تھی مے لوجی بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب صاحبزادے گھر میں لا کر پینے لگے ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہو وہ خود کو تباہ کرتا رہے گا اور میں بیٹھی دیکھتی رہوں گی۔ قسمت کیا کیا دکھاتی ہے لیکن قسمت پر الزام کیوں دعوں تم بہت پیسے والے ہو نا اس لیے میرا اور میری اولاد کا مقدر بن بیٹھے ہو۔“

خاں صاحب خانم اور اولاد کے مقدر تو تھے ہی۔ صوفے پر پڑے پڑے رات گئے دیر تک ملکہیں جھپکاتے رہے وظیفہ پڑھنے کے لیے بھی آج وہ کمرے میں دیر تک بند رہے تھے۔ خاں صاحب اسی کمرے میں پورے سکون کے ساتھ اپنے کاروبار کا حساب کتاب کرتے تھے۔ وظیفہ پڑھتے تھے۔ ایسے مواقع پر سوائے خانم کے کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی خاں صاحب کی پسندیدہ چچو کرتی تیزن اس کمرے میں رہے پاؤں داخل ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ وہ عام ملازموں کی طرح گندہ نہیں رہتی تھی۔ خانم اور خاں صاحب کی منہ چڑھی تھی۔ لیکن ایسے مواقع شاذ آتے اور ایسا عموماً اس وقت ہوتا جب خانم گھر پر نہ رہتیں۔ آج خاں صاحب اسی کمرے میں بند دیر تک اپنے کاروبار میں لگے رہے جب فارغ ہوئے تو کمرے کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں نکل آئے۔ خانم دلال میں تخت پر لیٹی ہوئی انھیں ٹکلی باندھے دیکھتی رہیں۔ خاں صاحب پام کے درخت کی طرف پڑے تو خانم نے انھیں اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیا اور گوری چڑی والی فرنگ کو بددعائیں دینے لگیں تاکہ ان کی برہمی سے خاں صاحب واقف ہو جائیں۔ لیکن خاں صاحب پام کے درختوں کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ پام کے چوڑے پھلے، چکے اور نرم پتے پر اپنا ہاتھ کچھ دیر اس طرح پھینکتے رہے جیسے کسی کے گالوں کو سہلا رہے ہیں۔ پھر جانے انھیں کیا

سو جی جھٹکا مار کر ایک پتا توڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں میں پام کے پتے کو کھلے ہوئے اخبار کی طرح تھامے ہوئے گھورتے رہے۔ خانم نے منہ پھیر کر یہ سب دیکھا تو ان کے سینے میں انکارے دھکنے لگے۔ کہنے لگیں ”کسی یار کے ساتھ لندن میں مزے کر رہی ہو گی وہ تو — تمہیں پام کے درختوں سے لپٹ کر رونے کے لیے چھوڑ گئی ہے۔ رنڈی نے پودے بھجوائے تھے تو میرے گھر کی زمین میں اس کی جڑیں کیوں پیوست کر دیں — ایک پتے سے کیا ہو گا۔ سارا درخت اکھاڑ کر اپنے سینے میں لگا لو۔ دل دھجکا خون پی پی کر یہ پودے غروب چلیں گے پھولیں گے“ خاں صاحب چونکے اور خواب گاہ کا راستہ لینے کی بجائے لمبے لمبے دگ بھٹے پھر اسی نحر والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ رات صوفے پر پڑے پڑے گذاری خانم نے بھی پوچھ چک نہ کی۔

صبح ناشتے پر خاں صاحب نے خانم سے سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا ”دیکھو جب اسلم خاں کی خواہش اور تمہاری مرضی ہے تو لا لونڈیا کو تھک کر کے میرے خواب ادھورے ہیں تو ادھورے ہی ہیں لیکن خانم تم سمجھنا وگی اس رشتے سے — شادی کے سٹھا تو مہلا کیا ہو سکیں گے بس چپکے سے نکاح کے دوپول پڑھوا کر اٹھا لو۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے تو مجھے غم نہ ہو گا۔ کہہ دوں گا کہ صاحبزادے مرے جارہے تھے لونڈیا پر۔“ خانم نے جب دیکھا کہ خاں صاحب پوری ذمہ داری ان کو سونپ کر خود بری الذمہ

ہو رہے ہیں تو وہ پھر غرائیں ”مجھے کچھ غوشی نہیں ہے کہ فیقر کی گذری میں لعل تلاش کرنی پھروں۔ میں نے کب ان کی چو کوٹ پر پیشانی رگڑی ہے کہ وہ اپنی چاندی ٹیٹی کو میری بہو بنا دیں۔ مجھے تو خیال ہے بس ہمتاری اولاد کا۔ سر پھرا تو ہے ہی۔ زندگی برباد کرتا ہے گاہ، اور پھر آج کل وہ یوں بھی راستہ سمجھ گیا ہے۔ ادٹ پٹاگ کبنا

ہے۔ معلوم نہیں کونسی کونسی انگریزی کتاب میں پڑھتا ہے۔ نئے نئے جلسوں اور جلسوں میں شامل رہتا ہے اور گھر آکر مجھے بات بات پر ٹوکتا ہے۔ گولی نے پانی ملا ہوا دودھ دیا، میں نے گولی کو ڈانٹا، اور صاحبزادے بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگا امی تین دن ہوا اور خداداد خاں دونوں کے سامنے غریب نے دودھ دھویا ہے۔ چار چار آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ دودھ میں پانی کیسے ملا سکتا ہے مچھلا۔ آپ اس طرح برسہا برسہا ہیں جیسے آپ کے گھر کا زر خرید غلام ہی تو ہے۔ بے چارہ۔ میں نے کہا میاں تم چپ رہو، ابھی سچہ ہو۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ کافر پر کبھی سہرہ نہ کرنا۔ بس اتنی سی بات تھی میری جان پر ہی تو بن گئی۔ لگا مجھ سے جھٹس کرنے۔ کہنے لگا بد معاش مسلمانوں سے نیک منش کافر لاکھ درج بہتر ہیں۔ جنت پہلے تو ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو اللہ یا رھاں جیسے ڈاکو دوزخ میں جلیں گے اور گولی سیدھا جنت میں چلا جائے گا، کیوں کہ وہ آپ کو سو فیصد خالص دودھ دیتا ہے اور اس کے باوجود آپ کی بری سبلی سر جھکا کر سن لیتا ہے کیوں کہ وہ بھی تلخ جواب دے گا تو آپ کا دل دکھے گا، اور وہ دل دکھانا نہیں چاہتا۔ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی آدمی کو سمجھے اور آدمی آدمی کی عزت کرے۔“

”سچے دل خداداد خاں مچھلی بارہ لے پوند نہیں چودہ آنے پوند لایا۔ میں نے ذرا جھڑا۔ وہ مسکرا کر منہ لگنے لگا تو میں نے غصہ میں اس کو حرامزادے اور ذلیل کہا بس اتنی سی بات پر صاحبزادے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ خداداد خاں کو پچھکار کر باہر بھجوا دیا اور لگے مجھ سے جھٹ کرنے کہ امی آپ نے اُسے گالیاں کیوں دیں۔ میں نے جو خود اس پر گالیاں کی بوجھار کی ہے تو مجھ سے لپٹ گیا اور کہنے لگا کہ اچھے

اجلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

آدمی گالی گلوچ نہیں کرتے امی۔ میں نے سمجھایا کہ میاں جتنی ذات ہوتی ہی بات کرنی چاہیے۔ تمھاری نانی اماں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اچھے بھلے ملازم کو نہ صرف ماں بہن کی سناتیں بلکہ زیادہ برہم ہو جاتیں تو آنکھوں میں مہرچ لگوادیتیں یا بید کی چھڑیاں پانی میں جھگو کر شڑاپ شڑاپ چوٹروں پر رسید کروادیتیں۔ سارے نوکر آواز نہ ہی سے کانپ کانپ جاتے تھے۔ مگر کا انتظام ذرا عیب ہی سے چلتا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یہ سن کر مجھ سے اتنی گستاخی پر اترا اے گا۔ کہنے لگا نانی اماں اب ہوتیں تو ان کی آواز سے کانپنے والے نوکر مہرچ انھیں کی آنکھوں میں جھونک دیتے۔ بھیگی ہوئی بید کی چھڑیاں ان کے ہاتھ سے حصین کر توڑ دی جاتیں یا کیا عجب انھیں پر برس پڑتیں۔ یہ سراسر ظلم ہے امی۔ اور اب کسی کا ظلم کسی پر روانہ رہے گا۔ آج خداداد خاں تمھاری گالیوں کو سہہ لیتا ہے۔ کل خداداد خاں کے بچے میرے بچوں کو گالیوں کا جواب گالیوں سے دیں گے اور میں اس دن کے انتظار میں ہوں۔“

لوجی چار دن کا لونڈا ہمارے اطوار سدھارنے چلا ہے۔ عقل ماری گئی ہے اور کچھ نہیں۔ اور اس خرابی کی جڑ وہی انگریزی کتابیں ہیں جو وہ پڑھتا رہتا ہے۔ میں تو کہوں گی ان انگریزوں نے ناس کر دیا ہے ہمارا۔ اس فرنگی رندی نے تمھیں تباہ کیا اور اب اس کی زبان تمھارے بیٹے کو تباہ کر رہی ہے۔“

خاں صاحب ساری باتیں غور سے سنتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ خانم سب کچھ کہیں تو وہ بھی اپنے صاحبزادے کے چال چلن پر کڑی تنقید کریں۔ کیوں کہ اب خانم ان کی ہم زبان تھیں۔ اس لیے انھیں کچھ خطرہ نہ تھا لیکن خلاف توقع جب خانم نے فرنگی کو رندی کہہ کر بات ختم کی تو خاں صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ گفتگو کا رخ پھیر دیں۔

آدمی اور آدمی اعلیٰ پر چھائیال

کہنے لگے خانم ایک آدھ لیمو توڑا فشر دہ بنا دینا۔ سارا بدن دکھ رہا ہے۔ طبیعت بُری مضحک ہے۔ خانم نے خاں صاحب کو گھور کر دیکھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ بات چہ فرنگی رندی تک پہنچنے کی نظر میں جھکا لیں۔

نکاح کے دو بول پڑھو اگر خانم لوٹ دیا کو اپنے گھر نہ لاسکیں۔ لڑکی والے غریب تھے تو کیا ہوا۔ انہیں بھی عزت و ناموس کا پاس تھا۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ وہ چٹ سنگنی پٹ بیاہ کرنے کے موقف میں نہیں ہیں۔ جب ان کے حالات اجازت دیں گے تب دیکھا جائے گا۔ خانم اور خاں صاحب نے تو لڑکی والوں کے اس انکار کو غیبی امداد سمجھا اور دل ہی دل میں اللہ بیاں کا شکر اذکیا۔ لیکن اسلم خاں فکر مند ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی والے اپنی عزت کا تابوت اٹھائے صدیاں گزار دیں گے اور ان کے حالات انہیں عمر بھر اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کو اسلم خاں کی دلہن بنا سکیں۔ وہ یہ سبھی جانتا تھا کہ خاں صاحب کسی قیمت پر دو طرفہ خرچ کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے کیوں کہ نہ تو انہیں یہ رشتہ ہی پسند تھا اور نہ ہی اس کے وہ راستے پسند تھے جن پر ان کی دانستہ میں وہ بھٹک رہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ اسلم خاں گستاخ اور کینہ ہو گیا ہے۔ ان کے پوزیشن اور رتھول نے جو عار بڑی محنت اور مشکل سے کھڑی کی ہے وہ اسلم خاں کے ہاتھوں اڑا ڈھم ہو کر ڈھسے جائے گی۔ اسی وجہ سے خاں صاحب چاہتے تھے کہ اسلم خاں کے پیروں میں فولاد کی نہیں بلکہ سونے کی زنجیر پہنا دی جائے۔ وہ جہاں دیدہ جو تھے۔ ان کو اپنے تجربات کی روشنی میں اسی کا علم تھا کہ سونے کی نرم ملائم اور چمکدار بیڑیوں کو توڑ کر پھینک دینا ہر نوجوان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسلم خاں بھی تو آخر خاں صاحب ہی کا بیٹا تھا۔ وہ ان کے ہر راؤ و پچ سے واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب جب کہ خاں صاحب نے

بادلِ نخواستہ ہی سہی لیکن اس رشتے کو منظور کر لیا ہے تو جھٹ پٹ سارے مسائل کا حل نکال ہی لینا چاہیے۔ ذرا چوک ہوئی اور خاں صاحب کو کہیں سے سونے کی بیڑیوں کی امید بندھی تو وہ اپنے ارا مانوں کا جنازہ اٹھائے پھرتا رہے گا۔

اس نے اپنے ایک رشتہ دار سے ساز باز کی، دلہن والوں کے پاس خاں صاحب کی جانب سے بہت ہی لجاجت اور انکساری سے کہلا بھیجا کہ ”شادی میں ہمیں عجلت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس نیک کام سے فراغت پا کر ہم دونوں میاں بیوی حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے غیاب میں اسلم میاں تنہا ہو جائیں گے اور پھر اتنے بڑے گھر بار کی دیکھ بھال بہو کے سوا کون کر سکتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کچھ دن توقف کر لینے میں بھی ہمیں تامل نہ ہوتا۔ آپ ہمیں اپنا سمجھیں۔ اللہ کا دیا جو کچھ ہے وہ بیٹے اور بہو ہی کا تو ہے شادی میں کرو فر اور ٹھاٹ باٹ کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں اور پھر زمانے کا تقاضا یہی ہے کہ فضول خرچی سے گریز کیا جائے۔ یہی پیسہ کل آپ کی بیٹی ہی کے کام آئے گا۔ ہم قبر میں دولت ساتھ لے جانے سے تو رہے۔ بس ہزار ڈیڑھ ہزار قرض آپ قبول کر لیجیے حالات جب بھی سازگار ہوں خوشی سے ادا کر دیجئے۔“

پیام میں خلوص تھا۔ محبت تھی۔ بات دلہن والوں کی سمجھ میں آگئی۔ اور حرمیاں اسلم خاں نے تمیزن کو لالچ دے کر خاں صاحب کی پمک بک حاصل کر لی۔ انعام کے ساتھ انھیں یقین بھی دلایا کہ اگر بھانڈا پھوٹ بھی جائے تو وہ تمیزن بی بی پر آچ نہ آنے دیں گے تمیزن بی بی جانتی تھیں کہ اسلم میاں بقتے چلتے ہوئے ہیں اتنے ہی غریبوں کے ہمدرد اور بات کے پکے ہیں اور پھر تمیزن بی بی کے لیے یہ کام کوئی بڑا کام نہ تھا۔ باپ کی دولت کا جائز حق دار بیٹا ہی تو ہے وہ کون ایسا بڑا لگاؤ کرنے چلی ہیں جو ان کا ضمیر انھیں کچھ کے دیتا

دوسرے دن چاک بک اسلم خاں کے ہاتھ میں تھی۔ خاں صاحب کے جعلی دستخط ثبت کر کے شام ہوتے ہوتے اس نے چاک کیش کروالیا اور رقم دلہن والوں تک پہنچا دی گئی۔

دلہن سسرال آئی تو ایک ہی دن میں اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی سسکیاں بھرتی ہوئی ماں نے اس کو اپنے سے جدا کرنے وقت جس جنت کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا تھا وہ جنت کم سے کم اس دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہو سکے گی۔ جملہ غریبی میں اس کی جھکی جھکی اور شرعی آنکھیں جب بھی اوپر اٹھیں تو وہ محسوس کرتی کہ اس کی روج اس کمرے میں بھٹکتی پھر رہی ہے جس کو لمحہ بھر کے لیے سہارا دے کر اسلم خاں نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ناداری کا وہ احساس جو اس کے بچپن سے لے کر اس کی جوانی تک اس کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا تھا آج جیسے وہ اسی احساس کے ساتھ بیاہ دی گئی تھی۔

اپنے کمرے میں گھونگھٹ میں سر جھکائے ہوئے اس نے سُن لیا تھا کہ خاں صاحب اسلم خاں پر بری طرح برہم ہو رہے تھے۔ اسلم خاں نے نہایت ڈھٹائی سے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے خاں صاحب کے جعلی دستخط سے بنک سے روپیہ حاصل کیا تھا۔ خاں صاحب جو الاکھی بنے ہوئے تھے لیکن اسلم خاں نے اپنی اس حرکت کا پوری طرح خاں صاحب ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا جیسے دو آتش فشاں اپنا اپنا لاوا ایک دوسرے پر اچھال اچھال کر خوفناک تہقے مار رہے ہیں اور وہ یکے دوسرے دونوں کے بیچ میں پھنسی ہوئی اپنی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے پانی کے ٹھنڈے قطروں سے بھرتے ہوئے بھیجاہک شعلوں کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے لیکن بہت

اُجلی پر چھایاں آدمی اور آدمی

جلد اس نے دیکھ لیا کہ جس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ اپنی آنکھوں کا سارا خزانہ لٹا رہی تھی اس آگ نے خود بڑھ کر اس کی آنکھوں کا سارا پانی بھسم کر کے رکھ دیا ہے اور اب وہ اس دولت سے بھی محروم ہو گئی ہے جو تنہائی میں اس کی رفیق تھی اور جو درد کا دواں تھی۔ غم کا دوا تھی، زخم کا مرہم تھی۔

دو روز سے اسلم خاں نئی دہلی کو چھوڑ کر غائب تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خون آلودہ گٹھری کی طرح اپنے پلنگ پر پڑی رہتی جیسے کسی عورت کو خنجر سے بے طرح زخمی کر کے نیم مردہ حالت میں کمرے میں پھینک دیا گیا ہو جس کے بدن سے تازہ خون پس پس کر اس کے پیر میں کو گلنار بن رہا ہو۔

ایک رات خانم نے دہلی کے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنی۔ اندھیرے میں راستہ ٹھوٹتی وہ دہلی کے کمرے تک پہنچی اور کان کو اڑوں سے لگا دیئے۔ خانم کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تو اسخوں نے کانوں کو قابل اعتناء سمجھا اور دروازے کی دراز میں سے ان کی نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسلم خاں دہلی کی گود میں سر چھپائے سسکیاں لے رہا تھا اور دہلی کی آنکھیں اسلم خاں کے گالوں کو آنسوؤں سے بہلا رہی تھیں۔ اسلم خاں کو بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا دیکھ کر خانم کے پندار کو ٹھیس لگی۔ وہ سوچتی رہیں کہ اپنے باپ سے زبان درازی کرتے ہوئے تو اسلم خاں نہیں چوکتا اور آج دو دھڑی کی چھوڑی کے گود میں پڑا نامردوں کی طرح سسکیاں لے رہا ہے۔ لیکن دوسری لمحے خانم اپنے تدبیر اور سیاست پر بہت خوش ہوئیں۔ اسخوں نے سوچا کہ اب اسلم خاں اپنی باغیانہ روش ترک کر کے پالتو جانوروں کی طرح خاں صاحب کی سرد گرم چپ چاپ سہہ لے گا۔ باپ کی آنکھوں کے تنکے کو شہتیر سمجھنے والا اب شہتیر کو تنکا برابر بھی اہمیت

نہ دے گا، اور پھر ایک دو پہلے جنم لے لیں تو اسلم خاں اپنی واہی بتا ہی بکواس چھوڑ کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے متھام لے گا اور کیا عجب کہ خاں صاحب کو نماز اور روزے کے لیے نصیحت نہ کرنا پڑے۔ خانم نے محسوس کیا جیسے اسلم خاں دلہن کی گود میں سر رکھے نماز ادا کر رہا ہے لیکن فوری دل ہی دل میں انہوں نے اس فاسد خیال سے توبہ کر لی جانے وہ اور کیا کیا سوچتی رہتیں لیکن اسلم خاں کی آواز نے انہیں چرک کا دیا۔ ٹھنڈے پانی کا خالی گلاس جب دلہن نے اسلم خاں کے ہونٹوں سے ہٹایا تو اسلم خاں نے ایک لمبی سرد آہ کھینچ کر دلہن سے کہا "اب میں تم کو اس گھر کے بے رحم ماحول میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نام نہون تمہارا مقصود وار ہوں۔ میں نے تم سے بیاد کر کے اس گھر میں ایک مظلوم انسان کا اضافہ کیا ہے۔ میں نے تمہاری مغلسی سے فائدہ اٹھایا، لیکن تم یقین کرو کہ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس زبردست ماحول میں میں گھٹ گھٹ کر مر جاتا۔ اب میں تمہارے لیے زندہ رہوں گا۔ زندگی کے غم ہم جل کر بانٹ لیں گے کیوں کہ یہاں تم کو اتنے بڑے گھر کی اکلوتی بہو کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ دولت نہیں مل سکتی، حکومت نہیں مل سکتی، یہاں تک کہ محبت بھی نہیں مل سکتی۔ میسر باپ کے دل میں زندگی کی کسی شے کے لیے محبت کی رفق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اس کو میری ماں سے محبت نہیں ہے، اس کو مجھ سے محبت نہیں ہے پتہ نہیں اس کو..... اپنے آپ سے بھی محبت ہے یا نہیں میری ماں سے صرف اس لیے اس کی کئی دہائی ہے کہ اس نے اپنی ساری دولت میسر بڑے ماموں کی سرپرستی میں کمائی ہے اور اسی لیے وہ اپنی دولت میں میری ماں کو بھی چھوٹا موٹا حصہ دار سمجھتا ہے۔ لیکن میں اس وقت بہت دلکشی ہو جاتا ہوں

جب سوچتا ہوں کہ میسر باپ کی دولت میری ماں کی مانتا کو خرید لینے میں کس طرح مہیا ہو گئی۔ تم کہو گی کہ میں اپنے ماں باپ سے زیادتی کر رہا ہوں، تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ اس عمر میں مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہونا چاہئے تھا۔ دولت میسر باپ نے کمائی ہے۔ میں نے نہیں کمائی تو مجھے اس کا حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کے برتنے پر اترتا پھروں۔ تم اگر اس طرح سوچ رہی ہو تو ایک حد تک صحیح سوچ رہی ہو لیکن میں نے اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ میرا دوش صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے اصولوں کو اپنے نظریات کو اپنے باپ سے شکست کھا کر اس کے آگے سپردال دینے سے بچا رکھا ہے۔ میرا قصور یہی ہے کہ میں نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے۔ میسر باپ نے میری مرضی کے خلاف کافی رشوت دے کر مجھے محکمہ پولیس میں ایک اچھی سی خدمت دلوادی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے میرے لیے بھی زندگی کے وہی راستے چنے تھے جن پر چل کر میں بہت متمول ہو سکتا تھا، جن پر چل کر میں بھی سوسائٹی میں ایک اونچا مقام حاصل کر سکتا تھا۔ میسر نے بھی یہ سارے امکانات تھے اور ان دنوں میرا باپ مجھ سے بہت خوش تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھالی تھی۔ بندوق میرا بچپن تھی۔ بندوق میری جوانی تھی۔ بندوق میرا فن — پھر ایک تاریک رات کو میسر آقاؤں نے مجھ سے سہرگوشی کی۔ حکم دیا کہ میں اپنے اس فن سے ساری انسانیت کے سینے کو چھلنی کی طرح چھید دوں — سبھو کے ننگے، ذلیل اور کینے انسانوں کی ایک چھوٹی سی دنیا نے میسر خداؤں کی نینداڑادی تھی۔ میسر خداؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کی آنکھوں سے چرائی ہوئی نیندیں واپس لا دوں کیوں کہ ذلیل انسانوں نے صرف اس لیے ان کی نیندیں چرائیں کہ

اٹلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

میرے خداؤں نے ان کمینوں کے ہونٹوں کی شادابی پر ہر پہر بٹھا رکھے تھے۔ ان کی ہنسیوں کو انھیں کے کپکپاتے ہونٹوں میں دفن کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنیاں گہرا اندھیروں کے نیچے چھادی تھیں۔ ان کے خالی پیٹوں کے اندر دانہ گندم کے عوض آتش و باروت بھر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن آج یہ سارے ذلیل و خوار انسان اپنی کہیں نگاہوں سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے ایک آواز ہو کر آج اپنے ہونٹوں کی شادابی مانگی تھی۔ اپنی مسکراہٹوں کی زندگی مانگی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکنیں مانگی تھیں، اپنی آنکھوں کی روشنیاں مانگی تھیں۔ اپنے خالی پیٹوں کے لیے دانہ گندم مانگا تھا، اور غضب تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں سجاوت سے نہیں مانگیں ہاتھ پھیلا کر نہیں مانگیں بلکہ برہم ہو کر مانگی تھیں، دھمکا کر اور للکار کر مانگی تھیں۔ بادل کی طرح گرج کر مانگی تھیں اور اس گرج نے میسر خداؤں کی نیند اڑا دی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اگر آج میں انھیں کمینوں کی صف میں ہوتا تو اپنے خداؤں کی ویران آنکھوں کے لیے ابدی نیند فراہم کر دیتا جو اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی اور قلم اٹھا کر نوکری کے لیے استغفا لکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن شبہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن میرے باپ نے ضمانت دے کر مجھے رہا کر دیا۔ اس کے بعد پھر مجھے کوئی نوکری نہ مل سکی، کوئی کام نہ مل سکا اور آج سو سائٹی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ میرا ہی خاندان مجھے خاں صاحب کا آوارہ اور نکمٹا لونڈا کے خوبصورت نام سے یاد کرتا ہے۔ اور آج تم اس آوارہ اور نکمٹے لونڈے کی بیوی بن کر خاں صاحب کے اتنے بڑے گھر میں آئی ہو۔ یہاں تمھارا کچھ بھی نہیں ہے، یہاں میرا کچھ بھی

اجلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

ہیں۔ لیکن میں نے خود کو خالص صاحب کی دست برد سے بچا رکھا ہے اور آج تم سے میری یہی التجا ہے کہ اس ماحول کی نفرتی چکا چوند میں اپنی آنکھوں کو چندھیانہ دینا جس دن تم خاں صاحب کے ہاتھوں بک جاؤ گی وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔
خانم کو اڑ سے کان لگائے سنتی رہیں، کچھ سوچتی رہیں، کچھ اونگھتی رہیں۔ صبح دیر سے بیدار ہوئیں تو خاں صاحب ناشتے پر ان کے منتظر تھے۔ خانم نے ڈائینگ ٹبل پر بیٹھتے ہوئے خاں صاحب سے کہا کہ تم اب بھی میری فراست کے قائل ہو یا نہیں میں نہ کہتی تھی کہ اسلم کے پیر جکڑ دو۔ وہ رات کو گھر لوٹ آیا ہے اور اب دیکھنا اس کے پاؤں کا چکر گھر کی اس چار دیواری تک محدود رہے گا۔ خاں صاحب کو اس سے مطلب نہ تھا کہ اب اس کے پاؤں کا چکر گھر کی چار دیواری تک محدود رہے یا نہ شہر کی حدود میں لگتا رہے۔

دن گذرتے گئے تو خانم کو اپنی فراست کا یقین ہو تا گیا۔ اسلم خاں کے پاؤں کا چکر نہ صرف گھر کی چار دیواری بلکہ اس کے کمرے کی چار دیواری ہی تک محدود ہو گیا تھا۔ وہ دن دن بھر یا تو پرتھو پرتھو یا پھر اپنی بیوی سے تاش کیلے تارتھو۔ کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی کے لیے ادھر ادھر دوستوں سے مل کر آتا لیکن اکثر دوست اجاب خود اس کے پاس آ جاتے۔ البتہ خاں صاحب اور خانم کو یہ مشترکہ شکایت اس سے ضرور رہتی کہ وہ اپنے سارے دوست اجاب کو اپنے ہی کمرے میں بلاروک ٹوک بلا لیتا اور اس کی بیوی کسی سے پردہ نہ کرتی، اور پھر اسلم خاں کے دوست بھی تو بھانت بھانت کے بہروپ دیکھائی دیتے لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب کے سب چرب زبان تھے۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتے اور ایسی ہی باتیں کرتے جو نہ خانم کے سمجھ میں آتیں اور نہ خاں صاحب

ہی کے بس ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے جہاں کا دکھ اسلم میاں اور ان کے دوستوں کے دل میں آن بسا ہے۔ ایک عالم کی فکر ان سب کو کھائے جا رہی ہے۔ جوانی کبھی خاں صاحب پر بھی تو آئی تھی۔ کیسے کیسے نواب زادے اور اونچے گھرانوں کے لڑکے ان کے دوست تھے۔ جب کبھی جمع ہوتے پیاری جان، سبزہ جان، جدن بائی، کچن بائی سب کی سب گفتگو کا موضوع بنی ریتیں پھر بیچ بیچ میں کیا کیا فکس بازی ہوتی کہ خانم کو اڑ کو کان لگاتے ہی شرم جاتیں۔ لجا کر عرق عرق ہو جاتیں لیکن اسلم میاں کے دوستوں کی نسبت یہ شہرت عام تھی کہ اکثر جیل سمجھتے کر آئے ہیں۔ قیر کاٹ کر آئے ہیں خاں صاحب اور ان کے دوستوں کی مردانگی کے قصے چھڑتے تو کو کھٹوں کا تذکرہ ہوتا شہر کی بڑی بڑی طوائفوں کی بات چھڑتی اور آج اسلم خاں اور ان کے دوستوں کی مردانگی اور بہادری کے تذکرے ہوتے ہیں تو جیل کی سزائوں اور صعوبتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جلسوں اور جلوسوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ خانم سوچتیں کہ دنیا کا رنگ کتنا تیزی سے بدل رہا ہے۔ آج کا انسان انھیں کل کے انسان سے ذرا مختلف سا نظر آتا۔ اسلم میاں اور ان کے دوستوں کو دیکھ کر خانم کو اپنے شبہات یقین کی صورت میں بدلتے ہوئے معلوم ہوتے لیکن ان کا دل نہ مانتا کہ انسان اللہ سے دور ہو کر سبھی نیکی کی طرف جاسکتا ہے۔

اسلم خاں نے اسی کمرے میں کتابیں پڑھتے اور ناش کھیلے ہوئے کئی چھوٹی چھوٹی زندگیوں کا اضافہ کر دیا۔ دلہن جب سبھی امید سے ہوتیں تو خانم مصلاً بچھا بچھا کر گر لڑائیں کہ اسلم خاں بیٹے کے باپ بنیں اور خاں صاحب کا نام رتہی دنیا تک زندہ رہے۔ لیکن جیسے دلہن نے بیٹے کو جنم نہ دیئے کی قسم کھا رکھی تھی۔ خاں صاحب کو ان باتوں سے کوئی

مطلب ہی نہ تھا۔ خانم البتہ کبھی کبھی سوچتیں کہ اسلم خاں کی دوسری شادی کی جاوے۔
 ولہن کے بطن سے اولاد نہ رہنے نہ ہونے کا انہیں قریب قریب یقین ہو گیا تھا لیکن خانم کی
 یہ حسرت دل ہی میں رہی۔ ولہن بیٹیاں جتنی رہیں اور اسلم خاں کتابیں پڑھتے رہے۔ خانم
 بے چاری مصلے بچھاتی اور تہہ کرتی رہیں۔

اب تو خانم اس بات کی جرات بھی نہ کر سکتی تھیں کہ اپنے بیٹے سے دوسری شادی
 کی بات ہی چھڑائیں۔ کیوں کہ اب تو وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو گیا تھا۔ خانم کا دست نگر
 مقنا تب بھی وہ ہمت نہ کر سکیں اور اب تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھیں کیوں کہ اسلم خاں
 یکا یک ایک ہوٹل کا منیجر ہو گیا تھا اسلم خاں کے ایک کھاتے پیتے دوست نے کافی پیسہ خرچ
 کر کے اسلم خاں کے ساجھے میں ہوٹل کا کاروبار شروع کیا تھا۔ سمجھوتہ اس طرح ہوا
 کہ اسلم خاں ہوٹل کے سارے کاروبار انجام دے گا اور جو کچھ منافع ہو گا اس میں
 ایک تہائی کا حصہ دار رہے گا۔ محمد ار خاں اسلم خاں کا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ جانتا
 تھا کہ اسلم خاں کس قدر قابل اعتماد آدمی ہے۔ ہوٹل کا دھندہ شروع کرنے کے بعد
 اس نے پھر کبھی پلٹ کر بھی ہوٹل کا رخ نہ کیا اور اپنے دوسرے کاروبار میں ابھار ہا ہر راہ
 ہزار بارہ سو روپے محمد ار خاں کو گھر بیٹھے ہوٹل کا منافع مل جاتا۔ اسلم خاں کے حالات بھی
 بہت اطمینان بخش ہو گئے تھے۔ اس کی بچیاں اچھے سے اسکول میں شریک کر دی گئی
 تھیں۔ اس کی بیوی کا نکلس اس کی صراحی دار گردن کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے
 سیٹھ کی تجویز سے واپس لے لیا گیا تھا۔ اس کی انگوٹھیاں اس کی محرومی انگلیوں میں
 پھر جگہ جگہ لگی تھیں جن کو ایک سیٹھی کے پاس رہن رکھتے وقت اسلم خاں نے اپنی
 بیوی سے کہا تھا کہ تمہاری انگوٹھیاں تمہاری انگلیوں میں اس لیے بہت قیمتی ہو جاتی

ہیں کہ تمھاری انگلیوں کا حن بھی نقلی ہے سکر کی تابناکی میں شامل ہو جاتا ہے لیکن جوں ہی یہ انگوٹھیاں تمھاری انگلیوں سے الگ کر لی جاتی ہیں تو کوئی سیٹھ سا ہو کارا نہیں پچاس ساتھیں بھی نہیں پوچھتا۔ اسلم خاں ہوٹل کا میجر ہو گیا تو اس نے پھر ان انگوٹھیوں کو انمول بنادیا۔ اس ہوٹل نے جہاں اسلم خاں کی زندگی کا رخ بدلا وہیں اس کے نادار دوستوں کی جیب بھی بھری، ان کا تن بھی ڈھانکا، بیماری میں ان کو صحت بھی بخشی لیکن ڈیرھ سال تک اسلم خاں کی زندگی کو بے پناہ خوشیوں سے ہمکنار کر کے اس ہوٹل نے بھی آج دم توڑ دیا تھا۔

کال بل خاموش ہو گئی تھی۔

ریڈیو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

اور اس کی زندگی بھی پھر کسی بریلی چٹان کے پیچھے دب کر منجمد ہو گئی تھی۔ اور اس نقطہء انجماد کو کسی سیال آگ کے سہارے زندگی کی حرارت بخشنے کے لیے اس نے آج پھر ایک اسکاچ حسینہ کا دامن ستھام لیا تھا۔

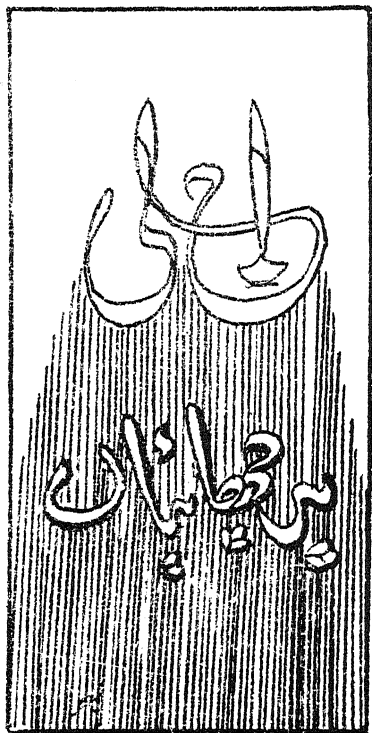
ہوٹل بند ہو گیا تو اسلم خاں کی زندگی بھی ایک ڈگر پر جیسے گھسٹنے لگی۔ اب نہ اس کی بغاوتیں تھیں نہ خاں صاحب کی برہمی۔ اسلم خاں نے زندگی کی جدوجہد میں ہر وقت ناکامی کا منہ دیکھا تھا، اور چپکے چپکے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ خاں صاحب کے رحم و کرم پر عمر کا زرین حصہ گزار دینے کے بعد اس نے زندگی کی یکسانیت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ایک گھٹن ایک بیزاری کا احساس ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ کچھ کرنے کی خواہش نے کچھ نہ کر سکنے کی حسرتوں کا کفن اوڑھ لیا تھا، اور یہ حسرتیں اسلم خاں کے سینے میں دھیمی دھیمی آگ لگائے رکھتیں۔ اس کو بار بار اپنی غلطی کا احساس ہوتا کہ

اپنے ساتھ ساتھ تائیکیموں میں بٹکنے کے لیے اس نے اس دنیا میں اور بھی زندگیوں کا اضافہ کر دیا ہے جن کا نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل اور اب یہی چلائی ہوئی ویرانیاں اور پرچھتے ہوئے سناٹے اس کا مقدر بن گئے ہیں۔ اس کی زندگی بن گئے ہیں۔ اس کی موت بن جائیں گے۔ ان ویرانیوں اور سناٹوں سے بغاوت کرنے کی اب آسٹم خاں میں سکتا نہ تھی۔ اس کی بچیاں اسکول کی تعلیم سے اس لیے محروم کر دی گئی تھیں کہ خاں صاحب کو یہ بات گوارا نہ تھی یا مصطفیٰ انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا تھا۔

لیکن ایک دن اسٹم خاں اپنی بیمار بچی کو سینے سے چمٹائے ہوئے سسکیاں لیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے دوا خانے میں فوری شرکت کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ بچی کو طویل البعاد، ٹائفاؤڈ میں آنتوں کی دق ہو گئی ہے۔ اسٹم خاں نے اسی نظروں سے باپ کو دیکھا جیسے اپنی لاڈلی بچی کی زندگی کی سبب ایک مانگ رہا ہو۔ خاں صاحب کا چہرہ اس کی طبعی نظروں کی زد میں باسی پھول کی طرح کھلا گیا۔ لیکن انھوں نے دوسرے ہی لمحے میں اپنے خضاب چڑھے ہوئے بالوں میں اٹھکلیاں پھیرنے ہوئے کہا ”اسٹم خاں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اپنے پیاروں کو مصو بتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تمھاری آزمائش شاید اس کو اسی طرح مقصود ہے۔ اپنے کیے پر دل سے شرمندہ ہو کر اس کی بارگاہ میں گر گراؤ۔“ باب اجابت وا ہو جائے گا۔ موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ آدمی عاجز ہے، مجبور محض ہے، مجھے جائیداد کا ٹیکس ادا کرنا نہ ہوتا تو میں بیٹا کے لیے کرائے کا وارڈ بھی لے لیتا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے بھلا۔ وہی ڈاکٹر ہوں گی ویسی ہی دیکھ بھال ہوگی۔ عام دارڈ میں بھی تو اللہ کے لاکھوں بندے شفا پاتے ہیں۔ — فقط ایمان کی صلابت اور پختگی چاہیے اور بس۔“ اور اس سے پہلے کہ باب اجابت وا ہو جاتا

اسلم خاں نے خاں صاحب کے گھر کا کھلا ہوا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔

خانہ نے اس بند دروازے کو اپنے بیٹے کے لیے ایک بار پھر کھولا تو اس وقت وہ اپنی مردہ بچی کے بستر کے پاس سببی ٹوریم میں بے ہوش پڑا تھا۔ زندگی بھر جس چوکھٹ پر قدم نہ رکھنے کی اس نے قسم کھائی تھی غشی کے عالم میں اس کے نیم مردہ جسم نے وہ چوکھٹا پھر پھلانگ لی تھی۔ خاں صاحب اپنے جگر گوشے کی نور نظر کے کفنِ دفن کے انتظام میں مصروف تھے۔ اسلم خاں کو ہوش آیا تو میری بچی میری بچی چلاتا ہوا بھاگا۔ سامنے رکھی ہوئی قد آدم الماری کے آئینے میں وہ اپنی پشت پر کھلے ہوئے دروازے کے عکس کو دیکھ کر تمیز نہ کر سکا کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو پیچھے چھوڑ کر بند دروازے کی طرف سبھاگ رہا ہے الماری سے ٹکرا کر وہ گرا تو ایک چھینا کے سے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے اور الماری کا پہلے بے بسوا کے محرم کی طرح کھل گیا۔ اسلم خاں نے دیکھا کہ الماری کے نچلے خانے میں فریخ اور اسکا شجر شربوں کی دو تین بوتلیں لٹھک گئی ہیں۔ کوئی آدمی خالی ہے کوئی پاؤں باقی رہ گئی ہے اس نے یکے بعد دیگرے کچی کچی خالص شراب کی بوتلیں خالی کر دیں آخری بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر چور چور ہو گئی تو وہ جھکا۔ الماری کے سب سے اوپر کے خانے سے نیچے گرا ہوا قرآنِ فرش پر لٹ پڑا ہوا شراب میں نہا رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر قرآن اٹھالیا اور الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا خاں صاحب کے وظیفے کے کمرے سے باہر نکل گیا۔



اس کے لیے بطخوں کی قیں قیں میں اب بھی اتنی ہی دلکشی ہے جتنی آپ کے لیے مٹی کی تانوں میں ہو سکتی ہے۔ آپ اس کو بذائق کہہ لیجیے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کا سین ماضی کچھ دن اسی قیں قیں سے اس طرح وابستہ رہا ہے کہ وہ ان کی جذباتی قدروں SENTIMENTAL VALUES سے انکار نہیں کر سکتا۔

چوڑیوں کے چھناکوں کے ساتھ ساتھ یہی قیں قیں کی آوازیں اس نازندگی میں داخل ہو گئی تھیں۔ موسیٰ ندی کے کنارے کنارے، کھیت کے یلوں کی گھینٹوں کے ساتھ ساتھ یہی آوازیں وہ گجر دم سنٹارہا تھا۔ قریبی ستے سے گذرنے والے ڈھوڑھنگر کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ان کے چرواہوں، سُرلی اور بے سُر تانوں کے ساتھ اس نے یہی آوازیں سنی تھیں۔ یہاں تک پچھلے گورہ جیل کے سنترلیوں کی ہوشیار ہوشیاریں بھی یہی قیں قیں رات کے نمک امل رتی تھی اور اسے ان آوازوں سے انس تھا۔

جب وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ محلہ موسیوریموں پہنچا ہے تو دونوں میاں بیوی مسرور تھے۔ ان کی انہ دو حاجی زندگی کا آغاز شہر سے کچھ ہی دور ندی کے کنارے اسی چھوٹی سی بستی کے ایک نیم پختہ مکان اور باغیچے سے ہوا تھا جہاں لکڑی کی ”کوکو“ پیلیہ کی ”پیو پیو“ مرغیوں کی لکڑیوں کوں کا ایک ضروری جُز بٹخوں کی قیس قیس بھی تھی۔ بچپن سے اس نے جس کو چاہا تھا۔ جوانی میں اس نے جس سے محبت کی تھی وہی لڑکی اس کی دلہن بنائی گئی۔ لیکن اس طرح کہ عقد میں دلہن کی ماں شریک نہ تھیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے منہ بسورے جیسے آفتوں کو سہہ رہے تھے۔ پھلار اسہرہ لاتے ہوئے راستے ہی سے لوٹا دیا گیا تھا اور قاضی جی گھر کی بجائے محلہ کی مسجد میں بیٹھے بادام چھوہاروں کی خیر منار ہے تھے لیکن اس نے ہزار ہزار متبش کیں اور اپنے والدین کو مناسکھا کر اس روز عقد مسعود کو طے نہ دیا۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ قاضی صاحب بیچارے جس عالم میں عقد خوانی سے پہلے تھے اسی عالم میں عقد خوانی کے بعد بھی رہے یعنی سوائے ان کے مقررہ ”نیک“ کے انھیں بادام چھوہارے دیکھنا تک نصیب نہ ہوا اور نہ ہی ان کے شملے کا دامن چا دلوں سے مجھرا گیا۔

ویسے دیکھنے کو لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے اور کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی کہ اس عقد کا انداز آخر اتنا اسلامی کیوں تھا۔ نہ نوبت، نہ روشنی، نہ دھڑیل کا ہجوم نہ میرا شنیں۔ بغیر مسند کے دروازے سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہوئے نوشاہے گلی میں ایک سچولوں کا ہارجو قاضی صاحب کے عقد خوانی شروع کر دینے کے بعد ڈال دیا گیا تھا۔ قاضی صاحب سوچتے رہے اس کو اسلامی شادی کیسے

بلی پر چھائیاں

بلی پر چھائیاں

ہا جا سکتا ہے — مسند نہ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن چاول اور چھوڑوں کی برکت سے جو واقف نہ ہوں وہ کیا جانیں اسلام کیا ہے — ماحول کی اجنبیت نے بے چارے قاضی صاحب کو اتنی اجازت بھی نہ دی کہ وہ اپنے حقوق کے اتلاف و احتجاج کرتے — ورنہ اگر شادی جیسی شادی ہوتی اور چھوڑا ہر سے ہادام کم نظر آتے تو قاضی صاحب ضرور ٹوک دیتے کہ سمجھی ان ضروری باتوں میں بخلت نہیں کرنی چاہیے ۔ اللہ کی برکت اسی میں ہے ورنہ باجے کاجے اور چمکاتے گولے صرف دنیا داری کی باتیں ہیں — لیکن یہاں تو سکر سے سب کچھ غائب تھا — یہاں تک کہ چہروں کی بشارت غائب تھی — ہونٹوں پہ ہنسی غائب تھی اور جب قاضی صاحب نے دلہن کو انعام اور نام دریافت کیا تو سب کو خاموش دیکھ کر خود دلہا میاں بول اٹھے کہ نام یہ ہے، عمر یہ ہے اور اس انداز سے قاضی صاحب کو دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ زلوی صاحب فرمائیے تو ناک نقشہ سب نوٹ کرادوں — لیکن قاضی صاحب کی تنکبی طروں نے دلہا میاں کو ٹوک دیا اور اس بے ضابطگی پر ان کی جھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دلہن کے ماموں نے خواستہ نا خواستہ دوسرے سوالوں کی تکمیل کروادی — نقد پڑھا دیا گیا تو قاضی صاحب نے اپنے ”نیک“ گواندرونی جیب میں اس طرح بھالیا جیسے یہ رقم بھی انھیں غلطی سے دے دی گئی تھی، اور سیلیپر پاؤں میں اٹکائے پیٹر پیٹر کرتے دروازے کی طرف لپکے۔

غرض اس کی شادی بھی اتنے ہی ہنگاموں سے تکمیل کو پہنچی جتنے ہنگاموں میں اس کی محبت پر و ان چڑھی تھی — مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی جرائم پیشہ کی روح وہ خاندان بھر کی نظروں میں کھٹکتا رہا تھا۔ مخالفیت جتنی شدید ہوتی ان کا

اُجلی پرچھائیاں
رو عمل بھی اتنے ہی شدید ہوتا۔ اور شاید ان مخالفتوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ خاندان
ہی کی ایک لڑکی سے جو اس کی قریب ترین رشتہ دار تھی اس نے بے اندازہ محبت کی تھی
ایسی محبت جو بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خاندان بھر کی
پہلی محبت تھی۔ پہلی کہانی تھی۔ پہلی حقیقت تھی۔

چھوٹی عمر ہی سے وہ ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے۔ ساتھ کھیلنا، ساتھ
ہنسنا اور کبھی نہ جھگڑنا۔ اس کی امی کہتیں کہ لولو سے کوئی جھگڑتا ہے تو یہ شریہ اس
کی وکالت کرتا ہے اور سب بچوں کو ڈانٹ بتاتا ہے۔ پتہ نہیں یہ مزاج داریاں
کی رنگ لائیں اور جب یہ مزاج داریاں رنگ لائیں تو سارا خاندان اس کی مخالفت پر تل گیا اور جوں جوں
حالیفتیں بڑھتی گئیں کوئی اس کے دماغ پر چھٹا نہ گیا۔ دل کے اندر ہی اندر ایک چھوٹی سی دنیا تعمیر کرتا گیا، تعمیر کرتا
گیا یہاں تک کہ اس کو یقین ہو گیا کہ کوئی تحریر ہی قوت اس چھوٹی سی دنیا کو نہیں نہیں
نہیں کر سکتی یہاں تک کہ یہ اب اس کے اپنے بس میں بھی نہیں۔ اور کسی نے اس
کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پکار کر کہا تم سچ کہتے ہو۔ نہ اب یہ تمہارے بس
میں ہے اور نہ میرے بس میں۔ میں صرف اس دنیا کی تعمیر کر سکتی ہوں اور تم نے جن
ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مقام لیا ہے میں ان ہی ہاتھوں سے اس دنیا کے چپے
چپے کو سنوار دوں گی، ذرہ ذرہ کو نکھار دوں گی۔ اور آخر کار چپہ چپہ سنور گیا،
ذرہ ذرہ نکھر گیا اور وہ دونوں اپنے دل کے اندر سجائی ہوئی اس خوبصورت دنیا کو
اپنے ساتھ لیے اس مکان میں داخل ہو گئے جہاں انہیں اپنی اس دنیا کو دھرتی پر
رکھ کر کچھ اور نکھارنا تھا کچھ اور سنوارنا تھا۔

پندرہ روپے ماہانہ کرایہ کے سوا اس سے یہ مکان کافی اچھا تھا۔ دو ہال

ایک دیوان خانہ اور دو کمرے جن میں ایک کمرے کو مالک مکان نے اپنا کچھ سامان محفوظ کر کے مقفل کر دیا تھا۔ صحن بہت وسیع تھا۔ اصل عمارت کے نیچے صحن میں حمام باورچی خانہ وغیرہ الگ تھے۔ صحن کے علاوہ مکان کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ جس میں بہت سی سیلئے سے گلاب موتیا کے درخت، سمٹ کے پختہ درمیانی عرض کے اطراف لگائے گئے تھے۔ سپوٹوں اور آسموں کے درختوں کی قطار چار دیواری سے لگی بلکی احاطہ کی تین سمتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سمت کیلے کے درخت پھنیوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے اور ایک دوسرا عوض کیلے کے درختوں کی جھنڈ میں پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ جیسے خود ان درختوں نے اپنے لمبے لمبے پتوں میں اسے سو سوختن سے چھپا رکھا ہو کیوں کہ یہ محض صفی اسی لیے بنایا گیا تھا کہ کیلے کے درختوں کی آبپاری کے لیے نل کا پانی اس میں جمع کیا جاسکے اور جیسے کیلے کے درخت اس راز سے واقف تھے کہ ان کی بالیدگی کے لیے ان کی زندگی کے لیے اس عوض کی کتنی اہمیت ہے۔

سپوٹوں اور آسموں کے درختوں کی پہلی قطار کے گھنے سائے میں ایک بہت ہی کشادہ پختہ درخت بنا ہوا تھا جس میں ایک چھوٹا سا متخل حوض بھی تھا۔ جس کی مالی باغیچے کے درمیانی بڑے حوض سے ملی ہوئی تھی۔ گھر کو ایک نظر دیکھنے پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مالک مکان بہت ہی سلیقہ مند آدمی ہے اور نہ صرف اس کو باغبانی کا شوق ہے بلکہ اس نے خاص طور پر پختہ اور عمدہ درختوں کا اہتمام محض بطخوں کے لیے ہی کر رکھا ہے جو شاید کبھی پت پت حق حق کرتیں دھنکی ہوئی رنگارنگ روئی کے گالوں کی مانند اس جالی دار مجلس میں ایک دو سیرے سے گھٹ ہوجاتی ہوں گی۔

تصویر میں اس کو ننھی ننھی بطخیں خراماں خراماں اس مجلس سے نکلتی ہوئی نظر

اجلی پرچھائیاں اجلی پرچھائیاں

آئیں جو قیں قیں کرتی باغیچے کی نالیوں میں اشناں کرنے لگیں۔ پاس ہی موسیٰ ندی سے آتی ہوئی یہ آوازیں اس کو اپنی ہی چار دیواری میں گونجتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کی ٹہنی سے ایک اور سچول توڑ لیا اور بڑے چاؤ سے اپنی بیوی کے بالوں میں سجاتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ مقام بطخوں کے دھندے کے لیے بہت موزوں ہے۔ ندی کے دونوں جانب یہی کاروبار کرنے والے آٹھ دس گھرانے بستے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل سویرے سویرے ہم ٹہلتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ جائیں اور ننھی ننھی بطخوں کی بچھلتا اور شوخیوں سے لطف اٹھائیں۔ اور اگر کوئی ڈھب کا آدمی مل جائے تو پانی میں تیرنے والے بادل کے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کر لی جائیں۔ اس کی بیوی نے بہت احتیاط سے پھولوں کو بالوں میں سجاتے ہوئے جواب دیا۔ ٹھیک ہے میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ہمیں بطخیں پالنا چاہیے۔

دو سے دن سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی قیں قیں کی آوازوں نے انہیں نیند سے جوقا دیا۔ اس کی بیوی نے کہا ہم ان دور سے آتی ہوئی آوازوں کو قریب سے سُننے کے متنبی ہیں۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم بہت صبح اٹھنے کے عادی بھی ہو جائیں گے۔ گھر سے باہر نکلنے سے قبل اسخوں نے ایک اچھٹی نظر اپنے باغیچے پر ڈالی۔ نئے گھر کی نئی صبح بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ کل تک جو کلیاں تھیں آج وہ گلاب ہو گئی تھیں۔ رات بھر نل کے جاری رہنے سے درمیانی حوض آدھے سے کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔ انجیروں پر چڑھے ہوئے پورے انیس ڈبے اپنی اپنی جگہ برابر تھے اس کی بیوی نے ڈبوں کو گتے تھوئے کہہ کہ خود اس باغیچے کے پھل پھلاری ہی سے ہم

اجلی پرچائیاں اجلی پرچائیاں

مکان کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں۔ مکان دار سچ ہی کہتا ہوگا کہ اس نے صرف اس خیال سے کہ گھر میں اچھے لوگ اتر جائیں تو درختوں کی دیکھ بھال ہوگی اتنے کم کرائے پر ہمیں یہ مکان دے دیا ہے۔

ادھیڑ عمر کا یہ آدمی روزانہ سیکل پر شہر سے یہاں تک صرف اس خیال سے آتا تھا کہ اس کا کتا بھوکا نہ رہ جائے۔ جھاڑ نہ مرجھا جائیں۔ خاص طور پر آموں کے صرف دو فیٹ اونچے دو چھوٹے چھوٹے درخت جو سیڑھیوں سے بالکل قریب تھے اور جن پر اس کو مہلت ہی ناز تھا کہ ان درختوں کو ہر موسم میں پانچ پیوندی آم ضرور لگتے ہیں۔ اور ان آموں کے بوجھ سے یہ درخت زمین پر جھک جھک جاتے ہیں اور وہ سینہ تان کر دوست احباب کو بتلاتا ہے کہ سارے حیدرآباد میں ایسے پٹر کہیں نہیں ہیں۔

”واقعی ان دونوں پیڑوں کی ہمیں بہت حفاظت کرنی چاہیے۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ مالک مکان کے بہت چیتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اگر واقعی ان درختوں میں آم لگتے ہیں تو یہ ایک نئی چیز ضرور ہیں۔“

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو انجیر گن لینے کے بعد کیلے کی پھنیوں کے حسن سے زیادہ ان کی مالیت کا اندازہ لگانے میں منہمک تھی اور جو حوض میں گرتے ہوئے نل کے پانی کی آواز کی وجہ سے اس کی بات نہ سن پائی تھی۔

”بہر حال خوب مکان ہے۔“ اس نے اس کو مخاطب کرنے کے لیے ذرا

بلند آواز میں کہا۔

اس کی بیوی مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ان مسکراہٹوں کو سمجھ رہا تھا۔

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

اس کے دل کی دنیا کے چپے چپے کو سنوارنے والے ہا انتخاب اس دنیا کو زمین پر رکھ کر اس کی تکمیل کے متعلق سوچ رہے تھے۔

کیلے کی پھنیاں غریب گھوڑے کی طرح گمراہی میں تھیں۔ بہت مغرور انداز سے گویا اس بات کی ضمانت دے رہی تھیں کہ حکومت کرنا چار چوہا کا کمرایہ تو ہم ہی ادا کر دیں گے۔ اور اس کی مسکراہٹیں کہہ رہی تھیں کہ میں صفتِ تعمیر کر سکتی ہوں۔ تکمیل کر سکتی ہوں۔ اور بطخوں نے دور دور سے پکار پکار کر کہا قیس قیس قیس۔ تم سچ کہتی ہو۔ اور دونوں مسکرا دیئے۔ اس کی طنز آمیز آہستہ بڑھتے ہوئے اس کی بیوی نے پوچھا: ”یہ بطخیں کس حساب سے ملتی ہیں؟“ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ آج پوچھنے پا چھنے سے کچھ اندازہ لگا ہی جائے گا اور دونوں باہر نکل گئے۔

گلشن بوانے ٹامی کو اندر بلاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ گلشن بوا اس کی سسرال سے اس کی بیوی کے ساتھ آگئی تھیں اور لمبے لمبے بالوں والے مسٹر ٹامی گھسے ساتھ ہی گھر کے رکھوالے کی حیثیت سے ان کے حصے دار تھے۔ کعبیت کی پگڈنڈیوں پر اس نے اپنی بیوی کو سنبھال لیا۔ ٹیڑھی ٹیڑھی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی ان کے پاؤں کے پیچھے جیسے پچھ پچھ جاتی تھیں۔

چیلوں کو ہاتھ میں اٹھائے پگڈنڈی کے کناروں پر اگی ہوئی مخملی ہریالی پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی بیوی نے اس کو مڑ کر دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ قدم قدم پر کوئل کو مل مخملی ہریالی بچھا دے اور اس کا ہاتھ پکڑے بے شمار پگڈنڈیوں پر چلتا رہے نرم ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے وہ اس کو گدگدانے والا ہی تھا کہ سامنے پل پر قیس قیس کا شور بلند ہوا۔

دونچے پاس کے نشیبی راستے سے ننھے منے ملے ملے، رنگ برنگے روئی کے کالے لٹرھکاتے لٹرھکاتے چلے آ رہے تھے۔ قیں قیں قیں سا کورس گاتی ہوئی یہ فوج اس فاسخانہ انداز سے چل رہی تھی جیسے تمام بحریر پر اس کا قبضہ ہے۔ سامنے گھنے پٹر کے پیچھے سے سورج ابھر رہا تھا۔ پل پر پہنچتے پہنچتے بطخوں کی یہ شفاف ٹولیاں پیر کی چوٹی سے چھنتی ہوئی کمرلوں میں نہا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک ندی پل کے نیچے بہہ رہی ہے اور ایک ندی پل کے اوپر کہ اتنے میں ایک دزدانی ہوئی موٹر سائیکل نے اس ندی کی چادر کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ قیں قیں قیں۔ اور یہ بہتا ہوا پانی منجمد ہو کر اڑتے ہوئے برف کے گالوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گیا۔ پل پر پہننے والی ندی پل بھر میں غائب ہو گئی اور پل کے نیچے بہنے والی ندی کی شاننی جیسے ڈولنے لگی۔ قیں قیں قیں قیں۔ پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے لہکورے پیدا ہو گئے۔ کنارے پر کھڑے ہوئے درخت، ٹیلے، چٹانیں جو ندی کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر سنور رہے تھے جیسے غش کھا گئے کیوں کہ ان کا عکس پانی میں حل ہو رہا تھا اور ان سے اپنی ہی صورت چھانی نہیں جا رہی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز، منظر کو تہ وبالا کرتی ہوئی یہ بحری فوج اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے میں مگن تھی۔

وہ دیر تک کنارے پر بیٹھے ہوئے منظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سامنے کناروں پر بطخوں کی ٹولیاں مختلف سمتوں سے ندی کی طرف شور مچاتی بڑھ رہی تھیں۔ ان کے رکھوالے کوئی ہاتھ میں پتلی سی چھڑی پکڑے کوئی جوار کی ٹوکری ستھامے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

اُعلیٰ پر چائیاں

اُعلیٰ پر چائیاں

پانی میں تیرتی ہوئی بطخیں کناروں پر آتی ہوئی بطخوں کو دیکھ کر اپنی گردنیں پانی میں ڈبولیتیں اور جلدی سے کیڑوں اور پرکیلیوں کی تلاش میں مصروف ہو جاتیں جیسے دوسری بطخوں کے ندی میں اترنے سے پہلے ہی سارے کیڑوں اور پرکیلیوں کو ہڑپ کر لیں گی۔ جو ذرا سنجیدہ سی تھیں، پر پھیلا پھیلا کر چرچ ڈبڈب کر اپنے کچھوؤں سے پیٹھ پر پانی اچال اچال کر نہا رہی تھیں۔ کنارے پر سچت سچت کرتی ہوئی ایک ٹوٹی چھوٹے چھوٹے پنھروں اور پودوں سے سختی بچاتی پانی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ایک ٹکڑی اتھل پانی میں اتری کچڑ میں چوٹیں دھنسلے پخ پخ کرتی کیڑے اور کچھوے چن رہی تھی۔ تیرتی ہوئی بطخوں میں ایک نر ایک مادہ کی گردن کو اپنی چوٹ میں دبائے ٹھٹھول کر رہا تھا۔

اس نے پاس بیٹھی ہوئی اپنی جیتی بیوی کے چٹکی لی۔ ندی سے نظریں ہٹا کر اس کی بیوی نے اس کو دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

پل پر کھڑے ہوئے لڑکے کو اس نے اشارے سے بلایا جو کسی نہ کسی بہانے نظریں گھاگھا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب لڑکا پاس آگیا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو بٹھالیا۔ دیر تک جانے کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ اپنی بطخوں کے ندی میں دور تک چلے جانے کا جب میراں کو احساس ہوا تو وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، اور آؤ کی آوازیں لگاتا، کنارے کنارے بھاگنے لگا۔ اس کی اپنی ٹولی کی بطخیں گردن گھاگھا کر آؤ کی آوازوں کی آوازوں کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور سچ جواب میں قیں قیں قیں کا شور بلند ہوا، جیسے سب کی سب کہہ رہی ہوں کہ گھبرائو نہیں ہم سچہ تنھوڑا ہی ہیں جو کہیں بھٹک جائیں۔ لیکن میراں اس تسلی دینے والی قیں قیں سے مطمئن نہ تھا۔

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں
 بھاگتے بھاگتے ہی اس نے پتھر اٹھالیے اور تیرتی ہوئی لٹخوں کے عین
 سامنے پھینکنے لگا۔ بڑق، ایک پتھر دو بگیا۔ قیں قیں، مچھتی پتھر نہ مارو
 ہم لوٹتے ہیں۔

بڑق، دوسرا پتھر پانی اچھالتا ہوا غائب ہو گیا۔ قیں قیں، قیں
 قیں۔ یہ کیا بد تمیزی ہے میاں۔

بڑق، تیسرا پتھر اگلی دو لٹخوں کے بالکل قریب گرا۔
 قینق۔ جلدی جلدی پانی کاٹتے ہوئے لٹخوں نے اپنا رخ بدل دیا اور مسلسل
 قیں قیں شروع ہو گئی۔

قیں قیں قیں۔ اچھا پتھر و مالک سے تمھیں پٹوائیں گے۔
 قیں قیں قیں۔ آج رات کوئی اٹتا نہیں دے گا۔

لیکن میراں جیسے اس راز سے واقف تھا۔ نہایت نرمی سے وہ آوازیں دے
 رہا تھا، آؤ آؤ جیسے پچکار رہا ہو کہ دیکھو اٹدے کبھی ست بند کرنا اور نہ مالک تمھارے
 میراں کو نوکری سے جواب دے دے گا۔ آؤ آؤ۔ اور پھر میراں تمھارا دوست
 ہی تو ہے۔ ادھر بڑی بڑی چٹانوں میں کو لے گھات لگاے چھپے رہتے ہیں کہ تم
 اس کنارے کا رخ کرو اور پھر اپنے میراں کو پکار سبھی نہ سکو۔

قیں قیں۔ کو لے کہیں اس ندی کی تہ میں تو نہیں ہیں میراں؟
 قیں قیں۔ تم یہیں ٹھہرو ہم آ رہے ہیں۔ قیں قیں قیں۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تو میراں نے وہیں سے کھڑے کھڑے ہاتھ ہٹا لیا۔
 جواباً اس نے بھی ہاتھ ہٹاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ”چلو اتنا تو معلوم ہوا کہ“

اُعلیٰ پر چھائیاں

اُعلیٰ پر چھائیاں

پاشو میاں یہاں کے سب سے بڑے بیوپاری ہیں اور واجبی دامنوں سے بطخوں کا معاملہ انھیں سے ہو سکتا ہے۔“

دوسرے کنارے پر مین کے سائبانوں کے پاس کھڑے ہوئے ایک موٹے سے تھمد باندھے ہوئے آدمی کو بتلاتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے پاشو میاں وہی ہوئے۔“ کتنا مالدار ہو گا یہ آدمی۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بطخیں۔ دل لگی نہیں ہے۔ پل کے ادھر عتبی بطخیں ہیں غالباً سب کی سب اسی کی ہوں گی۔ روز کتنے ہی اٹھنے نکلتے ہوں گے۔ ٹو کریوں کی ٹوکریاں بھر جاتی ہوں گی تیرہ برس۔ سب جب اس کی زندگی کا انحصار اسی دھندے پر ہے تو وہ بہت تجربہ کار ہو گا۔ کل ہی آپ اس سے مل لیجئے نا۔“

کھیت کی باڑہ میں الجھے ہوئے آچل کو چھڑاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ”آج ہی کیوں نہ مل لوں۔“

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور گھر کی طرف چل پڑے۔
ناشتے وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد دونوں گھر کی صفائی اور تزئین میں مصروف ہو گئے۔ بوا بستی کا چکر لگا کر ضروریات کی دکانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے چلی گئیں۔ مسٹر ٹامی بھی بوا کے پیچھے دم ہلاتے ہوئے چل پڑے جیسے سدا بستی سے بوا کو متعارف کرانے کا فرض ادا کریں گے۔

آج دن بھر وہ گھر ہی کے کام دھندوں میں الجھے رہے۔ تنھوڑی تنھوڑی دیر سے قیں قیں کی آوازیں آ آ کر انھیں یاد دلاتی رہیں کہ پاشو میاں سے ضرور ملنا۔ لیکن اس نے دوسرے دن پر اس کام کو اٹھا رکھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ پاشومیاں سے ملنے کے لیے چلا گیا تو اس کی بیوی
 بڑے چاؤ سے سب درختوں کو پانی دیتی رہی۔۔۔ منہ تک لبالب سہرا ہوا حوض
 آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا۔۔۔ اپنے پلو کو اپنی کمر کے گرد لپیٹے وہ خوش خوش باغبانی
 میں مصروف ہو گئی۔

ہندوستان کے نقشے پر دریاؤں کی نشان دہی کرتی ہوئی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیروں
 کی مانند درختوں کی آبیاری کرنے والی نالیاں سارے باغچے میں پھیلی ہوئی تھیں۔
 وہ پھاڑے سے مٹی کرید کر ایک نالی کا منہ بند کر دیتی اور بستے ہوئے پانی کا رخ
 تیزی سے بدل جاتا اور درختوں سے چھنتی ہوئی سنہری دھوپ میں ایک روپہلی لکیر
 بہت ہی اطمینان سے بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح درختوں کے تنوں میں پنچ جاتی
 اور پھر اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش سے یہ روپہلی بل کھاتی ہوئی ناگن دوسری
 جانب چل پڑتی۔۔۔ روپہلی ناگن کا یہ قص کافی دیر تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ
 آدھے سے زیادہ حوض خالی ہو گیا اور تمام درخت ٹھنڈا میٹھا پانی پی چکے تو اس نے حوض
 کے نچلے سوراخ میں ڈاٹ ٹھونس کر پانی کی دھارا کو روک دیا۔

کیلے کے پیروں کی بات جداتھی۔ ان کے لیے ایک بھر پور حوض الگ تھا اور بلاشبہ
 غیسر وہ اس کی ایک ایک بوند کے مالک تھے۔۔۔ پلو کی گرفت کو کمر میں اور مضبوط کرتے
 ہوئے وہ دوسرے حوض کی طرف بڑھی تو بڑے بڑے نرم پتوں نے اس کے کالوں کو
 پیچھے ہٹاتے ہوئے جیسے جبک کر رازدارانہ انداز میں اس کے کانوں میں کہا تم
 بہت اچھی ساتھی ہو۔ ہم اپنے تمام خزانے تمہارے لیے اگل دیں گے اور اس نے سسک کر
 بہت ہی پیار سے پتوں کو ہلاتے ہوئے جبک کر حوض کا ڈاٹ نکال لیا۔

اُجلی پرچائیاں
پانی کی تیز دھارا نالیوں سے ہو کر ایک ایک ٹیر کو گدگدانی لگی۔ بالکل اس طرح جیسے تازہ لہو شربانوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور جو بالیدگی کے لیے ضروری ہے تازگی کے لیے ضروری ہے۔

قیں قیں قیں ندی سے آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے بطخیں کہہ رہی تھیں۔ جالی دار مجلس میں جو چھوٹا سا حوض ہے اس کی ہم ہی کا وتنا مالک ہیں۔ اور وہ سوچنے لگی۔ دھنکی ہوئی رونی سے بنی ہوئی یہ رانیاں اپنے پیٹ میں بہت سے انڈے چھپائے جب اس مجلس میں داخل ہوں گی تو باغچے کی وہ نالی بھی اس طرح خشک نہ رہ سکے گی جو اس چھوٹے سے حوض سے ملی ہوئی ہے اور جس کا اب کوئی پیرسان نہیں ہے۔

قیں قیں قیں۔ ہم آرہی ہیں۔ قیں قیں قیں۔ اور اس کی نظریں ڈر بے کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ پل پر سے ہو کر پاشومیاں کے پاس پہنچا تو وہ ہزاروں بطخوں میں گہرا ہوا پسو بھر بھر کر جوار بکھیر رہا تھا۔

قیں قیں قیں کرتی ہوئی بطخیں ایک دوسرے سے گدگد ہو رہی تھیں۔ دوسری بہت سی ٹولیاں ندی میں اتر گئی تھیں۔ بعض کناروں پر خچ خچ خچ میں مصروف تھیں۔ مین کے سائبانوں کے سامنے چوتھرے پر انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں دھری ہوئی تھیں جن پر غالباً نظرانہ لگنے کے خیال سے پاشومیاں نے کپڑے اڑا رکھے تھے۔ بکھری ہوئی جوار کا ایک دانہ بھی زمین پر نہ بچا تو پاشومیاں نے تیلال کو پکار کر پوچھا پختہ سائبان والی بطخیں نالے میں اتاری گئیں یا ندی میں۔

اُجلی پر چھائیاں

اُجلی پر چھائیاں

بیری کا دھواں اڑاتے ہوئے ایک دبلے پتلے نوجوان نے آواز دی تھیاں

نالے میں ہیں جی، نالے میں۔“

”تو پھر صھائی کہاں مر گیا ہے رے۔“

”اندر اُٹھ سے چن رہا ہو گا۔ اور تیاں منہ ہی منہ میں کچھ بڑھاتا ہوا

دھواں اڑانے لگا۔

پاس کے سائبان سے آواز آئی۔ ”بیٹھے بٹور رہا ہوں بابو۔

بعضے بعضے ٹوٹ گئے ہیں۔“

پاشومیاں نے ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”بے وہ ہندوستانی بچے

دن بھر سی کرتا رہے گا۔ اور جو تیری مائیں یہاں کھڑی قین قین لگا رہی ہیں یہ اگر

نالے میں انٹرپریس تب دوہری محنت کرنے کیا تیرا پاپ آئے گا۔“ پاشومیاں نے

اس کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تو وہ ٹھٹھا ہوا نالے کی طرف بڑھ گیا۔

کل تک اس کو معلوم نہ تھا کہ ندی سے چالیس پچاس قدم پر ہی اتنا بڑا سخت

نالہ بھی ایک ہی سمت ندی کے متوازی بہتا ہے۔ نالے میں پاشومیاں کی بطنیں

دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گردنیں پانی میں ڈبوئے دیں اوپر اٹھا اٹھا کر وہ بالکل

سفید سفید اور رنگ برنگی اونڈھی اونڈھی صراحیوں کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہی

تھیں۔ لیکن یہ اونڈھی صراحیوں کی طرح نہ رہ سکتی تھیں بلکہ دیکھتے کے

دیکھتے قین قین کرتی ہوئی بٹیں بن جاتیں اور اچھی خاصی دوسری بٹیں اونڈھی اونڈھی

صراحیوں کا روپ دھار لیتیں۔

وہ منٹ دو منٹ خاموش کھڑا ہوا تیاں کی ماؤں کے کرتب دیکھتا رہا۔

اُجلی پرچھائیاں
پاشومیاں کی زبان میں جب وہ صمدانی کی مائیں تھیں تو یہ تیاں کی مائیں ہوں گی،
اور وہ سوچے لگا کر آدمی تو بالکل بدتمیز اور جاہل مطلق معلوم ہوتا ہے۔

ہمش ہمش ہمش۔ صمدانی کی مائیں نالے کی طفرے پر جو رہی تھیں۔ اور تیاں
اپنی ماؤں کے حقوق کی حفاظت کر رہا تھا۔ اور صمدانی کی مائیں پکار رہی تھیں
۔ قیں قیں قیں قیں۔ راستہ کیوں روکتے ہو تیاں۔ ہمش ہمش ہمش
۔ قیں قیں قیں۔ تو پھر ہمارے فرزند صمدانی کہاں ہیں۔ اور ایک چلکی
دارھی والا آدمی نکر اور بنیان پہنے انڈوں کی ٹوکریاں لالا کر چوتھے پر چار ہاتھا، اور
پاشومیاں مچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چڑھ منہ میں دبائے سائباں کے پاس کھڑی ہوئی
ایک صفائی والی سے چیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

صفائی والی اپنی لوہے کی ٹوکری میں ایک موٹی سی جھاڑو رکھے اپنے کولہوں
پر ٹوکری کو ٹھکائے کن انکھیوں سے انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کو دیکھ رہی تھی
لیکن پاشومیاں اس لوہے کی ٹوکری کو نازک نازک انڈوں سے بھر دینے کے لیے تیار
نہ تھیں کیوں کہ ٹوکری لوہے کی تھی اور انڈے بہت نازک تھے اور پاشومیاں سستی کا
سب سے بڑا بیوپاری تھا اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی عورت ایک صفائی والی
تھی جو زیادہ جوان بھی نہ تھی۔

صمدانی اپنے کام سے فراغت پاچکا تو اپنے انتظار میں ٹھہری ہوئی بطنوں کو
ہانکتا ہوا ندی کی طفرے چل پڑا۔ قیں قیں قیں جیسے کہہ رہی ہوں بہت دیر
ہو گئی صمدانی اور پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی بے شمار بطنیں جلدی جلدی پھٹ پھٹ
پھٹ کرتیں۔ ملہتیں جھولتیں، ندی کی طفرے چل پڑیں۔

اجلی پر چھائیاں اجلی پر چھائیاں

سائبان کے پاس کھڑی ہوئی صفائی والی ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے ہاتھ میں ٹوکری پکڑے ہوئے سائبان میں چلی گئی تاکہ بطخوں کی رات بھر کی بیٹ صاف کر دے اور پاشومیاں لمبے لمبے کش بھرتا ہوا چبوترے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پاشومیاں کے قریب پہنچ کر بے وجہ مسکرا دیا۔

”غالباً سیٹھ پاشومیاں آپ ہی ہیں۔ مجھے کچھ بطخوں کی ضرورت تھی۔ معلوم ہوا کہ بستی بھر میں واجبی دامنوں پر آپ ہی سے معاملہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں سیدھے آپ کے پاس چلا آیا۔“

”نہیں صاحب آپ پہلے چار جگہ قیمتوں کا اطمینان کر لیجئے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی سیکر دام واجبی ہیں یا نہیں۔“ بہت ہی مسکراتے ہوئے پاشومیاں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”مگر آپ کے دام مجھے معلوم ہو جائیں اور پھر ویسے بھی ایک دوسرے پر اعتماد ہی سے دینا چلتی ہے۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”کس لیے چاہئیں آپ کو بطخیں۔“ میرا مطلب ہے کیا آپ کو انڈے والے جانور کی ضرورت ہے یا کچھ ان کے لیے چاہیے؟

اور اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”دیکھیے پاشو سیٹھ مجھے کچھ ایسا بڑا دھندہ تو نہیں کرنا ہے۔ بس انڈے والی بطخیں چاہئیں جس سے میں آہستہ آہستہ کچھ پیدا کر سکوں۔“

”تو پھر میں آپ کو نالے میں کے تیار جانور دوں گا جو پٹھانچٹ انڈے دیتے

اُجلی پر چھائیاں

اُجلی پر چھائیاں

رہیں۔ اور ابھی جو جانور زندگی کی طرف گئے ہیں ان میں ریان تر پٹھے ہیں۔ کھانے کے لیے ان کا گوشت لذیذ ضرور ہوتا ہے لیکن انھیں اٹنوں پر آنے کے لیے بہت دن چاہئیں۔ تو پھر فرمائیے کتنا جانور چاہیے آپ کو؟

”لیکن آپ نے دام کا تعین نہیں کیا۔۔۔ دام معلوم ہو جائیں تو کل آکر میں حسب ضرورت لے جائوں گا۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ فیسے بھی اب جانور شام تک ہاتھ نہیں آنے کا۔ پانی میں اترا اور بس سے باہر ہوا۔ لیکن ذات بڑی مند ہے۔ دیکھ بیارہی سے بالکل بری۔ مرغیوں کی طرح نہیں کہ وہ اُجلی اور چٹ پٹے ب غائب۔ آپ کی خاطر ۳۶ روپے درجن کے حساب سے چھانٹ کر دے دوں گا۔ پہلے تو ان داموں میں آپ کو ایسا جانور ملے گا نہیں اور پھر کرسمس قریب ہونے سے اب دام بھی چڑھ جائیں گے۔ میری رائے میں یا تو آج کل ہی میں اٹھ لیٹے یا پھر مہینہ دیر میں وقف کیجئے۔ لیکن بعد میں بھی آپ کو ان داموں سے کم کیا ملے گا۔ پاشو میاں نے مسکراتے مسکراتے ایک ہی سانس میں اتنی سب باتیں کہہ دیں۔

”تو پھر یہ قطعی دام ہیں؟ کی کی کوئی گنجائش ہی نہیں؟“

نہیں صاحب آپ چار جگہ اور اطمینان کر لیجئے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ پوری طرح یقین ہو جائے تب تشریف لائیے اور درجن۔ دو درجن۔ وں درجن جتنا چاہیے اٹھا لیجئے۔ زور نہ ظلم۔ سو دام رضی سے ہونا چاہیے۔ ہے نا صاحب۔ دغا فریب تو ہے نہیں۔۔۔ دور وزہ زندگی ہے تو یہ سب کس کے لیے۔ آپ اطمینان سے آئیے اور جب چاہے آئیے۔

اُجلی پر چائیاں
مصافحہ کر کے رخصت ہوتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ آدمی معاملے کی حد تک سید
معلوم ہوتا ہے۔

تیس تیس تیس۔ اور اس کی نظریں نالے میں چل کر رہی ہوئی بطخوں پر جم
گئیں۔ پتہ نہیں ان میں کون کون سی کھجوریں آئے والی ہیں۔ وہ چلتے
چلتے گھڑی بھر کے لیے رک گیا اور غور سے دیکھتا ہوا اپنی پسندیدہ بطخیں ذہن میں
محفوظ کرنے لگا۔

کافی سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد جب انہوں نے اپنی رقم پر اس
سے نکالی تو اس میں جملہ ۸۰ روپے تھے۔ چار درجن بطخیں خرید لی جائیں تو ایک سو
چوالیس روپے صرف ہوتے ہیں اور صرف تریالیس روپے باقی رہتے ہیں۔
وہ لیے گھر کی ضروریات کے لیے انہیں فی الوقت کچھ خیر نہاد تھا البتہ اس کی
بیوی کے لیے روزمرہ استعمال کی دو تین ساڑیوں اور بلوز کی شدید ضرورت تھی جس کے
لیے کم از کم ساٹھ پنسیٹھ روپے درکار تھے۔ آخر شش پہلے پایاکہ دو ساڑیاں اور
دو بلوز چالیس روپے کے اندر تیار کر لیے جائیں اور تین درجن بطخیں خرید لی جائیں۔ بطخوں
کی جوار کے لیے تین چار روپے علیحدہ نکالنے ہوں گے اور اس طرح تیس تیس روپے
بچ رہیں گے جو دوسری اتفاقی ضروریات کے لیے کافی ہیں۔ مہینہ بھکے غلے کا صرفہ
اس رقم کے علاوہ ان کے پاس محفوظ تھا۔

اس کے والد ایک بڑی جاگیر کے عہدیدار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے
لو کوئی اچھی سی خدمت مل جائے جس سے وہ کھاپی کر زندگی بسر کر سکے۔
لیکن دفتر دفتر کی خاک چھاننے پر بھی ان کے بیٹے کو کوئی ایسی دسی نوکری بھی

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

زل سکی۔ آخر تیش پندرہ روپے ماہانہ کا ایک مکان کرائے پر لے کر اس کے والد نے اپنی مہربانی کو بدلہ ہی میں بٹھرا دیا کہ وقتاً فوقتاً وہ تلاش روزگار میں مصروف رہ سکے کیوں کہ ان کا اپنا رہنا سہنا تو زیادہ تر گھاؤں ہی پر رہتا تھا۔

گذر بکریے وہ اس کے اس حد تک کفیل ہو سکتے تھے کہ وہ اور اس کی بیوی خالی پیٹ نہ رہ سکیں۔ سوانہوں نے اپنی طرف سے دریغ نہ کیا۔ اس سے زیادہ وہ کمر بھی کیا سکتے تھے۔ پیٹ بھر کر بچے تھے انھیں اور پھر ایک نہیں دو دو بیویاں۔ تین کنبوں کی پرورش کی ذمہ داریاں ایک جان پر تھیں۔ مہی سوچ سوچ کر اس کا جی مسو ستار رہتا کہ کسی طرح اپنا بوجھ آپ اٹھا لینے کے قابل بن جائے اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ اس کی مال چاہتی تھیں کہ ان کی اپنی بہن کی لڑکی مہربان کر لائی جائے سو وہ نہ ہو سکا تھا۔

والدین کی پہلی ہی خواہش کو رد کر دینے کے بعد اس کا یہ احساس اور شدید ہو گیا تھا کہ اپنے پیر پر کھڑا ہو جائے۔ اپنا بوجھ آپ اٹھالے۔ احساسات کی شدت سے اس کے دماغ میں ایک گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب یہ احساس شدید تر ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے مخالفین اس کی کمزوریوں پر ہنس رہے ہوں گے اور اس کی یہ کمزوری خاندان بھر میں موضوع بحث بنی ہوئی ہوگی۔

شہر سے دور اس چھوٹی سی بستی میں آکر وہ اس لیے سچی مطمئن تھا کہ نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا دھندہ ہی کر دیکھے گا۔ ویسے ایک اچھے خاندان کا فرد ہونے کے باوجود اس نے کسی معمولی سے معمولی کام میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ بس اس کی ایک ہی خواہش تھی، ایک ہی آرزو تھی اور وہ یہ کہ خود کچھ کرے، خود

اُجلی پرچائیاں اُجلی پرچائیاں

کو اس سلیقے سے سجایا ہے کہ محلہ کا کوئی آدمی اپنے پیسے بچا کر سامنے سے نہیں گزر سکتا۔
دوسرے دن سے اس نے محسوس کیا کہ اس کے لکڑی کے ڈبے میں محفوظ ہونے والے دو دو پیسے گرین ہوٹل کے خوبصورت سے کیش بکس میں جمع ہو رہے تھے۔

شام کو اس نے اپنی منیگتر سے کہا۔ ”میرے خیال میں کل قمیص اور کوٹ کا پٹر اچھے نہیں خریدنا چاہیے۔ پتہ نہیں ہمیں اس سے اہم کوئی کام پڑ جائے کیوں کہ دو تین روزہ گرا کر ایک بالکل بیٹھ گیا ہے۔“

پٹھی پٹھی آنکھوں سے اس کی منیگتر نے اس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا کیا ایک ایسا کیوں ہو گیا ہوگا۔ مگر آپ یقین کیجیے۔ چو نے میں دی میں نے اپنے ہاتھ سے ملایا تھا۔ کتھے میں دودھ، لونگ کے پھول اور الائچی کے جھلکوں کے سوا اب کے تو سالم الائچیاں بھی ملائی گئی تھیں۔ اور جوش دے کر میں نے ہی اس کو چھانا تھا اور ”مڈی“ تو بالکل پھینک دی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم سچ کہتی ہو۔ پان کے مزے کی بات نہیں ہے گرین ہوٹل میں ایک نیا پنواڑی آیا ہے جس نے پان کی لذتیں بھی دکان کے حصّے میں لگا دی ہیں۔ شوکیس کیا ہے ایک بولتا ہوا جادو ہے۔ پہلے جادو اثر کرتا ہے بعد میں گاکا پان چباتے ہیں اور ہمارے یہاں بات بالکل الٹی ہے۔ گاکا پہلے پان چباتے ہیں تب کہیں کتھا اور چونا اثر کرتے ہیں لیکن چوں کہ پان چانے سے پہلے ہی خوبصورت الماریاں گاکہوں کو چبا ڈالتی ہیں اس لیے ہم گھاٹے میں ہیں۔ اور اس کی منیگتر کچھ سوچتے ہوئے داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی تھی۔

چوتھے دن صبح وہ پورے ایک سو آٹھ روپے لے کر پاشومیاں کے پاس پہنچا

تو وہ مین کے سائبان کے سامنے کھڑے جواز ملوا رہے تھے۔ ساری کی ساری لٹخیں سائبان میں بند قیں قیں شور مچا رہی تھیں۔

اس کو دیکھ کر پاشومیاں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”تو پھر آپ آگے صاحب۔“ اور اس نے بغیر کسی تامل کے روپے ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا بہت پیاری پیاری اور خوبصورت لٹخیں جن دیکھے سیٹھ صاحب۔ سب کی سب بھکے سفید مہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔

پاشومیاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سب کی سب سفید لٹخیں لے کر یہ کیجیے گا۔ مختلف رنگ کی ملیں گی لیکن اچھی اچھی جن دوں گا۔“

اور انھوں نے پھارا۔ متیال اور متیال۔ ذرا یہ تالا کھولنا اور متیال نے پھٹ سے دروازہ کھولا اور قیں قیں کی آوازوں سے پوری فضا گونج گئی۔ اور چو کھٹ پھلانگتی، گرتی، سنھکتی بے شمار لٹخیں دیکھتے دیکھتے کھلے میدان میں جمع ہو گئیں جیسے وہ بہت بڑا لیدر ہے اور سب کی سب اس کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہیں۔

پاشومیاں نے متیال سے کہا۔ ”اس کا پیٹ بہت جھک گیا ہے۔ ذرا اس کو پکڑنا تو، اور متیال نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ایک لٹخ کو دبوچ لیا۔ قیں قیں قیں قیں۔ سفید رنگ، پشت پر ہلکے سیاہ بے ترتیب دھبے، بہت حسین پیاری پیاری۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

ہاتھ بڑھا کر پاشومیاں نے متیال سے لیتے ہوئے دوسری طرف اشارہ کیا۔ قیں قیں قیں قیں قیں قیں قیں۔ بالکل سفید، دھنکی ہوئی روئی کی طرح دھان پان۔ پیٹ بیٹ میں اٹا ہوا، جس میں بہت سے اٹھڑے محفوظ ہوں گے۔

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں

ان دونوں کو دلوچ لے شیرو۔ قینوق، قینوق۔ نر خروں پر نیاں کی
گرفت سے آوازیں حلق میں گھٹ گئی تھیں۔ پیٹھ پر سرئی رنگ کا ایک بڑا سا جبہ
اور آدمی سے زیادہ چرچ سیاہ۔ بچھوؤں پر کالے کالے دھبے اور پھر سفید۔
پاؤں سیکڑے بالکل اس طرح لٹک رہی تھی جیسے بیا کے گھونسلے اُلٹے لٹک رہے
ہوں۔ کافی دیر تک یہ پکڑ دھکڑا چلتی رہی۔ کسی کی گردن۔ کسی کے کپڑے
کسی کی ٹانگیں۔ پاشومیاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی پسند کی نشان دہی کرتا
رہا۔ لیکن پاشومیاں نے بعضوں کو پکڑا دیا۔ بعضوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ نر ہے
اور یہ اُندوں والا جانور نہیں۔ پاشومیاں بھرپور کا رتھا۔ اس نے عقیدتاً
اس کی بات مان لی۔

گرفتار کی ہوئی بطخیں جیل میں ٹھونس دی گئیں اور بین کے سا بُان کا دروازہ
پھر سے بند ہو گیا۔ ان میں تیس مادہ ہیں اور چھ نر۔
ایک برقی رو اس کے دماغ میں چکر کاٹ کر نکل گئی۔ واقعی ہم نے اس مسئلہ
پر غور ہی نہیں کیا۔ اگر وہ درجن بھر نر ہی دے دیتا تو۔ لیکن وہ اپنی
ناخبرہ کاری کو چھپاتے ہوئے بے تکلف بول اٹھا۔ چھ نر تو بہت ہیں پاشو سیٹھ
صرف چار ہی نر دیتے اور بقیہ سب ماریں۔

لیکن پاشو سیٹھ نے تجارت کے اصول اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ہر درجن میں
دو نر ضرور ہوتے ہیں۔ عام بات ہے۔ آپ اطمینان کر لیجئے اور پھر صاحب آپ کے
اور ہمارے لیے چار نکاح جائز نہیں۔ ان کو ہم سے ایک ہی تو زیادہ ہے۔ کیا آپ ہر
نر کو پانچ دو ماریوں کی اجازت بھی نہ دیں گے۔

اُجلی پرچھائیاں
لیکن چھوٹے ہی اس نے جواب دیا پاشو سیٹھ آپ سمجھے نہیں۔ میں تو صرف
ایک نر کو پوری ۳۵ ماداؤں کی اجازت دینے کے لیے تیار ہوں۔

پاشو میاں بات سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے مجھ سے چوک ہوئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ
پانچ ماداؤں سے زیادہ کسی نر کو اجازت نہ دیجئے اور انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز
سے کہا۔ ورنہ انڈے کیسے دیں گی مادیاں۔ ایک نر تو مر جائے گا بے چارہ۔
مستی کے انڈوں سے بچے تو نکلنے سے رہے۔

بات ختم کرتے ہی پاشو سیٹھ نے تیاں اور صہدانی سے اس کے گھر کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا ٹانگیں باندھ کر، ٹوکروں میں صاحب کی بطخیں سامنے والے مکان میں
پہنچا دو۔

بطخیں ٹوکروں میں رکھ دی گئیں تو پاشو میاں نے اس کو رخصت کرتے ہوئے
کہا دو تین روز گھر ہی میں بند رکھیے۔ روزانہ دو وقت چار سیر چار بہت کافی ہے
دو تین روز میں گھسے مانوس ہو جائیں گی تو ٹانگوں کے پخلے پردوں پر نشان لگا کر
ندی کی سیر کرا لیجیے۔

بچوں کے پردوں پر نشان لگانے کا اگر کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو پاشو میاں
نے ٹوکروں سے ایک بطخ اٹھالی اور دائیں پنجے کی انگلیوں کے درمیان میں پردے
کو کچھ سوچ کر نہایت بے دردی سے چیر دیا اور خود اس کی اپنی انگلیاں بط کے
خون سے جھیک گئیں۔ دم سادھ کر بیٹھی ہوئی ریشم کی ننھی منی جان قیں قیں کرتی
اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے لگی۔

قیں قیں کی آوازوں کو ساتھ لیے جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی آنے والے

اُجلی پرچائیاں
ان مہانوں کے سواگت کے لیے دروازے ہی میں کھڑی تھی جن کا مسلسل تین روز
سے انتظار تھا۔ سروں پر دھسے ہوئے ٹوکروں کو دیکھتے ہی اس کی جھپٹ کھل
گئیں اور اس کی آنکھیں ان نئے ساتھیوں کے دیدار کے لیے چمکنے لگیں۔ اندر
پہنچ کر صمدانی اور نیال نے ٹوکروں کے زمین پر بے دردی سے اوندھادیے اور قیں
قیں کی آواز نے گھر سر پر اٹھا لیا۔

مسٹر ٹامی جو سپوٹے کے درخت کی چھاؤں میں ٹانگیں پھیلائے آرام سے
سو رہے تھے اس اچانک ہنگامے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قیں قیں میں اپنی
بے سُرری بھوں بھوں کا اضافہ کرتے ہوئے لپکے۔ صمدانی اور نیال کی اجنبی شخصیتوں
نے ان کی توجہ اپنی ٹنسر مرکوز کر لی، اور وہ شور مچاتی ہوئی بطخوں کو نظر انداز کر کے
انھیں دونوں پر غصہ اتارنے لگے۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ان ہنگاموں کی جڑ یہی
دو شخصیتیں ہیں۔

نیال اور صمدانی اپنا اپنا انعام لے کر چلے گئے تو اس کی بیوی نے بہت
ہی چاؤ سے پچکار تے ہوئے ان گدڑ بطخوں کو الگ کر دیا اور بندھی ہوئی ٹانگوں
کی سٹنلی کو کاٹ کاٹ کر انھیں صحن میں چھوڑتی گئی۔

قیں قیں قیں قیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ تم نے
ہمارے پاؤں کی زنجیریں کاٹ دی ہیں۔ قیں قیں قیں۔ ہمارے بیٹوں صمدانی
اور نیال نے غالباً ہمیں تمہارے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ قیں قیں۔ لیکن
ہم تم سے خفا نہیں ہیں۔ اور مسٹر ٹامی اس ختم نہ ہونے والی قیں قیں سے
جھجکا کر ان پر لپکے۔

اُٹلی پرچھائیاں

اُٹلی پرچھائیاں

اپنے پروں کو زور زور سے ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی یہ مچلی گول مول سپریاں
اپنے بھاری بھرکم بدن کو زمین سے بہت اونچا اٹھا لینے کی کوشش میں خود مامی ہی
پر گر پڑیں تو بولنے ہوت ہات کمرے مامی کو بھگادیا اور قیں قیں کا شور مچا ایک بار پورے
نور شور سے بلند ہوا اور مامی کی درندگی کے خلاف شاندار مظاہرہ کیا گیا۔

اس کی بیوی مامی کی اس جسارت کو برداشت نہ کر سکی اور مسٹر مامی کنبے سے
باندھ دینے گئے اور نہایت اطمینان سے درختوں کے تنوں میں بھگی ہوئی مالیوں میں بچ
پنچ کریں نخل کی پوٹلیاں سارے باغچے میں لڑکھنے لگیں۔

اس کی بیوی کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر اس کی مسرتیں دو بالا ہو گئیں۔

سوپا میں حیار لیے آؤ آؤ کے نغمے بکھرتی جب وہ شاداں و فرحاں صحن میں جوار کی
بارش کرنے لگی تو قیں قیں کرتی ان ساری کی ساری مچلی پوٹلیوں نے کچھ ذرا پس پیش
کرنے کے بعد اس کو بے تکلف گھیر لیا اور وہ گلاب توڑ کر ٹوکری میں رکھتا ہوا اس منظر کو ٹری
پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

پانچویں دن صبح کو معمول سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ رضائی پھینک کے
اٹھ بیٹھا۔ اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کہاں چلے آپ، اور تیکے کے نیچے
سے سوٹر نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔ سوٹر مینتے ہوئے اس نے پوچھا۔
تم جاگ گئیں آخر۔

ابھی ابھی لٹخوں کو دیکھ کر آئی ہوں۔ اند اتو ایک بھی دکھائی نہ دیا۔ اس
کے ساتھ ہی وہ سبھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جالی دار محل سرکار دروازہ کھول دیا گیا تو چوہنیں جالی کے باہر نکال کر قیں قیں

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں
کرتی ہوتی بطخوں کی قیادت میں سب کی سب نئی نئی دلہنوں کی طرح شرماتیں لجاتیں سہمی
سہمی باہر نکل آئیں۔

قیں قیں قیں۔ جیسے اٹھ دے نہ دینے کے لیے معافی مانگ رہی ہوں۔
اس کی بیوی نے آج وقت مقررہ سے پہلے ہی درختوں کو پانی دینا اس لیے مناجا
سمجھا کر کل دن بھر اس کی بطخوں نے چوں کندی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اس لیے کم از کم
بہت سی نالیوں ہی میں ان کے اشنان کا انتظام ہو سکے۔

کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے حوض کا پانی چھوڑ کر اس نے محل کی پوٹیلوں
کو اس طنز ہانک دیا اور خود گلاب ٹوڑنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔
”آج پھول والے کی دکان سے واپسی میں۔۔۔ میں ذرا پاشومیاں کی
طرف بھی ہوتا ہوں تاکہ اس کے مشورے سے کسی نہ کسی طرح اپنی بطخوں کو نندی بھیجے گا
انتظام ہو سکے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ پانی ان کے لیے ضروری ہے۔ دیکھئے نا اب
کس قدر چیل میں ہیں۔۔۔ اس کی بیوی نے کیلے کے درختوں کی طنز ہاتھ اٹھاتے
ہوئے کہا اور اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے دو تین بڑے بڑے گلاب
اس کے بالوں میں اڑس دیئے۔“

قیں قیں کرتی نرم نرم تھکی سٹی بطخوں کے بہت پاس کھڑی ہوئی اس کی بیوی
بورے پر جوار بکیر رہی تھی۔۔۔ وہ اٹھ دوں پر تاریخ درج کر کے انھیں ایک چھوٹی
سی ٹوکری میں رکھ چکا تو اس کی بیوی نے اس سے کہا۔۔۔ پاشومیاں نے جو بات
کہی ہے اس میں صداقت ضرور ہوگی۔۔۔ یہاں مقام ہو تو واقعی نا مانوس ہونے سے

جانور خائف ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دو کی بجائے چھ اٹڈ نے کل جائیں۔
مسٹر ٹامی دم ہلاتا بطخوں کے قریب سے گزرنے لگا تب بھی وہ اطمینان سے جوار
کھاتی رہیں۔ نہ قیس قیس کا شور بلند ہوا اور نہ خود ٹامی نے بھون بھون کرنے کی زحمت گوارا کی
— کیوں کہ ان میں سمجھوتہ ہو چکا تھا اور مسٹر ٹامی سمجھ چکے تھے کہ اب یہ بھی برابر
کی حصہ دار ہیں۔

ساتویں دن اس کی بیوی کا اندازہ صحیح نکلا۔ محل سرا کی شہزادیاں باہر نکل کر
چہل قدمی کرنے لگیں۔ اس نے جالی دار محل سرا میں داخل ہو کر پانچ اٹڈ سے چن
لیے اور ان کو لگی ہوئی بیڑا احتیاط سے دھونے کی تاکید کرتے ہوئے بوا کو دے دیے۔
دھو دھلا کر پاک صاف اٹڈوں کو بوانے اپنے پلو سے خشک کر دیا تو وہ ان پر
بدستور تاریخ ڈال کر ٹوکری میں رکھ آیا۔

اس کی بیوی حوض کی منڈیر پر کھڑی گلاب کی اونچی ٹہنی کا آخری پھول توڑ چکی تو
اس کے گالوں کو پھولوں سے سہلا کر اس نے اس کے بالوں میں گلاب سجا دیئے۔
ہلکی سردیوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ کل اس نے
چھ آنے کے بجائے آٹھ آنے میں پھول بیچ لیے تھے اور آج آٹھ دو آنے زیادہ ہی
مل جانے کی امید تھی۔ سائیکل کے ہینڈل پر بیٹھی ٹانگ کر وہ چل پڑا تو نظروں سے
اوجھل ہونے تک اس کی بیوی اس کو کھڑکی میں سے دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ سب کی سب اپنے جالی دار محل میں بیٹھ کر گپ شپ لڑا رہی
تھیں تو وہ بلیڈ ہاتھ میں لیے آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر گھس گیا
اس ناگہانی آفت سے محفل میں ایک ہڑبونگ مچ گئی لیکن اس نے جی کڑا کر کے ان میں

اُجلی پرچھائیاں
 سے ایک کو دلوچ لیا اور داپنے پنجے کے درمیانی مہین سے پردے کو بلٹڈ سے تراش
 دیا۔ ایک کے بعد دوسری کی باری آئی اور دوسری کے بعد تیسری کی اور یہی
 عمل کوئی پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کا ہاتھ لہولہاں ہو گیا
 تھا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ کل جب وہ انھیں ندی میں اتارے گا تو سب کی سب اسے
 معاف کر دیں گی۔

اس دن سے روزانہ انڈوں کی تعداد میں اضافہ ہونا لگا۔ آٹھویں دن
 سات — نویں دن بارہ — اور دسویں دن ایک دم اٹھارہ لیکن گیارھویں دن
 یہ تعداد یکایک گھٹ کر صرف تین ہو گئی۔

گیارھویں دن صرف تین انڈے نکلے تو اس کی بیوی نے اس بات پر یقین نہ کیا
 اور بوا سے بھاتی ترکاری کا حساب لینا چھوڑ کر وہ رسوئی گھر سے نکل آئی۔ اس کو تیز
 تیز اس طرف آنا ہوا دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کا غلط مفہوم لیتے ہوئے
 اس کی بیوی نے کہا مجھ کو یقین تھا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن بہت جلد
 وہ جان گئی کہ وہ صرف اس لیے ہنس رہا تھا کہ اس کی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی۔

حوض پر بیٹھا وہ انڈے دھونے لگا تو اس کی بیوی نے حوض کا پانی چھوڑ دیا
 اور دیکھتے دیکھتے ایک روپہلی ناگن ایک نالی میں بل کھانے لگی۔ اور قیں قیں کرتی
 ساری لٹخیں اس روپہلی ناگن پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کی بیوی نے اس کی دل کی کیفیت
 سے نا آشنا اپنے ہی حال میں مگن چلی چلی لٹخوں کو رحم طلب نظروں سے کچھ اس انداز
 سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سب کی سب مسلسل تین روز سے ندی کا سیر کر رہی ہو
 اور وہ دن دن بھر دھوپ میں بیٹھے ستھاری رکھوالی کرتے ہیں اور میں یہاں بات

اُجلی پرچھائیاں
 کرنے تک کو ترس جاتی ہوں۔ اتنے دن کے بعد کل جب شدید بارش ہوئی تو وہ
 سکرپاؤں تک بھیگے ہوئے گھر آئے تھے، لیکن آج تم نے اُٹھ کر کر دیئے۔
 شام کو جب وہ اپنی قیس قیس میں کاکورس نکاتی ہوئی فوج لے کر گھر پہنچا تو زینو جانی
 بھی اس کے ساتھ تھے۔ زینو جانی کی غیر متوقع آمد پر وہ آداب و سلام کے اخلاقی فرائض
 تک بھول بیٹھی اور سہجائی اور بچوں کی بجائے جھٹ سے اس نے زینو جانی سے اپنی باتوں
 سے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔

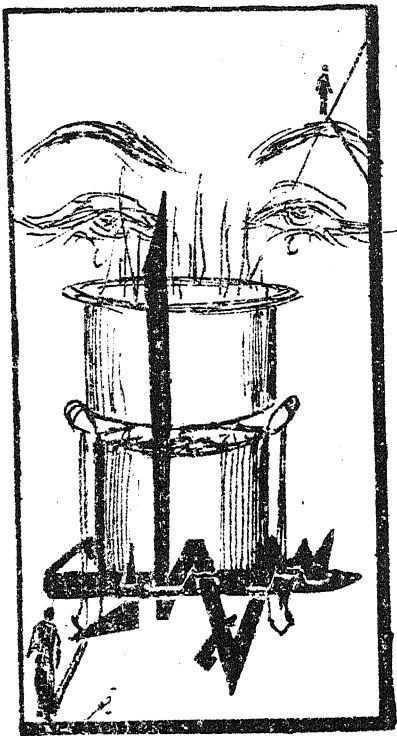
وہ بے ساختہ ہنس پڑے اور بہت ہی مشفقانہ انداز سے کہنے لگے: ”تم میاں بیوی
 نے یہ بہت اچھا کام کیا۔ یہ جانور بڑا منفعت بخش ہے۔ مجھے ان دوسالوں میں زراعت سے
 زیادہ اسی دھندے میں فائدہ ہوا۔ اب تو اپنے گاؤں کے قریبی تعلقوں اور ضلع میں بھی
 میں ہی اُٹھ سہلائی کرتا ہوں اور پھر یہاں ندی کی وجہ سے تمہیں تو آسائیاں ہیں۔
 باتیں کرتے کرتے وہ سامنے رکھی ہوئی بٹ میں سے آستین چڑھا کر بھیگی ہوئی جوار نکال نکال کر
 بچھے ہوئے بوسے پر پھینکنے لگے تو قیس قیس کرتی منظرِ بطینس جوار پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ چپکے سے
 ن کے پاس بیٹھ گئے اور پکڑ پکڑ کر ایک ایک کو دیکھنے لگے۔ بچوں کے نیچے ابھری ہوئی چڑے
 لگے ٹھیلوں کو دبا دبا کر وہ نہایت غور سے دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے
 نا بشارت غائب ہوئی گئی۔

قیس قیس کی آوازوں کے سوا کسی نے کچھ دیر بات تک نہ کی۔ بہت ہی
 بی ہوئی آواز میں زینو جانی نے کہا چارچھو کو چھوڑ کر سب کی سب بوڑھی ہیں۔
 یل وقتے سے ایک دو جھول میں کچھ اُٹھ دے دیں گی۔ کس سے خریدی ہیں تم نے
 بچھ بطینس۔ بیچنے والا بڑا گھگھ معلوم ہوتا ہے۔ بے ایمانی کی حد کو ہی لچنے۔ اور

اُجلی پرچھائیاں
اس کی بیوی سوچنے لگی کہ اپنی دل کی دنیا کو اُس نے جس دھرتی پر رکھا تھا اس دھرتی کے
پنچے بے شمار لرزے چُپے ہوئے ہیں اور جن کو کسی انسان ہی نے چھپا رکھا ہے۔

صبح کو وہ اٹھے تو ایک انڈا بھی ہاتھ نہ لگا۔ پھول توڑتے ہوئے اس کی بیوی
نے کہا۔ ”کل دن میں آپ کے ندی پر جانے کے بعد مکان دار صاحب آئے تھے
کہہ رہے تھے کہ دو چار دن میں آکر وہ کیلے کی پھنیاں لے جائیں گے۔ البتہ آئندہ سال
آدھا میوہ ان کا ہوگا اور آدھا اپنا۔“

ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے حسب معمول تین چار بڑے بڑے
گلاب اپنی بیوی کے بالوں میں سجادیئے تو اس کی بیوی نے اس کے ہاتھوں کو اپنے
ہاتھوں میں لے کر انتہائی لجاجت سے کہا۔ ان کو بھی نیچ دیتے ہیں نا۔ لیکن پھر کچھ
سوچ کر ندامت سے اس نے گردن جھکالی۔ اور وہ نظریں نیچی کیے اپنے پاؤں کے
انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔



جب وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی تو چاروں کی خوشبو نے پہلے اس کا سواگت کیا
 بیسی داس ہری داس اگر ازل رات بھر اپنی بے ہنگم تو میرا اس کو دکھانا رہا۔ لیکن بیگم نو عمر ہونے
 ، باوجود مشتاق تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ بڑی توند والوں کو کس طرح رجھا یا جاسکتا ہے
 بیگم نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس لیے کہ سیٹھ بیسی داس، ہری داس اگر وال شہر کا
 ب سے بڑا غلے اور گرمی کا بیوپاری تھا پہلی بار جب بیگم نے سیٹھ کے ساتھ رات بسر کی تھی
 وہ اس کو اتنا خوش نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ اس بات سے واقف تھی کہ سیٹھ خوش ہو جائے تو وارک
 سے ہر معاملے کے لیکن باوجود خوشی کے وہ ٹیپہ پالتفات نہ کر سکی سیٹھ بیسی داس ہری داس اپنی انتہا
 سے قریب تر ہو جاتا تو بیگم کو ابھائیاں سی آنے لگتیں۔ مرد کے جسم کی حدت سے
 مکی بوسے، اس کے سانسوں کی گرمی سے بیگم غیب واقف تھی لیکن سیٹھ بیسی داس
 ، داس اگر وال سب سے مختلف تھا یا بیگم نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ وہ سب سے
 مناسب ہے۔ نہ اس کی سانسوں میں وہ حدت تھی جو عورت کے جسم کو کچھلا سکے، نہ بدن
 میں وہ گرمی۔ بچھا ہو کر وہ بیگم کے سامنے کھڑا ہو گیا تو بیگم نے نفرت سے منہ پھیر لیا

اُجلی پرچائیاں
رات بھر میں صفر ایک بار بیگم مشکل اس سے قریب ہو سکی تھی۔ وہ بھی اس لیے کرات
بھر کی قیمت چکانی تھی۔ پوچھنے سے پہلے ہی سیٹھ ہنسی داس ہری داس اگر وال چلا
گیا۔ جاتے وقت اس نے کہا۔

”بیگم تم سمجھتے ہو۔ ہمارا من نہیں بھرا بیگم۔ بیگم تم ہم سے پریم کرونا۔ ہم
تمہیں بہت نواہیں گے۔“

اور ایک نہیں دو نہیں پانچ روپے کے ایک نئے نوٹ سے سیٹھ ہنسی داس
ہری داس اگر وال نے بیگم کو نوازا بخشش کے طور پر رقم بیگم کے لیے کچھ معمولی نہ تھی لیکن
وہ صرف اتنا سوچ سکی کہ خوش نہ کرنے پر بھی سیٹھ جی نے پانچ روپے دیے ہیں لیکن
اب بھی سیٹھ سے اس کی نفرت کم نہ ہوئی۔ وہ کہے سے باہر چلا گیا تو لیٹر برپڑ کر بیگم نے آنکھیں
بند کر لیں۔ کبھی کچھوا، کبھی کیکڑا، کبھی لوہار کی دھونئی اس کے تصور میں گھومنے لگی۔ اس
وقت اس کا دماغ خالی خالی سا تھا۔ اس خالی خالی دماغ میں کہیں سے ایک پاؤں لگی
پکھال گھس آئی۔ پھر اپنٹا ہوا کچھوا، کانپتا ہوا کیکڑا، لمبی سسپس بھرتی ہوئی لوہار کی دھونئی
پاؤں لگی پکھال سب گڈمڈم ہو جاتے اور تنکا، سیٹھ ہنسی داس ہری داس اگر وال بیگم کو
رجاتا۔ ”بیگم ہم تم کو بہت نواہیں گے۔“

سیٹھ کی جیب سے بخشش کے طور پر پانچ روپوں کا نکل جانا بجائے خود ایک بھرہ
مقابلہ کو یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی اس کو ایک رنگیز سیٹھ سے سابقہ پڑا تھا۔ رزیدنسی
میں اس کی کوٹھیاں تھیں لیکن چلتے وقت اس نے چوٹی بیگم کے ہاتھ پر رکھی تھی تو بیگم نے
لوٹاتے ہوئے کہا تھا کہ اس چوٹی کو شہر کے سب سے زیادہ بخیل آدمی کو دے دو۔ اور
سیٹھ نے چوٹی اپنے ہی جیب میں محفوظ کر لی تھی۔ جب سیٹھ دروازے سے باہر نکلا تو

بدر بھائی نے اپنا انعام طلب کیا۔ سیٹھ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ بیگم نے اس کی جیب خالی کر لی ہے۔ بدر بھائی دروازے میں داخل ہوا تو بیگم نے کہا کہ بہت ڈنگیں مار رہے تھے بدر بھائی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں۔ دل کاغنی معلوم ہوتا ہے۔ انعام اکرام تمہیں اچھا ہی ملا ہو گا۔ بدر بھائی نے رنگریز کوماں کی کالی دی تھی لیکن کالی زبان سے ادا ہوتے ہوئے اس کا گلہ رند ہو گیا تھا۔ بیگم سمجھ نہ سکی تھی کہ بدر بھائی جو سارے ملک کی سیاست پر ماں کی کالی شامل کر کے تبصرہ کر دیتا ہے آج اتنا دل گیر کیوں ہے۔ بیگم نے صنفِ اتنا پوچھا کیا بات ہے بدر بھائی۔ لیکن بدر بھائی نے کچھ نہ کہا، جب بیگم نے بہت اصرار کیا تو وہ مسکرانے لگا اور اس انداز سے بات کہہ دی جیسے کچھ سواہی نہ تھا۔ کہنے لگا ”کل صبح سے کچھ کھایا پیایا نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس سیٹھ کو لے آیا تھا۔ سالا کہنے لگا ادھر دہلیز میں پاؤں دھرا نہیں کہ انعام و اکرام کی بات شروع کر دی۔ اب پوچھتا ہوں تو صاف جمل دے گیا حرامی“

لیکن آج رات بیگم نے سیٹھ منشی داس ہری داس اگر وال کو بہت خوش کیا تھا۔ سیٹھ جاکچا تو وہ پچھلی باتیں سوچتی ہوئی بستر پر انگرٹیاں لیتی رہی۔ غنودگی کے عالم میں کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہو کر کرٹیں لیتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ سوچنے لگتی کہ نیندا سے سچر دبوچ لیتی۔

جاگتے رہنے اور سوتے رہنے کی یہ درمیانی کیفیت بس ختم ہی ہوتی تھی کہ خوشبودار چاولوں کے بھپکے نے بیگم کو مسحور کر دیا۔ بیگم سمجھ گئی کہ سیٹھ منشی داس ہری داس اگر وال کے بھیجے ہوئے چاول اور گئی بٹوری شہزادہ بانی بڑی فراغ دلی اور بے دردی سے منسٹر کر رہی ہے۔ یہ چاول اس کے لیے سیٹھ نے تحفے میں بھیجے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ انہیں بہت حفاظت سے اپنے چھوٹے بھائی مہن تک پہنچا دے۔ جو ایک

اجلی پرچھائیاں

غریب پر ذرحاجی صاحب کے پاس روکے سوکھے ٹکڑوں پر گزربہر کر رہے ہیں۔ لیکن کھوسٹ شہر اتن تو جیسے اس کی مالکن نبی بیٹھی تھی۔ بیگم کی آنکھوں میں آنسو اٹھنے لگے۔ چادر کو ایک طرف مچھینک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ شہر اتن بانی سامنے دالان میں سانچے کو ٹکوں کی دیکتی ہوئی انگلیٹھی کے پاس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ بیگم نے انگلیٹھی میں دیکتے ہوئے سانچے کو ٹکوں کو دیکھا تو اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ کون سے اس کے سینے کے اندر دھک رہے ہیں اور اس کا سینہ بھی ایک انگلیٹھی ہے، جس میں اس کے جذبات اس کی خواہشیں جل جل کر دم توڑ رہی ہیں۔ بیگم باہر نکلی تو اس کی پہلی غور شنید نے اس کو چھیڑا۔

”ٹوٹی سٹھانی اب بیدار ہوئی ہیں۔ رات بھر سیٹھ جی کا توند سہلا سہلا کر تھک گئی ہوں گی بے چاری۔“

بیگم نے بھوں چڑھا کر کن انگلیوں سے غور شنید کر دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ آج مہارانی کا پارہ صبح صبح ہی چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ چپکے سے کھسک گئی۔

بیت الخلاء سے باہر آ کر دروازہ کھینچتے ہوئے وادھانے کہا: ”رات ایک کلوڑے سے سا بقہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ یوں ناک بھول چڑھا رہا تھا جیسے حوروں کے ساتھ ہی سو سکتا ہے حرامی۔ میں نے آنکھ ماری تو کہنے لگا اتنی بے تکلفی پسند نہیں مجھے۔ جیسے سو کی اولاد مجھ سے نکاح کرنے ہی آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا سرکار میں آنکھ ماروں یا ٹانگ ماروں اپنی قیمت وصول کر لیجئے اور بس پوچھنے لگا وہ بیگم کہاں ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ تجھ پر فریفتہ میں صاحبزادے۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں سب بیگمیں ہی ہیں۔“ وہ ”نام کی کوئی بیگم یہاں نہیں رہتی۔“ کہنے لگا جی میری بیگم یہیں رہتی ہے۔ میں سچی جلی ہوئی تو تھی ہی

اصلی پر چھایاں
کہہ دیا۔ حضور آج آپ کی بیگم ہنسی داس ہری داس اگر وال کی گود گرم کر رہی ہیں۔ یقین
نہ ہو تو اوپر جا کر دیکھ لیجیے۔ بے چارہ چپ چاپ لوٹ گیا۔ کوئی سچا عاشق معلوم
ہوتا ہے تیرا۔“

بیگم کے سینے میں دھکتے ہوئے سانچے کوٹلوں کو رادھا نے جیسے ہوا دی۔ کھوسٹ
شہزادہ انیسٹھی پرسیا چل رہی تھی۔ جھوٹے ہی بیگم نے کہا کہ جھوٹے ہوں یا سچے ہوں عاشق
بہر حال میسر ہی آتے ہیں۔۔۔ تجھ پوچھتا ہی کون ہے۔ کمانی میں ہوں اور کھاتے تم
سب ہو۔ میرا جسم تو بس اوکھلی ہے۔ دن رات مٹولوں سے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔۔۔ دونوں
ہاتھ جوڑتی ہوں، تھوہے ان ہاتھوں پر کہ انہیں ہاتھوں سے سمٹیوں لیکن یہی ہاتھ پھر
خالی کے خالی رہیں۔ سوچتی ہوں میں بھی اپنا ٹھکانہ بدل دوں۔

”کیا کرے گی ٹھکانہ بدل کر اور پھر جائے گی بھی کہاں۔ کیا لوگوں نے دروازے
صرف اسی لیے لگا رکھے ہیں کہ ایک دن تو ان میں داخل ہوگی۔“ شہزادہ نے شہ دی۔

”آخر کمال، شائستا اور رشیدہ بھی تو اسی گھسے کھاتے ہیں کمیشن کٹوا دیا اور اپنے
ام گروہ میں۔ میں بھی کمیشن ہی پر کاروبار کیوں نہ کر لوں۔ ابھی دھوپ ہے جو لوگ بدن
سینکے کے لیے آ بھی جاتے ہیں۔ یہ دھوپ ڈھلے لگے گی تو ہیک انگلی پھروں گی۔ تم لوگوں کا
بجھتے ہی ٹھنڈا ہو گا۔ سٹھانی ہوں تو میں ہوں، عاشق آتے ہیں تو میسر ہی آتے ہیں
ان دام ہی میری گروہ میں نہیں رہتے۔ یہ سب کچھ تو سنا ہی۔ اب جو مجھے ”بخشش“ ملتی ہے
اُس پر بھی لوگ ہاتھ صاف کرتے ہیں اور میں آنکلیں بند کر کے ہر تھوخی کے پاس
دستی چھپرتی ہوں۔“

شہزادہ ابائی گھاگھتیں سمجھ گئیں کہ جوتیر رادھا اور رشیدہ پر برس رہے ہیں

اُعلیٰ پر چھائیاں

سہارے

وہ ہر سچ کر انھیں کے سینے پر لگ رہے ہیں۔ اس سے انکار تو شہر اتن بانی نہ کر سکتی تھیں کہ لوٹیا پر مرنے والوں کا ایک انبوہ ہے۔ عمر کے ساتھ اللہ صاحب نے صورتِ شکل بھی دی ہے مزاج کی تندہی ہے سو خروں کے پیچھے اس طرح چُھپ جاتی ہے کہ آنے والے آلو کے پٹھے ہی ہی کرتے اور ہاتھ جوڑتے رہتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن پہلے ہی داؤں نہ لگایا تو لوٹیا ہاتھ سے نکل ہی تو جائے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ بازار میں لینے کے لیے کھمچے مسندوں کا میلہ سالگ جائے گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود شہر اتن بانی نے ہتیار ڈال دینا مصلحتاً نامناسب سمجھا۔

”کہنے لگی بیگم یہ مزاج کی تانا شاہی چوڑ بھی چکوا اب۔ بہت سہہ چکی ہوں۔ نازِ نخر سے تو تنھے ہی، سمجھتی تھی کہ مجھ سے نہیں تو کس سے لاڈ ہوں گے۔ لیکن یہ عن طعن یہ غصے، یہ برہمی، یہ سب سہہ نہ سکوں گی۔ نوک جھونک کرنی ہو تو اپنے ہونے سوتوں سے کر دیجو۔ میں نگوڑی کوئی باندی سچی نہیں ہوں جس نے پتہ چل کر چھینک دیا ہو۔ میری ماں سوتن بانی یوپی بھر میں مشہور تھیں، اکیس رٹیاں تھیں اس کے کوٹھے پر اور وہ بھی ایسی جن کے پاس شہر جیسے نواب زادے اور رئیس آتے تھے۔ قسمت چھوٹے ہیں جو یہاں دو دھڑی کے دھندے کے لیے آن مری ہوں۔

بیگم کا پارہ بھی چڑھ چکا تھا۔ ویسے بھی اس کے تلون سے اس کی ساتھ والیاں چکتی تھیں۔ دوچار مقبول عام لڑکیاں اور بھی شہر اتن بانی کے کوٹھے سے دھندے پر جاتی تھیں لیکن ان کے انداز دوسرے تھے۔ دلال کسی کو لے آتا اور اپنا کمیشن کاٹ لیتا بانی جی مشا طگی کرتی اور اپنا کمیشن دھڑیتیں جو کچھ بچ رہتا وہ تو کم از کم ہر سونے والی کی گھر میں محفوظ ہو جاتا۔ بات جتنے پر طے ہوتی اس کے نصف کے لیے تو کوئی جو کم نہ ہوتا

اجلی پر چٹائیاں

سہارے

پھر انعام و اکرام بخشش یا دین الگ ہوتی۔ بیگم کا معاملہ دوسرا تھا۔ گہرا تو اس کا ستھا نہیں جو وقت پر دوسروں کی طرح بن سنور کر چلی آتی۔ شہزاد بائی ہی کے کوٹھے سے کاما شروع کیا تھا۔ شہزاد بائی ہی کے کوٹھے پر اس کی تنہا تری تھی۔ ایک فوجی کرنل کے آوارہ لونڈے نے اس کی تنہا اہارسی تھی۔ صبح وہ جانے لگا تھا تو بیگم کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو اپنے رومال سے پونچھتے ہوئے اس نے یقین دلایا تھا کہ میں بہت جلد آؤں گا۔ جب وہ جا چکا تو بیگم نے دل کے قریب کسی نشتر کو محسوس کیا جو کبھی کسک بن جاتا، کبھی درد اور کبھی درد کی دوا اور جب وہ سو کر اٹھی تھی تو غسل خانے لے جانے تک بائی جی اس پر سو سو بار تصدیق ہو ہو گئیں۔ نیا فراک نئی شلوار ٹائیلٹ کمانگس اور بیس روپے بیگم کے حصے میں آئے۔ اس نے اپنی ساتھ والیوں سے سنا تھا کہ بائی جی نے پورے چار سو روپے انیٹھ لیے ہیں۔ لیکن بیگم کو ان باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ رکشا میں سوار ہو کر بدرجائی کے ساتھ سوقین سے وہ حاجی صاحب کے مکان پر اس طرح پہنچی کہ راہ چلتوں نے اس کی انگلیوں کی پوروں کو تک نہ دیکھا۔ کسی پیشینہ و رعرت کا حاجی صاحب کے گھر میں جانا کوئی مذاق نہ تھا، وہ تو حاجی صاحب جانتے نہ تھے کہ بیگم کوئی پیشینہ و رعرت ہو گئی ہے۔ دس روپے اس نے اپنے بہن اور بدرجائی کو دے دیئے۔ پانچ روپے بدرجائی کے حصے میں آئے۔ پانچ کا ایک نوٹ خود اپنی پرس میں رکھ کر وہ خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی۔ شہزاد بائی کا گھر اس کا اپنا گھر ہی تو تھا۔

لیکن آج پھر دنیا بھر کی سنسناتی ہوئیں اس کے دماغ میں گھس آئی یقین جن میڈ پر اس نے شہزاد بائی کی دہلیز کو کھٹکڑا رکھا تھا جس آس میں اپنی تنک مزاجی کے باوجود شہزاد بائی کا سرد و گرم سہتی رہتی تھی۔ وہ امید وہ آس آہستہ آہستہ ایک حسرت

اُجلی پر چھائیاں
 بن کر اس کے دل میں آباد ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اب دہرا ہی کیا ہے یہاں
 جھوٹی آشاؤں کے سوا۔ ہمت کر کے اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ نکل ہی چلو بیگم یہاں
 سے۔ اس کے ذہن نے آہِ واحد میں فیصلہ کر دیا تو وہ بائی جی پر برس پڑی۔

”چھوڑ کر ہی رہوں گی آج تمہارا گھر۔ ساری اکڑ نہ نکل جائے بائی جی تو ڈبل چوڑے
 اور کتھے کاپان کھا کر تنوک دینا میسے منہ پر۔ کماتی میں ہوں، کھاتے سب ہیں اور
 نزلہ اتارنی ہو تو اُلٹے مجھ ہی پر۔ غصہ میں تمہارا سستی ہوں، گالیاں میں تمہاری
 سستی ہوں، یہاں تک کہ مارنے کے لیے تم نے ہاتھ تک اٹھایا۔ بدرجہا بیچ میں نہ آتے
 تو شاید مار بھی دیتیں۔“ بیگم کی آواز سہجائی اور وہ رورور کرین کرنے لگی۔
 ”دل میں جو بھی ہے پورا کر ہی کیوں نہ لو۔ مجھے تاؤ میں لا کر چاہتی ہو کہ میں گھر سے نکل
 جاؤں۔ اس لیے کہ لوگ تم پر انگلی نہ اٹھائیں تصویر میرا ہی ٹھہرے کہ میں خود بھاگ نکلی۔
 صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ لیکن سن رکھو چلی جاؤں گی تو دود و دن ہانڈی نہیں
 چمڑھے گی اس گھر میں۔“

ہانڈی کی بات سن کر بائی جی نے کہا: ”اس طرح بہت مت اتراؤ بیگم۔ اتنا
 غور راجھا نہیں ہوتا۔ تم چلی جاؤ گی تو ہم سب کی قسمت اپنے پلوں میں باندھ کر نہیں لے جاؤ
 جو ہم بھوکوں مرنے لگیں۔ تم کیا مارو گی ہمیں۔ جلانے والے کی قدرت سبھی تو کچھ ہے، اور
 پھر میں کب تمہیں گھر سے نکالنے بیٹھی ہوں، جوانی کے بھڑے پر تم ہی تو چھوڑ جانے کی
 دھمکی دیتی ہو۔“

بیگم نے بائی جی کو بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ کہنے لگی: ”اس گھنڈ میں نہ رہنا بائی جی۔
 کہ لو نیا دھمکی دے کر ٹل جائے گی۔ جوانی ہی کو سب کچھ سمجھتی، بل بوتے ہی کا

سہارے

اجلی پرجھپٹیاں

غور ہوتا تو اتنا تک ایک ایک کوٹھا بسا تی پھرتی۔ یوں تمھاری چوکھٹ سے چپک کر نہ رہ جاتی۔

بائی جی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ تھوڑی سی نرمی لہجے میں پیدا کر لی جائے۔ بیگم نے

جتنی بار غصہ کیا اتنی ہی بار غصے میں ایسے جلے بھی کہتی رہی کہ منہ چھسلا کر اس کو روک لینے کے

مواقع بھی بائی جی کے لیے پیدا ہوتے رہیں۔ سو بائی جی نے پچکارا۔ جھٹ اپنے پلو کو آنکھوں

پر رکھتے ہوئے بولیں ”بات بے بات کے بگڑ جاتی ہے۔ آگ خود لگاتی ہے، کہتی ہے میں ہوا دیتی

ہوں۔ خود کڑھتی ہے مجھے کڑھاتی ہے جس کو چاہتے ہیں اسی کی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے

نا بٹیا۔ تجھے دکھ اسی بات کا ہونا کہ تجھ سے پوچھے بغیر مجھے نصیبوں جلی نے تیرے چاؤل اور

گھی پر ہاتھ صاف کیا۔ محبت کی جھوکی ہوں تجھے اپنا سمجھتی ہوں۔ تیرا کھاتے ہوئے بھی غیرت

نہیں محسوس ہوتی لیکن میں ہوتی کون ہوں تیری۔ غلطی میری اپنی ہے۔ تو نے جو کچھ

کہا ہے ٹھیک ہی تو ہے۔“

بائی جی ٹسوے بہانے لگیں تو بیگم کا دل پسیم گیا۔ اور پھر اندھا کیا چاہے دوا کیس

بیگم کب اس گھر کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے دماغ میں سائیں

سائیں کرنے والی ہوائیں اب صبار رفتار ہو گئی ہیں۔ دل کے اطراف کچھ روشنیاں سی پھیل

گئی ہیں۔ لیکن ان احساسات کو چھپائے رکھنا بھی تو تھا۔ سو کچھ کہے بغیر وہ چپ چاپ

کمرے میں جا گھسی۔

بدر بھائی نہ تھا کھٹی پنی کر کہیں پڑ رہا ہو گا۔ ایسے مواقع پر وہ جب کبھی موجود

رہتا بیگم کو سمجھا منا کر روک لیتا۔ اس کی موجودگی میں بیگم اس طرح فوری ہتیار نہیں ڈالتی

تھی۔ جتنا ہنگامہ کر سکتی تھی کرتی۔ اپنا ٹرنک چادر اور نیکے اٹھا کر بار بار دروازے کی

طفر ٹھکتی اور بدر بھائی بار بار آڑے آکر راستہ روک لیتا۔ لیکن آج وہ دروازے

ایک پنج جاتی تو بڑھ کر راستہ روکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ شہزاد بائی چاہتی ضرور تھی کہ بیگم اسی گھر کی رونق بنی رہے لیکن اس کے جاتے وقت راستہ روک لینے سے تو سارا بھرم کھل جاتا۔ ادھر خود بیگم یہی سوچتی کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت پیارا جذبہ اسی گھر کے در و دیوار سے وابستہ ہے۔ وہ جیتے جی تو اس گھر کو نہ چھوڑ سکے گی لیکن اس بات کا اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اس کمزوری کا علم بائی بچی کو ہو جاتا تو نگنی کا ناچ نہ پنا دیتیں؟ اس راز سے صبر بدر بھائی واقف تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ شہزاد بائی بیگم کو گھر سے نکال سکتی ہے اور نہ بیگم گھر چھوڑ سکتی ہے اور یہ سبھی کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں سے دونوں ہی واقف ہیں۔

بیگم کے میں جا گھسی تو بدر بھائی اس کو بے اختیار یاد آ رہا تھا۔ آج وہ نہ تھا تو وہ خود کو کس قدر مجبور پارہی تھی۔ بائی بچی اس طرح چوڑی نہ بھولتیں تو۔؟ اور وہ کانپ کانپ گئی۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال چیکے سے اس کے ذہن میں گھس آیا۔ نہ جانے کیوں اس کو اس بات سے تسکین ہوئی کہ کوئی اس کا خیال کرنے والا تو ہے۔ اس تسکین کے پیچھے پیچھے پاؤں لگی ہوئی پکھال، ہانتا ہوا کچھو اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں اس کے تصور میں اُبھرنے لگیں تو اس نے اپنے خیالات کے اڑن کھٹولے کو دوسری سمت میں موڑ لیا۔ اس لیے سبھی کہ وہ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال کے خلاف اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

کچھڑی دم ہو چکی تھی۔ چاول اور گھی کی خوشبو نے اس کو سچر جھجھوڑا۔ اس نے سوچا کہ رات کو سبھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال نے کھوٹی پر ٹٹنے ہوئے کوٹا کے اندرونی جیب سے چکناٹ سے اٹی ہوئی ایک پٹری نکالی تھی اور

اصلی پرچھائیاں

سہارے

حلوہ سوہن کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنی آغوش میں اس کو بچھتے ہوئے اس کے منہ میں رکھ دیا تھا۔ اس نے سوہن پٹی کاٹنے کے بہانے سیٹھ کی انگلی کو کاٹ لیا تھا تو وہ اس مذاق پر بہت خوش ہوا تھا اور اس کو گدگدانے لگا تھا۔ سیٹھ کے منہ میں سوہن پٹی کا ایک ٹکڑا اٹھوٹنے کی جب خود اس نے کوشش کی تھی تو سیٹھ نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

”بیگم ہم کو وہ مٹھائی کھلاؤ جس میں چینی ڈبل ڈبل ہے۔“ بیگم سمجھ نہ سکی تو سیٹھ نے اس کو پھر ایک بار بھینچا اور اس کے منہ کی طرف اپنا منہ بڑھا کر کہا ”منہ سے منہ ملا کر اپنا جھوٹا کھلاؤ جی بیگم۔“ لیکن بیگم کو ابکاٹی سی آگئی۔ اس کا جی منلانے لگا۔ اس نے سیٹھ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر منہ پھیر لیا، اور جلد ہی سے کمرے سے باہر نکل کر سوہن پٹی تھوک آئی۔ گو اس کیفیت کو اس نے سیٹھ پر ظاہر ہونے نہ دیا۔ لیکن اس کو کھانے کی ہر چیز سے اس وقت گھن آنے لگی۔ سیٹھ کے تصور سے اس کی طبیعت پھر مکرر مہر رہی تھی۔ جانے کیوں اس کو یہ احساس بار بار مہر ہا تھا کہ ایسی باتیں جس میں سیٹھ سے بیزارگی شامل ہو نہ سوچنی چاہئیں۔

یکایک اس کو بدرجائی کا خیال آیا۔ مسلسل دو دن غائب رہ کر ایک بار وہ اسی طرح جب واپس آیا تھا تو وہ بہت خوش تھا اس نے چپکے سے بیگم کے کان میں کہا تھا۔ ”پنگلی تیرا وہ آرہا ہے۔“ تجھ کو پوچھ رہا تھا۔ میں نے رات اس کا کام بنا دیا۔ لونڈا دل کا بُرا نہیں ہے۔ ایک بڑھیا مال پھانس کر لے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا بس آدمیوں کا بدرجائی جلد ہی۔ بیگم کو ہمارا سلام کہہ دینا۔“ وہ کہیں کھوسی گئی تھی۔

”بدرجائی نے چپت لگا کر کہا تھا۔ کہاں کھو گئی ہے۔ اب وہ آنے کا نہیں۔“

اُجلی پرچھائیاں

سہارے

یہاں کی کوئی چیز اس کو پسند نہیں ہے۔ آتا تو اب تک تیرے لیے ہی آجاتا۔ اس کی اڑا بہت اونچی ہے بیگم۔“

”اب بھی میسر لیے تو آسکتا ہے نا بدر بھائی“

”اب کیا خاک تیرے لیے آئے گا۔ پیشہ شروع کر کے قریب قریب چھ ماہ تو بچہ ہو ہی گئے ہوں گے۔ آنے والا ہوتا تو اب تک کئی بار آچکا ہوتا۔ تیری قدر اس سے بڑھ کر اور کون کر سکتا تھا بچی جس نے تجھے لڑکی سے عورت بنایا۔“

وہ سوچنے لگی۔ بدر بھائی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آخر وہ نہ آیا۔ لیکن آج بدر بھائی اس کو ساتھ لے آئے تو۔۔۔ میں اس سے نہیں بولوں گی۔ لیکن وہ لوٹ جائے گا۔ میں اس کے قدموں پر۔۔۔ رکھ کر خوب رولوں گی۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ لاتعداد بوسے اس نے اس کے لبوں، نگالوں، آنکھوں اور پیشانی پر جڑ دئے محبت اور پیار کی بہت ملائم اور لطیف فضا نے اس کی ہستی کو اپنی وسعت میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنے لبوں پر اس کے بوسوں کی حدت آج بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیگم نے دوشیزگی کے حدود کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، اور زندگی کے نئے تجربوں میں اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس خوش فہمی میں بیگم کی معصومیت کو قتل نہ تھا۔ جب اس نے اس کے پاؤں پکڑ کر کہا تھا کہ مجھے اس گندگی سے نکال لیجئے نا۔ تو اس نے بیگم کو یقین دلایا۔ اس اعتماد اور یقین پر کہ وہ پہلا شخص ہے جو بیگم کی زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے بیگم کی معصومیت اور پاکیزگی کی قسمیں کھائی تھیں۔ رات بھر میں جتنی ہی باتیں بیگم نے اس سے کی تھیں اتنی ہی گرجوش سے اس کی باتوں کا اس نے جواب دیا تھا۔ وہ بار بار یہی جملے دہراتا۔ بہت معصوم ہے۔ قسمت نے کہاں لا پھینکا ہے۔

یہ جملے دہراتے ہوئے اس کی باتوں اور حرکتوں پر بار بار ہنستا ہنستے ہنستے

اُجلی پر چھائیاں

سہارے

اس کو بھیج کر بے اختیار چوم لیتا۔ کہتا تمہیں بھول جانا بس کی بات نہ ہوگی۔ تمہیں دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔

رات بھر اس کی آنکھ تک نہ چھکی۔ بیگم کو سہی اس نے پلک جھپکانے نہ دیا۔ کیسی یسی نرم نرم سی مٹھی مٹھی سی باتیں کرتا رہا۔

بیگم پوچھ بیٹھتا ”مجھے سونے سے پہلے پیر دبانے کی بری لت ہے بیگم۔ تم روز پیر داب دو گئی نا۔“

بیگم نے کہا تھا ”اب آپ آرام کیجئے میں پیر داب دیتی ہوں“ اور وہ پاؤں دابنے لگی تھی۔ وہ کس قدر فاسخاندہ انداز سے بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کس قدر پیار تھا۔ پھر یکایک وہ اٹھا اور اس نے یہ کہہ کر بیگم کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا کہ آج کی رات تمہیں چھٹی ہے کل سے تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔ آج میں سونا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ پھر بیگم کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ دو کچھ سناؤ نا۔“

”تم اس دلدل میں چھپس کیسے گئیں“

بیگم پس و پیش کرتی رہی۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو اس نے سب کچھ بتا دیا یہاں تک کہ اپنے ماں باپ کا نام بھی۔ جب وہ کہہ رہی تھی کہ اٹدین آرمی نے جس وقت اس کے باپ کو گرفتار کیا تو وہ بھی وردی ہی میں تھا۔ لیکن جب اس کو گولی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اس وقت اس کی وردی تار تار ہو چکی تھی۔ اس کی پیشانی اور گھٹنوں سے لہو برس رہا تھا۔

”وہ اور جب ایک فوجی نے بددوق اٹھائی تو فیروز نے سے پہلے میری ماں چھتی

اصلی پرچھائیاں

چلائی میسے رات کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے
ہو رہا تھا۔ اس وقت میں چھوٹی تھی۔ مجھے اپنا چٹ پن اس وقت بہت کھل رہا تھا
مجھے پا کر فوجیوں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ انہوں نے مجھے کلاسیوں سے مضبوطی
سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر یہ کہہ کر ہاتھ جھٹک دیا تھا کہ ابھی چھوٹی ہے۔ اُن کی اس حقارت
کو میں اس وقت سمجھ نہ سکی تھی۔ آج سوچتی ہوں کہ اگر میں اس وقت بڑی ہوتی تو
شاید میسرے وال باپ بچ جلتے۔ بالآخر بد روق کی آواز کے ساتھ میسرے وال اور
باپ دونوں کی دل دوزخیں بیک تہ تھا میں بلند ہوئیں اس کے بعد کچھ اندھیرے میری
طہر پڑے اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

اتلہ کہتے کہتے بیگم کا کھلا رندہ گیا۔ بیگم نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں چا کر کہیں تو
اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی تھیں۔ بیگم جھکی تو اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک پڑا،
اور اس کے گال پر گر کر پھسلنے لگا۔ عین اسی وقت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک
قطرہ اس کے گال پر پھسل کر بیگم کے آنسو سے جا ملا۔ بیگم کے زانو سے سر اٹھا کر اس نے
بیگم کے اور اپنے آنسو خشک کیے اور اس کو ہنسنے کے لیے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتا رہا۔
بیگم سوچنے لگی۔ میں کس طرح اس منظر کو بھلا سکتی ہوں کہ اس کی آنکھیں میرے
لیے بھیگی تھیں۔ ان آنسوؤں کے مہارے تو میں ساری زندگی بتا سکتی تھی۔
لیکن وہ پھر کبھی نہ آیا۔ یہ سب کچھ اس دنیا میں کس طرح ممکن ہو جاتا ہے۔

ساری باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے اس کے سینے میں کیسی ہل چل ہوئی۔
ایک سمندر تھا جو اٹا اٹا کر آنکھوں سے ٹکراتا تھا، ایک سیخ متھی جو کسی نے آپنچ دے کر
سینے میں کھڑی کر دی تھی اس کو یہ کیا خیال آیا۔ خورشید کہہ رہی تھی تیرے لیے کوئی آیا

اُجلی پر چھائیاں

سہارے

تھا۔ پوچھتا تھا بیگم کہاں ہے۔ لیکن اس نے پھر خود ہی تردید کی — وہ نہیں ہو سکتا — وہ اس طرح چپ چاپ لوٹ جانے والا کب تھا۔ میں سات پردوں میں ابھی ہوتی تو وہ مجھ سے مل کر ہی جاتا — اور پھر اس کے آگے خورشید کی چرب زبانی کہاں چل سکتی تھی بھلا۔ لیکن اس وقت خورشید سے پوچھ لینے کی بھی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ بالکل بھول گئی تھی کہ خورشید نے اس آدمی کا تذکرہ کرتے وقت کھوپا کہا تھا۔ لیکن وہ تو سرخ و سفید تھا۔ سینے کے اندر وہیں اراتا ہوا سمندر آنکھوں کے بند توڑ کر جیسے بہنے لگا۔ اس نے نڈھال ہو کر تکیوں میں منہ چھپا لیا اور دیر تک روتی رہی۔ روتے روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس کو پتہ نہ چلا۔ جب بیدار ہوئی تو خالی پیٹ اس کے پندار کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بانی جی نے جھوٹے منہ اس کو ناشتے پر تک نہیں بلایا۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ بانی جی منہ سمجھا کر اس کو دونوں اے ضرور کھلوائیں گی لیکن بدرجہا کی غیر موجودگی اس کو کس حد تک بے سہارا کر دیتی ہے۔ اس بات کا احساس اسے رہ رہ کر ہورہا تھا۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اس وقت تک باہر نہ نکلے گی جب تک کہ بانی جی یا پھر خورشید یا رادھا اس کو منانے کے لیے نہ آئیں کہ پٹاخ سے دروازہ کھول کر بدرجہائی کمرے میں داخل ہوا۔ اوندھی ٹپڑے ٹپڑے بیگم نے گردن اٹھا کر بدرجہائی کو دیکھا تو ایک چمک سی اس کے چہرے پر آتے آتے رہ گئی۔ رہ اس لیے گئی کہ بیگم نے کوشش کر کے چہرے کی چمک کو ادا سیوں اور آنسوؤں کے پیچھے چھپا دیا ورنہ بدرجہائی کی ہمدردی کیسے حاصل ہوتی۔ لیکن اس پر بھی بدرجہائی نے ہمدردی نہ کی تو بیگم نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔ بدرجہائی بڑے جوش میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن بیگم کی سوچی ہوئی

اُجلی پر چھائیاں
 آنکھوں اور سجاری پوٹوں کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے بے حس سا کھڑا رہا پھر کچھ
 سوچے بغیر آگے بڑھ کر اس نے بیگم کو اٹھا کر کٹھن کر دیا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ چل
 ذرا جلدی سے تیار ہو جا۔

”کیوں۔ میں اب کہیں نہیں چلوں گی۔“

”چلنا کہیں نہیں ہے۔“ ایک ٹائم ”کے لیے اپنے گھر ہی پر آیا ہے۔“

بیگم کو برا معلوم ہوا، وہ بدر بھائی جس کو بیگم نے دل دکھنے پر ہمیشہ اپنا سہارا
 سمجھا۔ آج اس نے بیگم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو اس قدر اس کیوں ہے۔ مگر وہ بند کیے
 اندھیروں کی کیوں ہو گئی ہے، آنکھیں کیوں سو جی ہوئی ہیں تیری۔

”میں منٹ بج کر لیے بھی کسی کے ساتھ اس وقت نہیں رہ سکتی بدر بھائی۔“

بدر بھائی نے پچکارا ”چلو سبھی اب چلو سبھی۔ ٹیرٹری شکل سے آیا ہے۔“

بیگم برس پڑی ”مشکل سے آیا ہے تو آسانی سے واپس کر دو۔ ہر شخص کو بس

اپنی ہی ٹیری ہے۔ کسی پر کچھ بیتے کوئی جل کر اندر اندر رکھ ہوتا رہے۔ لیکن پوڈر چہرے
 پر مل کر روشن ہو جائے۔ آنسو ٹانڈا ٹانڈا گرائیں تو مسکرا مسکرا کر باتیں کرے۔ یہ سب زندگی

بھر تو ہوتا ہی ہے بدر بھائی لیکن آج نہ ہو گا۔“

بدر بھائی بہت تھکا ہوا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ خود

بھی جل کر اندر اندر رکھ ہو رہا ہو، صورت تو کچھ ایسی ہی بنا رکھی تھی اس نے۔

اس نے پھر منت سماجت کی ”چلو مھٹی اتنی اچھی سی ہو۔ مجھ سے اب حجت نہ کرو۔

میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ لونڈا اتنا نرالا ہے۔ کچھ زیادہ پر ہی راضی ہو گیا ہے۔ رقم

بائی جی کو دلوا بھی دی ہے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔“

اُجلی پر چھائیاں

سہارے

”بائی جی نے رقم اینٹھ لی ہے؟“ بیگم کا پارہ بہت تیزی سے چڑھ گیا۔ بدر بھائی کو پرے ڈھکیل کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ کہنے لگی، اچھا تو بائی جی کے وکیل بن کر آئے ہو مگر بدر بھائی — سولے میری کوئی ہوتی سوتی۔ میں تو منٹ بھگے لیے بھی تیار نہیں ہوں میں نے سارے گھر کا گتہ نہیں لیا ہے۔ ٹھیکہ تو تم نے لے رکھا ہے بائی جی کا — کوٹھے بھر میں کیا میں ایک ہی عورت رو گئی ہوں جو گود گرم کرنا جانتی ہے اور بھی تو ہیں نا۔ جو آتا ہے میسرے لیے ہی کیوں آتا ہے۔ زیادہ دام ملتے ہیں تو کچھ کم لے کر کسی اور کو بھجوا دو نا۔

بدر بھائی نے ڈانٹا۔ ”بیگم تیرا داغ روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو میرے منہ بھی آنے لگی ہے۔ کسی کو لے آتا ہوں تو خود مال مال نہیں ہو جاتا ہوں۔ احسان نہیں کرتی ہے تو مجھ پر جو نیرا ٹمپر سہہ لوں۔“

بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ سیدھی رسوئی میں پہنچ کر سارے چہرے پر اکھ اور کالاک پوت آئی اور بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چلانے لگی۔ ”بلا لاؤ کون ہے وہ مجھ سے منہ کالا کرنے والا۔ مجھے دیکھو بغیر پیشگی رقم چکانے والا۔ دل بھر کر سولے میسرے ساتھ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بدر بھائی ہکا بکا کھڑا اس کو بغور دیکھتا رہا۔ مزید ڈانٹنے یا جھگڑنے کی اس نے جرات نہ کی۔ چپکے سے اس کے پہلو سے نکل کر باہر کے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا۔

”کہہ دوں گا جس شخص نے بیگم کی تعریف کے پل تمہارے سامنے پاندھ دیں اس سے کہہ دو کہ بیگم اپنے غصے کے سبب پاگل ہو گئی ہے۔“

بیگم کے کانوں پر سے جیسے شوکتی ہوئی گولی گزر گئی۔ بدر بھائی دروازے کے

اُجلی پرچھائیاں
 قریب پہنچا تھا کہ اس نے آواز دی۔ بدر بھائی کے لیے جیسے یہ آواز متوقع تھی۔ اس نے
 پلٹ کر بیگم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں علانیہ التجاسی تھی۔

بیگم چاہتی تھی کہ بدر بھائی آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگالے۔ پچکار کر منالے۔
 اس لیے کہ اس طویل و غرض دنیا میں ایک بدر بھائی ہی ایسا تھا جس کو وہ اپنا سہارا
 سمجھتی تھی لیکن آج وہ اس کو سچی سچے چھوڑ کر جیسے اتنی دور نکل گئی تھی کہ بدر بھائی
 بھی اتنی دور آ کر سہارا دینے تیار نہ تھا، اور اب جب کہ وہ سچے مڑ کر دیکھ رہی تھی
 تو اس کی ڈب بانی ہوئی آنکھوں کے آگے بدر بھائی کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا
 تھا۔ اس کے نقوش واضح نہ تھے اس کے خدو خال ظاہر نہ تھے۔

”پہیلیاں کیوں سمجھواتے ہو بدر بھائی۔ صاف صاف کہتے کیوں نہیں۔ کون
 ہے وہ۔ لوٹ جائے گا تو کیا لے جائے گا میرا۔“

بدر بھائی نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا ”وہ اسی کرنل کے لوٹنے کا دوست
 ہے۔ تمہاری تعریفیں کر کے اس نے تم سے ملانے کے لیے اس کو میکے ساتھ بھجوا دیا ہے۔“
 جواب دیتے دیتے جب بدر بھائی بیگم سے قریب ہو گیا تو بیگم نے آپنچل سے اپنی
 آنکھیں خشک کر لیں اور اس کا آپنچل کا لہک کی نمی سے گندہ ہو گیا۔ دونوں آنکھوں
 پر دو سفید سفید جھے نمودار ہوئے۔ بدر بھائی بڑے پیار سے اس کو دیکھ رہا تھا۔
 ”کیا تم رات کو اسی کے ساتھ تھے؟ وہ خود کیوں نہیں آیا۔“

”رات گئے مجھے چند شربانی حرامیوں نے تھوڑی سی تکرار پر شہر سے دور موٹر
 رک کر اتار دیا اور بس کالی کولے کر چلتے بنے میں رات بھر اس وقت سے اب تک
 پیل چلتا رہا ہوں۔ جھوک اور تمکن سے ٹدھال ہوں۔ وہ تو سیپیں اپنے گم کے

اُجلی پر چھائیاں
 سہارے
 قریب ملا تھا۔ موٹر روک کر میری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ منٹ دو
 منٹ کے لیے چلا آئے۔ لیکن وہ مجھ سے کہنے لگا مجھ میں بیگم کے سامنے آنے کی ہمت
 نہیں ہے۔ اس کو میرا سلام کہنا۔ اور کہنا کبھی آجاؤں گا۔“

جب اس کا دوست نیچے اترا تو موٹر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔
 ”یہ وہی بیگم ہے جس کی تم تعریفیں کرتے ہو۔“

اس نے جواب دیا ”ہاں وہی بیگم ہے۔ اسی کے پاس تو بھجوار ہا ہوں تمہیں۔“

”بڑی پیاری سی، بڑی معصوم۔“

بیگم نے دالان کی طرف نظر اٹھائی تو رادھا کچھڑی سے بھری ہوئی پلیٹ ہاتھ میں
 تھامے شہزاد بائی کو دونوں اُٹے کھا لینے کے لیے راضی کر رہی تھی۔

بیگم بدر بھائی سے مخاطب ہوئی تو وہ شہزاد بائی کو کچھ اس طرح ہنک رہا تھا جیسے
 کہہ رہا ہو بیگم اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی میں نے اس کو پھر فائدہ کر دیا ہے۔ لیکن بیگم کچھ بھی
 نہ سمجھ سکی کہ بدر بھائی کی آنکھیں شہزاد بائی سے کیا کہہ رہی ہیں۔

اس نے بدر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا سہارا لیا۔ ذرا کی ذرا چکر
 آجانے سے آنکھیں موند کر لے بھر کو اونگھ گئی۔ اور پھر آنکھیں ملے ہوئی بولی۔

”بدر بھائی میسرے حقے کی کچھڑی رکھی ہوگی۔ تم ناشتہ کر لو، اور۔۔۔ وہ کون ہے

اس کو ٹھیرالو۔ میں ابھی تیار۔۔۔“ اور اس کا گلا پھر رندھ گیا۔ آنکھیں پھر
 ڈبڈبا گئیں۔ بدر بھائی کے نقوش پھر غیر واضح ہو گئے۔ اور وہ غسل خانے میں گھس گئی۔



سات سال کی ننھی منی جان نے دور تک چمکتی ہوئی ریل کی پٹریوں کو دیکھا تو اس کو یہ خیال نہ آیا کہ پٹریوں پر ادھر ادھر دوڑتی ہوئی ٹرینوں میں بیٹھ کر دور دور کا سفر کرے، بلکہ اس نے پہلی بار یہی سوچا کہ اس پٹری پر یا تو آہستہ خود لیٹ جانا چاہیے یا گورے جانی کو چپکے سے سٹلا کر کہیں دور بھاگ جانا چاہیے۔

لیکن وہ روز چمکدار پٹریوں کو دیکھتا رہا، دوڑتی ہوئی ٹرینوں کے ڈرائیوروں کو ملے بتاتا رہا۔ زبان چڑاتا رہا یا پھر سلوٹ کرتا رہا۔ پٹری پر لیٹ جانے یا گورے جانی ہی کو چپکے سے سٹلا دینے کی خواہش کے باوجود اس نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ گورے جانی بدستور یا تو اس کی گود میں جمارہا یا پھر پھسل کر اس کی کمر اور گولہوں پر ٹکتا رہا۔ بھاگتی ہوئی ٹرین کے ڈرائیور کو سلوٹ کرنے پر کبھی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو میاں جانی کے دوسرے ساتھی تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے لیکن میاں جانی کو کبھی یہ آزادی نصیب نہ ہوئی کہ وہ بھی تالیاں بجا بجا کر ناچ سکے۔ ڈیڑھ سال کے گورے جانی کے بوجھ کو وہ ہمیشہ ہاتھ اور گولہوں کے سہارے سنبھالے رہتا، اور حسرت سے

اجکی پرچھائیاں
تالیاں بجا بجا کرنا چتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو تنکا کرنا، اور زندہ ماتی ہوئی ٹرین اس کے سامنے سے گزر جاتی۔

اس کی زندگی میں اگر کچھ رس تھا تو صرف اس تصور سے کہ گورے جانی جب چلے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو وہ خوب کیلے گا۔ دن دن بھرتیلیوں کے پیچھے بھاگتا پھرگا اپنی غلیل سے اتنی چڑیاں مارے گا کہ چڑیاں اس کے خوف سے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ کب ہو سکے گا۔ وہ دن کب آئے گا جس کے انتظار میں وہ اپنی بے رس زندگی سے نا تاجوڑے ہوئے ہے۔ اس کا اس کو کچھ بھی علم نہ تھا۔

ابھی تک وہ اپنی ڈبڈائی ہوئی آنکھوں اور دکھتے ہوئے بدن کے ساتھ جو تک کی طرح چمٹے ہوئے گورے جانی کی پرورش کر رہا تھا صرف اس لیے کہ اگر اس کے آنسوؤں سے گورے جانی کی پیشانی تر نہیں ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کی آنکھوں میں مریچ لگا دیتی ہے۔ صرف اس لیے کہ گورے جانی اس کے دکھتے ہوئے ہاتھ اور کولہے کے سہارے لگنا نہیں رہتا ہے تو اس کا باپ امرود کے درخت سے پتلی سی لچکتی ہوئی ٹہنی توڑ کر اس سے چھڑی کا کام لیتا ہے۔ اور وہ اس ٹہنی کے سامنے جس پر چمکتی ہوئی چڑیوں کو غلیل کا نشانہ بنانے کے لیے وہ بے تاب رہا ہے، مکرٹی کی طرح ناچنے لگتا ہے اور کولہوں پر اول آجانے کے بعد بھی گورے جانی کا بوجھ اس پر لا دیا جاتا ہے۔

ایک دن اس نے اپنی ماں سے بہت سنجیدگی سے کہا: "ماں۔ اگر میں گورے جانی کو ریل کی ٹری پر سلا دوں تو۔؟" ماں نے ڈانٹ بتائی۔ پولیس میں پکڑے جانے کا خوف دلایا۔

اس نے کہا: "ماں، اور جو میں خود چڑیوں پر سورہوں تو پولیس تمہیں، آبا کو

اور گورے جانی کو پکڑنے لے گی؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”تو پٹریوں پر سو رہ۔ ریل کے نیچے کچلا جائے گا تو تیری بوٹی بوٹی جیلیں اور کوڑے کھائیں گے۔ ہمیں پولیس کیوں پکڑنے لگی۔ ہم تنہو رہیں تھے ریل کے نیچے پھینک دیں گے۔“

میاں جانی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تو پھر تم مجھے دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے پھینک دے۔“
 ماں۔ ”سچوڑہ مسکرایا۔ لیکن تم ایسا کرو گی تو گورے جانی کو کون سنبھالے گا۔ اور وہ قہقہہ مار مار کر تالیاں بجانے لگا۔“

اس کی ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو پیار کیا اور چپکے سے گورے جانی کو اپنی گود سے اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔
 اس نے گورے جانی کو اپنی کمر کے سہارے سنبھال لیا، اور اسے پیار کر کے گدگدانے لگا۔

جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کی ماں وہاں باورچن کی خدمت انجام دیتی تھی سو راج کی پہلی کرن سے پہلے ہی اس کے ماں باپ کی مصروفیت شروع ہو جاتی تو ماں کے سینے سے چٹا ہوا گورے جانی چنچلا ناشرع کر دیتا، اور اس کی ماں میاں جانی کو جھنجھوڑتی۔ نیند سے جھیل آنکھوں کو ملتا ہوا میاں جانی اٹھ کھڑا ہوتا اور بادل ناخواستہ گورے جانی کا بوجھ اٹھا لیتا۔ اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نیند جیسے گورے جانی کے خوف سے کہیں بھاگ جاتی، اور چپکے سے چمکتے ہوئے آنسو اس کی جگہ لے لیتے اور میاں جانی کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی ماں اور باپ کے ساتھ زندگی کی دوڑ و صوب میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

گھٹنوں کے اوپر سے پٹے ہوئے پاجامے کی دھجیاں لٹک کر زمین کو چومتی رہتیں اور میاں جانی گورے جانی کو کو لہوں پر لٹکائے اس قدر احتیاط سے قدم اٹھانے لگتا جیسے اس کی ماں آٹھویں مہینے میں گورے جانی کو پیٹ میں چھپائے ہوئے اٹھایا کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جن دنوں مال نے بوجھ اٹھا رکھا تھا ان دنوں گورے جانی بھی جیسے اس سے سمجھوتہ کیے ہوئے بالکل خاموش کسی تاریک گوشے میں پڑا رہتا تھا، اور آج جب کہ میاں جانی نے اس کا بوجھ اٹھالیا تھا تو وہ پاؤں جو اس روشن اور سوچ دنیا میں سانس لینے کے روتا چیختا، چلاتا اور پھل پھل کر ضد کیا کرتا۔ اس سے میاں جانی کی مصیبتیں بہت بڑھ جاتیں۔ وہ طرح طرح سے گورے جانی کو سنبھالتا، مناتا، بہلاتا۔

آری چوں چوں آ۔۔۔ اور چوں چوں کبھی پھدک پھدک کر امرود کے درخت کی ٹہنی پر آجاتی، کبھی وہ خود چوں چوں کی آوازیں نکالنے لگتا۔
آری متو آ۔۔۔ متو اطراف میں کہیں بھی نہ ہوتی۔ اور میاں جانی میاؤں میاؤں کرتا متو بن جاتا۔

کوئی نگہری سجاؤ بتا کر سامنے ناچنے لگتی تو میاں جانی گورے جانی کو اس طرف متوجہ کرتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گورے جانی توجہ کرے نگہری کہیں چلی جاتی۔
ایسے مواقع پر میاں جانی کو اکثر اپنی غلیل کا خیال نہ آتا، اور اگر کبھی آجاتا تو گورے جانی کے بچھ کے نیچے اس کے سارے جذبے اس کی ساری دلچسپیاں، اس کی مختصر سی زندگی کا سارا حسن، ساری خوبصورتی دب کر سسکنے لگتی، اور وہ گورے جانی کو اپنے کو اپنے کے سہارے لٹکائے ہوئے سسکیاں لینے لگتا۔

میں نے کئی بار اس کو گورے جانی کو زمین پر لٹا کر اپنی غلیل اٹھا لینے کے لیے اکسایا۔
میں نے اس کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ گورے جانی کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا
کرے اور کوئی پروا کیے بغیر میرے بچوں سے کھیلے۔ لیکن اس کو میرے خلوں پر پوری
طرح اعتماد نہ تھا۔ اس نے کبھی میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا۔

گورے جانی جب تک خاموشی سے بیٹھا کھیلتا رہتا، وہ سبھی اس کے سامنے
کچھ دیر کھیل لیتا اور اس وقت سبھی کسی نہ کسی طرح اس کو بھلاتا رہتا۔ اور اس کی دلچسپی
کے سامان فراہم کرتا کہ سب اس کی بے رخی پر گورے جانی بہیم نہ ہو جائے اور اس کی
یہ بہت مستحضر سی آزادی سلب نہ ہو جائے لیکن بہت جلد یہی ہوتا۔ گورے جانی بہت
نرم سروں میں رونا شروع کر دیتا، اور وہ ایک بے جان کنجی کے پتلے کی طرح آگے
بڑھ کر گورے جانی کو اٹھا لیتا۔

میاں جانی کو میں اپنے سچوں کی طرح کھیلتا ہوا دیکھنے کے لیے ترس جاتا۔ وہ
کبھی ان کے ساتھ کھیلنے لگتا، تو بھی اس کے پیچھے کسی نامعلوم خوف کی پرچھائیاں
سی نظر آتیں۔۔۔ میرے بچے فرید کی ٹرائسکل کے پیچھے وہ بھاگتا رہتا تو اس کے
پاجامے کی دھجیوں سے الجھتے ہوئے پیروں کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس طرح
بھاگتے بھاگتے ایک دم ساکت ہو جائے گا۔ اس کے قدم آہ و اعد میں زمین میں
دھنس کر رہ جائیں گے۔ کوئی بجلی اس پر دیکھتے ہی دیکھتے گرے گی۔ گورے جانی
رونا شروع کر دے گا اور میاں جانی ہاجم حرکت نہیں کرے گا۔ اس کا اٹھا ہوا
قدم ٹھہر جائے گا۔ اس کا دم ٹرکتا ہوا دل ٹھہر جائے گا۔

میاں جانی کے ۳۸ سالہ لیکن بوڑھے کوڑھی باپ کو میں اس زمانے سے

جانتا تھا جب اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ایک دو کوڑھ کے دھبے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے ضلع کا بہت مشہور اور رکھنا پیتا درزی تھا۔ تین چار شینیں، دو تین ملازم۔ سیٹھ صاحب کا ان دنوں صفر اتنا کام متکا ٹیپ لے کر آنے والوں کا ناپ لے لیتے، نوٹ بک میں لکھ لیتے، اور کپڑوں کی کٹنگ کر کے ملازمین کو سینے کے لیے دے دیتے۔ میں بھی اس کے پاس تیلوں، قمیص اور شیر و ایناں سلوا چکا تھا، اور اس کی ہنرمندی و فنکاری کا قائل تھا۔

ضلع کی زندگی چھوٹی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس معمولی درزی کو یاد رکھتا جس کے فن کی سارے ضلع میں دھوم تھی چنانچہ وہ میسر دھن سے حرف غلط کی طرح محو ہو گیا عید سے کچھ دن پہلے محلے کے ایک درزی کو بچوں کے کپڑے سینے کے لیے دیے گئے تو درزی صاحب نے دکان میں تالا ڈال دیا۔ عید سے ایک دن قبل میسر ملازم نے درزی کے گھر کا پتہ اٹھا کر اسے پکڑا اور تنبیہ کی تو وہ اپنے ساتھ ایک اور خیف و ناتوان شخص کو لے کر میسر گھر آیا، اور زندہ مردے کی طائر اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا اس شخص نے جو اس کی دکان پر ملازم ہے بہت سے کپڑے کہیں رہن کر دیئے ہیں جس میں میرے بچوں کے کپڑے بھی شامل ہیں۔

میں نے گردن جھکائے سامنے کھڑے ہوئے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو دیکھا جس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کوڑھ کے سفید دھبے اس کی ڈاڑھی کے سفید سفید بالوں سے زیادہ نمایاں تھے۔

میں نے اس مجرم کو ڈانٹا۔ آنکھیں چار موٹی۔ سرخ ٹوئیڈ کی شیر وانی پہنے ہوئے کوئی عجیبی سی صورت میسر دماغ کے گوشوں میں بھٹکے لگی۔ کوئی

مانوس سا چہرہ ذہن میں اسجرا، پھر کہیں جا چھپا۔ کوئی دیکھی بھالی صورت نظروں کے سامنے دھندلائی، اور چہرہ چمک اٹھی۔ پھر کوئی بے تحاشہ میری طرف بھاگتا ہوا آیا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھا، اور پھر ٹہریوں کے ایک ڈھانچے کے روپ میں میرے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ہائیں۔ کرامت علی۔؟

اور نئے درزی نے کہا۔ یہ پولیس ایکشن کا ستایا ہوا، کوڑی کوڑی کو محتاج اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ غید گاہ میں سارے مسلمان ننگے ہو کر اللہ میاں کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں، اور کرامت علی عید گاہ کے باہر ہاتھ میں ٹیپ لیے کھڑا ہے کہ فوری ان کی ستر پوشی کا انتظام کرے۔

میں نے رہن کے پیسے دے کر سارے کپڑے چھڑوائے اور کرامت علی نے میرے گھر پر سلانی گھر کے اپنا قرض ادا کر دیا۔

اس کے بعد کرامت علی میرے پاس آتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ میری بیوی کو بہت تکلیف ہو رہی ہے، وہ کسی ماما کو تلاش کرے۔

بہت مشکل سے کرامت علی مجھ سے کہہ سکا۔ ”میری بیوی کو ملازم رکھ لیجئے صاحب“ اس نے آج تک کہیں نوکری نہیں کی۔ میں اس کو کہیں رکھوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس گھر کی بات اور ہے وہ یہاں رہ سکتی ہے۔

ہاں کرامت علی نے یہ بھی کہا تھا کہ سودا لانے کے لیے اس کی بیوی کو باہر بھیجا جائے کیوں کہ وہ ایک شریف گھرانے کی عورت ہے، اور سڑک پر مارے مارے پھرتا اس کے بس کی بات نہیں۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی، اور وہ اپنے دونوں بچوں اور

بیوی کے ساتھ میسر گھر آگیا۔

اپنی بیوی کے بجائے خود کرامت علی سودا سلف لادیا کرتا۔

لیکن جب پڑوس میں سفارش کرکے میں نے اس کو بھی نوکر رکھا دیا تو وہ اپنی بیوی کلاتھ

بٹانے سے معذور ہو گیا۔

ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا — ”اجی تم خود ہی سودا لے آیا کرو نا۔

اس میں کیا ہرج ہے۔ پسینہ بہا کر روزی کمانا تو عین شرافت ہے، اس طرح کرامت علی اور اس کی بیوی نے شریفانہ کمائی شروع کی تو میاں جانی نے گورے جانی کا بوجھ اٹھالیا۔

ایک دن میاں جانی باورچی خانے میں بیٹھا ہوا گورے جانی کو سہارا ہاتھ، اس کی ماں کچھ سامان لانے کے لیے بازار گئی ہوئی تھی — گورے جانی نے باورچی خانہ کی دہلیز پر اجابت کر دی، تو میاں جانی سوچنے لگا کہ مالکن دیکھیں گی تو بہت برہم ہوں گی اس سے پہلے بھی ایک بار یہی حادثہ پیش آیا تھا تو مالکن نے اس کی ماں سے اس غلاظت کی شکایت کی تھی اور اس کی ماں نے اپنا غصہ میاں جانی پر اتارا تھا۔ میاں جانی کو وقت کم تھا۔ اس کو بہت جلد کوئی قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ بازار سے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرنے میں اس کا احتمال تھا کہ یہ بات مالکن کو معلوم ہو جائے۔ کچھ سوچ کر اس نے فوراً ایک کاغذ اٹھایا اور ساری غلاظت کاغذ سے صاف کر کے بہت احتیاط سے ڈرتا ڈرتا صحن میں پیچھا تاکہ مالکن کی نظر سچا کر غلاظت باہر پھینک آئے۔ وہ جب آہنگن میں پیچھا تو میری نظر اس پر پڑی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری موجودگی سے بالکل ناواقف تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ سوئی گھر سے یقیناً کوئی چیز چرا کر باہر لے جا رہا ہے، تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر کھا سکے۔ ٹاٹو، کیریا

اٹلی پر چھائیاں
اٹلی یا اسی قسم کی کوئی چیز اس کے ہاتھ میں ہو نا یقینی تھا۔ میں نے ذرا تیرا آواز
سے کہا۔

”مٹھو۔ چوروں کی طرح کیا چیز چھپا کر لے جا رہے ہو؟“
میری آواز بجلی بن کر میاں جانی پر گری۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا، اور
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، لیکن میکر اصرار پر بھی اس نے اپنا وہ ہاتھ میری طرف نہیں
بڑھایا جس میں اس نے کاغذ چھپا رکھا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ کھینچا تو
میاں جانی نے ڈرتے ڈرتے اپنا وہ ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس میں چھپی ہوئی کیرٹی ٹاٹ
یا اٹلی کے دیکھنے کے لیے میں باؤلا مہا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ غلاطت میں اٹا ہوا تھا۔
میں نے اس کا دوسرا ہاتھ فوری چھوڑ دیا۔ مجھے اس وقت اس پر بڑبڑایا گیا لیکن میں
نے اپنے غصے کو قاتم رکھتے ہوئے پوچھا کہ:
”گورے جانی کہاں ہے؟“

میاں جانی نے رسوئی گھر کی طرف اشارہ کیا۔
ساری باتیں میکر ذہن میں جمع ہو گئیں۔ میں نے اس سے رازدارانہ لہجے
میں کہا۔ ”بھاگ جاؤ اور فوراً ہاتھ صاف کر لو۔ بی بی سو رہی ہیں۔ لیکن آئندہ سے
کر تم نے رسوئی گھر کو گندہ کیا تو میری بی بی سے کہہ دوں گا۔“

میاں جانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اتنی ملتی نظریں میں نے بہت
لم دیکھی ہیں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس پر احسان کیا ہے، اور
وہ میرا احسان عمر بھر نہیں بھولے گا۔

زمین پر رگڑ رگڑ کر اس نے اپنے ہاتھ کو خوب خوب دھویا۔ اس کے چہرے کو

اُجلی پرچھائیاں
دیکھ کر میرے لیے یہ معلوم کر لینا بہت آسان تھا کہ کرامت کی وجہ سے وہ بڑے ذہنی کرب
میں مبتلا ہے۔ تین تین چار چار بار ہاتھ دھونے کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ میاں جانی اپنے
اس ہاتھ کو اپنے بدن سے اس طرح دور رکھے ہوئے تھا جیسے غلاطت ابھی تک اس
کے ہاتھ کو لگی ہوئی ہے۔ اس دن میاں جانی نے اپنے اس نجس ہاتھ سے کوئی کام
نہیں لیا۔

میاں جانی سگریٹ کی خالی ڈبیاں جمع کرتا رہتا۔ لیکن کبھی اطمینان اور فرصت
سے بیٹھ کر ان ڈبیوں سے کھیلے ہوئے میں نے میاں جانی کو نہیں دیکھا کبھی کبھار جب
گورے جانی سو جاتا تو وہ ان ڈبیوں سے کھیل لیتا لیکن سگریٹ کی ڈبیوں سے بنی ہوئی
اس کی ریل گاڑی دو چار سیٹیاں بجا کر دو چار اسٹیشن ہی چل پاتی کہ گورے جانی جاگ
جاتا۔ میاں جانی اپنی ریل گاڑی کے سارے ڈبوں کو الگ کر دیتا اور ریل کے یہ ڈبے
سگریٹ کی خالی ڈبیوں کی صورت میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں محفوظ ہو جاتے اور رہتا
ہو گا گورے جانی اس پر سوار ہو جاتا لیکن کئی منٹ تک میاں جانی کے دل و دماغ پر
ریل گاڑی قابض رہتی۔ وہ کچھ سوچ کر گورے جانی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتا
اور ریل کی سیٹی کی آواز نکالتا، جھک جھک کرتا، پاؤں گھسیٹتا ہو گا گورے جانی کو اٹھائے
باہر نکل جاتا۔ اس کے باوجود سگریٹ کی خالی ڈبیاں وہ بڑے انہماک سے جمع کرتا رہتا۔
مجھے میاں جانی پر ترس آتا۔ جو چیزیں اس کو حاصل نہ تھیں ان کا تو خیر ذکر ہی کیا
لیکن جو چیزیں اس کو حاصل تھیں ان پر بھی اس کو اختیار نہ تھا۔ اس کی غلیل کھوٹی سے
ٹنگی رہتی۔ اس کی سگریٹ کی خالی ڈبیاں ٹوکری میں پُری رہتیں، اور وہ صرف ان کی
حفاظت کر کے خوش ہوا لیتا۔ صرف اس امید میں رہتا کہ گورے جانی سے جب اسے

نجات ملے گی تو وہ ان سے نہایت اطمینان سے کھیلے گا اور جی بھر کر کھیلے گا۔

یہاں میاں جانی مجھے بالکل اپنی تصویر نظر آتا اور میں سوچنے لگتا کہ میاں جانی میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں جس دفتر میں ہوں وہاں کام کی اس قدر کثرت ہے کہ مجھے دفتر کے اوقات سے ہٹ کر گھر پر بھی فائیس لانا ہوتا ہے۔ میں جب کبھی نئی کتابیں خریدتا ہوں انھیں الماری میں جمادیتا ہوں یا اپنی مینر پرقرینے سے رکھ دیتا ہوں اور ایک لفظ بھی پڑھنے نہیں پاتا۔ لیکن کتابوں کو صف دیجئے رہنے سے بھی مجھے تسکین ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دفتر سے کبھی فرصت ملے گی تو بڑے اطمینان سے ساری کتابیں پڑھ لوں گا اور اسی امید میں جیتا ہوں۔ اس طرح میرے معاشرے نے مجھ پر بھی ایک گورے جانی کو لاد رکھا ہے لیکن اس کے باوجود میاں جانی کا دکھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے زخم میرے زخموں سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس لیے کہ میں زندہ ہوں گا تو کبھی نہ کبھی ان کتابوں کو پڑھوں گا لیکن میاں جانی زندہ رہے گا بھی تو گورے جانی سے نجات حاصل کرنے تک اس کی عمر زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے گی جہاں اس کے لیے خالی سگریٹ کی ڈبیوں اور غلیل میں کوئی دلکشی نہ رہے گی اور وہ اپنے ان پسندیدہ کھلونوں سے لطف اٹھائے بغیر زندگی کی موجودہ منزل سے محروم ہی گزر جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کھلونوں سے گورے جانی ہی کیلے۔

میاں جانی کا کوڑھی باپ قریب قریب روزی نہ کرتا۔ ایک آنے کی خشکاش کی کلیاں خرید کر پانی میں بھینکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور رات کو اس پانی کو چھان کر عطار لیتا۔ بڑی رات کو جب وہ اپنے کام دھندے سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا تو اتنے ہی بستر پر پڑ رہنے کی بجائے سچ انگن میں کھڑے ہو کر اونگھنے لگتا۔ اس وقت اس کو

دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے جو ار کا کوئی سوکھا ڈنٹھل فصل کٹ جانے کے بعد کھیت میں اکیلا بیج گیا ہو، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا ہو، لیکن طوفان میں اس ایک ڈنٹھل کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ بڑی رات کو اس کے گھر واپس لوٹنے تک میاں جانی اور گورے جانی سوچکے ہوتے۔ وہ اپنے حصے کا رات کا کھانا لے کر پہنچتا تو وہ اور اس کی بیوی میاں جانی کو جھنجھوڑتے کہ کچھ کھلا پلا کر سلا بیٹیں لیکن میاں جانی آنکھیں بند کیے ہوئے ہی چیخنے لگتا کہ ”مجھے نیند آرہی ہے۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا۔“

میسر بچے کی امتحان میں کامیابی پر میں نے اس کو کچھ کھلونے لادے تو اس نے اپنا پرانا لٹومیاں جانی کو دے دیا۔ میاں جانی کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی باچیس کھل گئیں لیکن فوراً ہی میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے جگنو بجھنے لگے اور وہ گورے جانی کو اپنے ہاتھ اور کوہے کے سہارے لٹکائے ہوئے لٹو کو بڑی حسرت سے گھورنے لگا۔ اس دن میاں جانی کو اس کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ دل بھر کر اپنے لٹو سے کھیل سکتا۔ میسر بچے کے لٹو سے اپنے لٹو کا مقابلہ کر سکتا۔

دوسرے دن صبح کو جب اس کی ماں باز آگئی ہوئی تھی تو میاں جانی، گورے جانی کو لے کر کہیں غائب ہو گیا۔ دوپہر تک سبھوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا ہے لیکن جب وہ دوپہر کو سبھی نہ آیا تو اس کی ماں اس کے باپ سے پوچھ آئی۔ جب اس نے لاطمی ظاہر کی تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میاں جانی محلے ہی میں کہیں گورے جانی کے رونے اور چلنے سے بے نیاز ہو کر اپنا لٹو گھما رہا ہو گا اور گورے جانی اس کے پاس ہی کہیں بیٹھا چنچ چنچ کر احتجاج کر رہا ہو گا۔ مجھے میاں جانی کی اس باغیانہ حرکت سے

جلی پر چھائیاں
 ایک حد تک سکون ہوا، اور میں نے طے کر لیا کہ شام کو وہ گھر لوٹے گا تو میں پوری طرح
 اس کی حمایت کروں گا اور اس کو پٹائی سے بچا لوں گا۔

میاں جانی نے چون کہ زندگی میں پہلی بار اس قسم کی بغاوت کی تھی، اس لیے اس
 کی ماں کچھ متفکر سی رہی اور اس کا باپ بھی اس کو اس پاس میں دیکھ آیا۔

شام ہوئی تو میاں جانی اپنے کو لہے پر گورے جانی کو لٹکائے دے پاؤں اپنے گھر
 میں چلا آیا۔ میں نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی، اور آئندہ ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید
 کی، اور اس کی ماں نے بھی میری نظر سچا کر اس کی گوشمالی کی۔ اس پر ان ساری باتوں کا
 کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ کچھ دیر منہ چھلائے وہ کھڑا رہا، اور گورے جانی کو ماں کی گود میں
 دو دو پتیا ہوا دیکھ کر اپنے کھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ بھوکا ہونے کے باوجود میں نے
 دیکھا وہ بہت مطمئن تھا۔

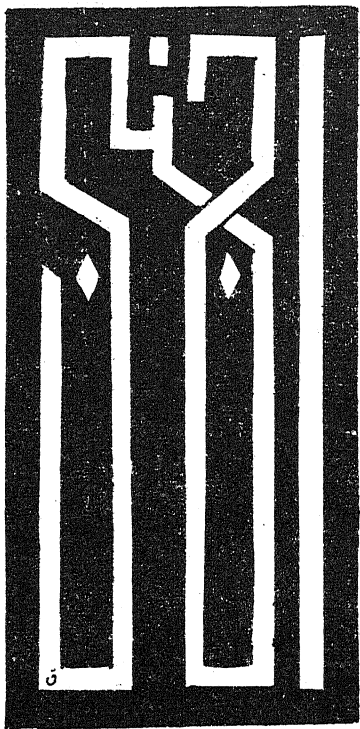
دوسرے دن میاں جانی اپنا لٹوا اور غلیل لے کر پھر غائب ہو گیا اور ابکی بار گورے
 جانی کو سبھی اس نے اپنے ساتھ نہیں لیا۔ دن بھر گورے جانی چیخ کر آسمان سر پر اٹھاتا
 رہا۔ اس کی ماں منٹ دو منٹ اس کو پچکار کر پوچھنے کا دم دھندے میں مصروف ہو جاتی
 — ماں کو سامنے چلتا پھرتا دیکھ کر گورے جانی کی نظریں اس کا احاطہ کیے رہتیں۔ لیکن
 جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو گورے جانی زور زور سے رونے لگتا — گود میں
 آنے کی غرض سے اس کے ہاتھ اٹھتے تو بے سہارا ہی رہ جاتے۔ آج میاں جانی کا داس
 گورے جانی کے آنسوؤں کو خشک کرنے کے لیے نہ رہا تو کسی داس نے بھی اس کے
 آنسو جذب نہ کیے۔ وہ جس قدر رو سکتا تھا روتا رہا۔ میاں جانی کو تلاش کرتی ہوئی اس
 کی منتظر نظریں جب تنہا گئیں تو نیند نے اس کو سہارا دیا۔ لیکن وہ تھوڑی دیر بعد

اُجلی پرچھائیاں
پہنناڑہ دم ہو کر اٹھ بیٹھا، اور نہایت اطمینان سے پھینچھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ
اس نے ریاض شروع کر دیا۔ اس کی ماں میاں جانی کو بددعائیں دیتی رہی۔

اس بار میاں جانی دن ڈھلنے کے بعد درانا خیر سے گھر لوٹا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں
سمجھ گیا کہ آج اس کی بہت پٹائی ہوگی کیوں کہ میں کسی کام سے باہر جا رہا تھا اور میری
عدم موجودگی میں اس کے ماں باپ بہت فرائض دیے۔ اس کو پیٹ سکتے تھے۔ چنانچہ یہی
ہوا۔ جب میں گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ میاں جانی کی جلتی ہوئی لکڑی سے تواضع کی گئی ہے اور
اس کو رات کا کھانا بھی نہیں دیا گیا۔

صبح ہوئی تو اسے ناشتہ بھی نہیں دیا گیا۔ مجھے بھی اس کا خیال نہ آیا۔ دن ڈھلے
مجھے معلوم ہوا کہ میاں جانی کی ماں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی شکایت مجھ سے
کیے بغیر اپنا لٹو اور غلیل چپ چاپ جلا دے تو وہ اس کو کھانا دے گی، ورنہ نہیں۔ اور
میاں جانی نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی۔

میں لپک کر باورچی خانے میں پہنچا تو دیکھتے ہوئے چولہے میں میاں جانی کا لٹو اور
غلیل جل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اڑ رہے تھے اور وہ دیکھتے ہوئے شعلوں
کو چپ چاپ تکتا ہوا تیز تیز نالے اٹھا رہا تھا



کیسا عجیب تنہا نیا ماسٹر۔ آبا کے سامنے آتا تو بالکل اس طرح ایٹھتا جیسے خشک کباب کو آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ شام ہوتی تو لان پر کرسیاں بچھ جاتیں۔ بچوں بیچ آبا کی ڈک چیر ہوتی۔ ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈائی بھجی جاتی عین اسی وقت سبز و شاداب ترلشے ہوئے پودوں کی بارٹ کے پاس نیا ماسٹر کچھ اس عالم میں کھڑا ملتا جیسے اس کا دوسرا قدم اس کو سیدھے دار تک لے جائے گا۔

آبا کی نظر پڑتی اور وہ اپنی بارعب آوازیں اس کو بلا لیتے — ”آئیے ماسٹر صاحب آئیے“

ماسٹر صاحب اس طرح آبا کی طرف بڑھتے جیسے ان پر ”ہینا ٹیزم“ کا عمل کیا گیا ہو۔ بالکل بے جان سے جیسے دل و دماغ سے عاری ہوں، اور پھر۔ آبا کے قریب پہنچے پہنچے تک جیسے ٹرٹکڑ ٹوٹتے رہتے، شیروانی کے دامن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اپنی رانوں میں دبائے ہوئے، ایک ہاتھ سے پٹھے ہوئے کالر کے ہک لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اوپر اٹھائے ہوئے

اجنبی اُجلی پر چھائیاں
زبان کو کبھی دانتوں میں دبائے، کبھی جڑوں میں اس طرح ٹھونکتے ہوئے جیسے کسی
نے گھوری دبا رکھی ہو اور باہر سے کمال پھولے پھولے نظر آئیں۔

”بیٹھے بیٹھے پان تنھوک کر شربت تو پی لیجیے۔ بانس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پتلا
قسم کا آدمی۔ بے یار و مددگار مسکور و خائف اس طرح کرسی پر بیٹھ جاتا جیسے کسی نے
سر پر ہاتھ رکھ کر اتنی قوت سے دبایا ہو کہ پاؤں جواب دے گئے۔ گلاس پر انگلیوں کی گرفت
کچھ اس طرح رہتی جیسے گلاس توڑ کر انگلیاں لال لال شربت خود پی جانا چاہتی ہوں شربت
کچھ اس طرح پیتا جیسے جنم جنم کا یہاں سا پانی پی رہا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ آبا پان...
لینے کے لیے کہیں۔ ان سے نظریں ملائے بغیر دوسرا ہو کر کورنش بجا لاتا۔ پتلی پتلی اکڑی ہوئی
انگلیاں جوار کے سوکے ڈنٹھ کی طرح جیسے ہو این جھولتیں۔

منی نے پہلی بار اس کو آبا کے سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو دل ہی دل میں اس نے طے کر لیا کہ
چاہے کچھ ہو جائے اس نے ماسٹر کے پاس بہر حال نہیں پڑھے گی۔ روہانسی ہو کر امی
سے کہنے لگی۔ ”امی اسکو فٹس آتے ہیں۔ اپنی نوربی کا کلو ہے نا امی بس بالکل اس کی طرح
نیا ماسٹر کھڑا کھڑا اینٹھنا ہے۔“

”لو جی، یہ کہاں سے پڑا جھڑا اٹھالائے تمہارے آبا؟“ امی کچھ اس طرح کہتیں
جیسے نیا ماسٹر کسی پرانے سامان کی دکان سے دستیاب ہو گیا ہو۔ سبھی منی کی ہاں میں
ہاں ملاتے۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو جیسے وہ آدمی کوئی اور متعجب نہ ماسٹر
کے ساتھ ساتھ اس کو کمرے تک پہنچانے آیا تھا۔ بالکل اطمینان سے ہم بچوں میں بیٹھا
ہوا ہنس بول رہا ہے، نہایت تمکنت سے کتابیں الٹ پھیر کر دیکھ رہا ہے۔ بیٹھی بیٹھی
باتیں کر رہا ہے۔ ”دیکھو بھئی، ہم تمہارے ماسٹر نہیں ہیں، ہم تو دوست ہیں تمہارے۔“

”لوجی، مشو میاں سوچنے لگے۔“ یہ تو دوست بنے آئے ہیں۔ بنا ہی لیں گے دوست، تب پتہ چلے گا۔“ اور انھوں نے اپنے ذہن میں دوست بنانے کے پروگرام پہلے بنانے شروع کیے۔

”نوج، کس کھنڈرے لڑکے کو پکڑ لائے ہو۔ بچوں سے کہہ رہا تھا کہ ہم تمہارے ماسٹر نہیں دوست ہیں۔“ امی نے آبا سے شکایت کی۔

”صدر مدرس صاحب نے بہت تعریف کی۔ کہتے تھے کہ اس کے تفویض جتنی جتنی کی گئی ہیں سب کے نتائج اچھے رہتے ہیں۔ بڑا معننی اور ذہین نوجوان ہے۔“

”بھئی خوب نوجوان پسند کیا آپ نے، بوڑھوں کو منہ چڑھاتا ہے مواد ذہانت بھی ایسی کہ دیکھتے ہی آدمی ذہن کا اندازہ لگا لے اور مارے خوف کے چنچ اٹھے۔ پتہ ہے آپ کو منی مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ دھائیں دھائیں رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ کلو کی طرح نے ماسٹر کو فٹس آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے بچوں کے بیچ میں لمبا ہو کر لگے گا خیں خیں کرنے۔ آبا بے اختیار سنس پڑے منی کو پکڑ کر گود میں اٹھالیا، جو امی کے پیچھے کھڑی مگر ٹکرا با کی صورت دیکھ کر جاری تھی۔ وہ منی کا منہ چومتے رہے اور ہنستے رہے۔“ منی نے ان کو مجھ سے ملنے آتے وقت دیکھا ہو گا۔“

”ہاں مشو کہہ رہا تھا کھڑی چپ چاپ تکتی رہی اس کو پھر بغیر کچھ کہے سے ایک دم وہاں سے بھاگی تو مجھ سے چمٹ کر دم لیا۔“

آبا پھر ہنسنے لگے۔ ”بھئی اس کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے نابھیا نے۔“ امی بھی ذرا سا مسکرا دیں۔ ”آپ نے کہہ کیوں نہ دیا کہ نیا ماسٹر آنے لگے تو بچوں کی آنکھوں پر کپڑیاں باندھ دی جائیں۔ بھئی خوب پسند ہے آپ کی،“ اور امی کو تو نیا ماسٹر

لیکن پہلے ہی دن نئے ماسٹر نے ہم سب کو رجھا لیا۔ منی البتہ اس روز نہ آنا تھی نہ آئی جب وہ جانے لگا تو ٹوپی سر پر اوڑھتے ہوئے اس نے کہا۔ بابا ڈنڈا دیکھ تو لینا۔ آبا باہر ہیں یا اندر چلے گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنا جلد اندر نہیں جلتے اور پھر بات کرنے میں ان کی آوازیں بھی تو مٹا سناؤ دے رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے پیٹ سے اپنی آگہی کا ثبوت دیا۔

ہاں بھئی۔ آواز تو آرہی ہے۔ لیکن اچھے بچے اپنے ماسٹر کی بات فوری مان لیتے ہیں۔ یہ پہلے دن بہت ہی نرم قسم کی تنبیہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اور فوری کسر کے دروازے تک بڑھ کر آبا کو دیکھ آیا۔

”ہیں ماسٹر صاحب“

”دیکھ میں یاد دہاؤں کہ کچھ لوگ۔“

اور میں نے بات کاٹ دی ”جی ہاں اور لوگ بھی ہیں۔“

”اچھا بابا، آبا دیکھ کس طرف سر ہے؟ ان کا چہرہ اس طرف ہے یا پیٹھ؟“

میں نے آبا کو زندگی میں لاکھ بار دیکھا تھا۔ ان کو چھو استھا، ان کو پیار دیتے تھے

پیار کیا تھا، جب ذرا اور چھوٹا تھا تب باہیں گلے میں ڈال کر اپنے پیرزین سے اٹھالے

تھے اور جھولتا رہا تھا۔ لیکن اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی پیٹھ اس طرف ہے

تو چہرہ اس طرف ہونا چاہیے۔ لوگ بات کر رہے ہوں تو ان کو اونگھنا چاہیے ماسٹر جا رہا ہو تو

ان کو باہر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ماسٹر صاحب کے جانے سے ان

کے ادھر ادھر دیکھنے کا کیا تعلق ہے۔ میں بھی سب کچھ سوچتا رہ گیا تو اس نے پھر مجھ سے کہا۔

”بابا ذرا دیکھ تو لینا کہ آبا کس طرف....“

میں نے دیکھ کر کہا کہ ان کا چہرہ اُس طرف کو ہے اور وہ مہتمم صاحب پولیس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ جیسے سین کر کھل اٹھا۔

ٹوپی اوڑھی، سہمے ہوئے سے، ڈرے ہوئے سے، بیڑھیوں تک پہنچے۔ پلٹ پلٹ کر دو تین بار آبا کی طرف دیکھا۔ اچھی خاصی ٹوپی کو چپ سے درست کیا۔ شیروانی کے دامن کو پتلی پتلی انگلیوں کی گرفت میں لے کر اپنی رانوں میں اڑس لیا۔ زبان دانتوں میں دبالی پھر فوری جیسے گلوری کال میں دیا کر کال بھلا لے رہے مڑ مڑ کر کن کھاتی ہوئی تنگ کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بارہ کی طرف لپکے جیسے اب گریں گے اب گریں گے، اور ابائے سامنے ہی دیکھتے کے دیکھتے اٹیریاں رگڑ کر مر جائیں گے۔ کیسا عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ جیسے ہم کو پٹر چلنے کے بعد ہمارا ماسٹر... دروازے تک گیا۔ اور وہاں سے کسی دوسری آدمی کو آبا کے آگے ڈھکیل کر خود بڑے اطمینان سے جیسے پیچھے ہٹ آیا۔ بالکل نیا اور اصنی سا کوئی شخص ہمیں باہر نظر آتا، جو دروازے تک ہمارا ماسٹر ہی تھا۔ لیکن اب جانے کون ہو ہم تو نہیں جانتے تھے اس کو۔

منی پر نہ امی نے جبر کیا نہ آبانے۔ ہاں ہم سب سے جب اس نے نئے ماسٹر کی تعریف سنی تو اس کی ہمت بندھی، آیا کی انگلی اٹھامے دروازے تک آکر تاک جھاٹ کرنے لگی پھر آہستہ آہستہ دروازے کی دراز سے نئے ماسٹر کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی۔ دونوں میں اسی طرح مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا، اور ہم سب کے سب منی کو نئے ماسٹر سے قریب کرنے کے لیے گویا اس کی مدد کرتے اور کچھ دیر پڑھنے لکھنے کی بوجھل بوجھل سی فضا منی کی آمد سے مسکراہٹوں اور تعریف کی نظر ہو جاتی، جو ہمارے لیے ایک وقتی نعمت سے

ماسٹر پسند آجھی جائے تو ساری کی ساری کتابیں کیسے پسند آجائیں گی، اور پھر حساب میں تو میں ٹھوس تھا۔ سو منی کی آمد ہم سب کے لیے اہمیت کی حامل ہوتی۔

منی اب اکیلی بھی دروازے تک آنے لگی پھر کمرے میں بھی اس نے قدم رکھا۔ پھر نئے ماسٹر کی گود تک آ پہنچی۔ پھر روزانہ ہمارے ساتھ بولتا قاعدہ اور کنگ پر امر بغل میں دا بے وہ ماسٹر صاحب کے پاس آنے لگی۔ اب ظاہر ہے کہ منی میں ہمارے لیے کوئی دلکشی باقی نہ رہی۔ لیکن ہم کبھی نئے ماسٹر سے بور بھی نہیں ہوئے۔ اس میں پتہ نہیں کہ کون اسی خوبی تھی۔ نئی نئی دلچسپیاں ہمارے لیے پیدا کر دیتا۔ اس نے کوئی بات نصیحت کرنے کے انداز سے کی ہی نہیں۔ شرارت کی بھی تو مارنا تو رہا ایک طرف ڈانٹ تک اس نے نہ بتائی۔ کچھ عجیب سی آنکھوں سے سنٹ بھرتا رہتا۔ پھر بہت نرمی سے کہتا۔ ”جاؤ اب پڑھنے سے جی اچاٹ ہو چکا ہے تو تھوڑی دیر کھیل لو، اور ہاں تم دن میں شاید بہت کم کھیلتے ہو اور پڑھنے میں بہت وقت لگا دیتے ہو۔ دن میں جی بھر کر کھیلنا چاہیے تاکہ میری موجودگی میں دل لگا کر پڑھ سکو۔ جاؤ تھوڑی دیر کھیل لو“ لیکن میں جانے سے انکار کرتا۔

مشو میاں نے کتاب کا ورق ورق الگ کر رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے مشو میاں کو کچھ نہیں کہا۔ لگے کتاب ہی کی بُرائی کرنے۔ کہنے لگے اتنی بری جلد ہو تو بھلا ورق ورق الگ نہ ہو گا۔ وہ تو مشو میاں نے اس قدر احتیاط سے رکھا ورنہ ساری کتابیں ٹکڑا کے کٹے ہوئے تینگ بن کر ہواؤں میں بھرتی رہتی۔ جھٹ سے انھوں نے کتاب کو سیسلا کر کورس پر چڑھایا۔ الٹی سیدھی تصویر اس پر بنائی، شوخ و شنگ رنگ بھرے

اور مشویمیاں کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ”دیکھیں ماسٹر صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کی مشویمیاں کتنی قدر کرتے ہیں مشویمیاں نے نئی جماعت میں نثر کی توجیح کتابوں کی توں رہی۔

دل ہی دل میں ہم سب نئے ماسٹر کو چاہنے لگے اور نئے ماسٹر نے ہماری محبت کا

خوب فائدہ اٹھایا کوئی دن ایسا نہ گذرتا جو ہم سارے کا سارا ہوم ورک خوشی خوشی نہ کر دیتے۔ ”غنجہ“ پھول۔ پیام تعلیم۔ سب ہی رسالے آبا کے پاس عریضہ لکھ کر ماسٹر صاحب

نے جاری کروا دیئے۔ کتنے شوق سے ہم یہ رسالے پڑھتے۔ ماسٹر صاحب کبھی کوئی کہانی کبھی کوئی نظم پریشان کر دیتے کہ ہم غور سے پڑھ کر اپنی رائے لکھ رکھیں۔

مشویمیاں اور میں اپنی اپنی رائیں ایک دوسرے سے چھما کر لکھ رکھتے۔ اپنے ہوم ورک میں یہ اضافہ ہمیں بہت بھلا لگتا۔ آبا نے منگوانے کو تو سارے پرچے منگوا لیے لیکن

ہمیں انہماک سے پڑھتا ہوا دیکھ کر وہ کچھ زیادہ خوش نہ ہوتے۔ ایک دن کہنے لگے کہ بھئی تم لوگ اپنی کورس کی کتابوں پر زیادہ وقت دیا کرو۔ ہم دبی زبان سے انہیں سمجھاتے

کہ ہم نے سارے کا سارا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ یہ گئے یہ رسالے سو وہ لفظ لفظ چاٹ لینے تک ہمیں چین نہ پڑتا۔ لیکن یہ بات آبا سے کس طرح کہی جاسکتی تھی۔

بلی کو دودھ سے بھری ہوئی پیالی تک پہنچانے کے لیے جن بھول بھلیوں سے گزارنا تھا وہ مجھے بھولا اور نہ مشویمیاں سے۔ ”پیام تعلیم“ کے آخری صفحے پر بنے ہوئے اس خاکے کو تکتے تھکے۔

ہماری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ انگلی کو کاغذ پر گھما کر کچھ دوتک ہم بلی کو لے جاتے کہ راستہ آگے کے لیے نہ ملتا، اور ہماری پوسی رانی گویا دودھ کے لیے تڑپ کر رہ جاتی

اب ماسٹر صاحب آئیں تب ہی دودھ ملے اور پیٹ بھرے پوسی رانی کا۔ ماسٹر صاحب پوسی رانی کی دودھ کی پیالی تک پہنچنے میں مدد کر رہے تھے کہ سنی کی آواز آئی کہ

”آبانے کہا ہے کہ ماسٹر صاحب جانے سے پہلے ضرور ملتے جائیں“

ماسٹر صاحب جیسے دودھ کی پیالی تک پہنچنے کا راستہ خود بھول گئے تھے۔ آیا کہہ کر چلی گئی۔ لیکن ادھ کھلے دروازے کی دراز کو وہ اس طرح گھور رہے تھے جیسے آیا کا چہرہ اب تک تک رہے ہوں۔ ان کا جی دیکھتے کے دیکھتے اچاٹ ہو گیا۔ کدھر ٹھٹھی ٹھٹھی باتیں کرتے۔ ہنستے بولتے پوسی رانی کو دودھ کے پیالے تک پہنچانے کی فکر میں تھے کہ مہر بابا کا پیام سن کر جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا احساس ہوا جیسے آیا کے ساتھ ماسٹر صاحب بھی کہیں چلے گئے ہیں اور ہیں اس آدمی کے حوالے کر گئے ہیں جو روز شام کو دو وقت آتے اور جاتے آبا کے آگے سے گذرتا ہے۔ جو ہمارا ماسٹر نہیں ہے بلکہ کوئی اجنبی ہے جس کو ہم صرف آتے اور جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

مشو میاں نے کہا ”ماٹ صاحب وہ جو بھول“ میں ایک نظم ہے نا — وہ — وہ جس کا غنواں ہے“

لیکن ماسٹر صاحب کن کھائے تنگ کے مانند خلاؤں میں کہیں ڈول رہے تھے۔ مشو میاں کی بات جیسے ان کے اپنے کانوں ہی میں دس ٹپکا کر رہ گئی تھی۔

”ماٹ صاحب — وہ جو —“

لیکن جیسے آبا کے سامنے سے گزرنے والے اجنبی نے پوچھا، ”بابا“ آبانے کیوں ملنے کو کہا ہو گا؟“

”امی کہہ رہی تھیں کہ کل جن لوگوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے، ان میں ماٹ صاحب بھی شامل ہیں“ میں نے امی سے سنی ہوئی بات دہرا دی لیکن ماسٹر صاحب نے سنا۔

اجلی پرچھائیاں
اجنبی
”آج کچھ کہا تھا کیا آبا نے؟“

”ہاں ماٹ صاحب“ مشومیاں جھٹ سے بولنے لگے۔ لیکن میں نے انکشافات کا سہرا اپنے سر لینے کے لیے کہا۔ ”آبا کہہ رہے تھے کہ ہم کو رس کی کت میں چھوڑ کر کہا نیوں اور نظموں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

کن کہا یا ہوائینگ جیسے غوط کھا کر زمین پر سرکے بل بیٹھ گیا۔

”بابا، کیا آبا نے رسالے پڑھنے سے منع کیا تھا؟“

”نہیں ماٹ صاحب“ میں نے اور مشومیاں نے یک آواز کہا۔

”پھر کیا کہا تھا آخر؟“

ہم نے وہی باتیں دہرائیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ماسٹر صاحب کچھ بھی نہ سن سکے تھے۔ اس لیے کہ وہ میرا اس اجنبی کو ہمارے نرغے میں چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے پڑھنا ختم کر کے وہ اٹھنے لگے تو مجھ سے کہا۔ ”بابا، ذرا دیکھنا تو آبا کیلے ہیں یا اور بھی کوئی؟“

میں نے سیڑھیوں پر پہنچ کر دیکھا تو دو ایک آدمی اور بھی تھے۔ جو میں نے

ماسٹر صاحب کو بتا دیا۔ انھوں نے بالکل ایک بے جان لکڑی کے پتلے کی طرح کمرے سے

باہر قدم نکالا، بالکل اس طرح آبا کی جانب بڑھے جیسے دبے پاؤں ان تک پہنچ کر ان

پر حملہ کر دیں گے۔ نہیں میں نے غلط کہہ دیا۔ حملہ کرنے کے ارادے کے پیچھے کس تند و خوراعا

رہتی ہے۔ یہاں تو ماسٹر صاحب آبا کے حلقے سے بچنے کی فکر میں تھے۔

بالنس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پتلا قسم کا آدمی بے یار و مددگار مسخ و خا

ستھو دس گز کا فاصلہ طے کرنے تک مڑ مڑ کر ٹوٹتا رہا۔ شیردانی کے دامن کو چٹکی میں پکڑ کر

انوں میں دبائے پھٹے ہوئے کالر گاگ لگانے کی ناکام کوشش میں جوار کے سوکھے

اصلی پرچھائیاں

اجنبی

سنٹھ کو ہوا میں پختے وہ آبا کے آگے مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا، پھر ان کے اشارے پر اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے راری کے اشارے پر بندر یا چھوٹی سی تپائی پر ٹک جاتی ہے۔

آبا نے یقیناً انہیں دوسرے دن دعوت میں آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں برآمدے میں کھڑا ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ سب کچھ تو میرے پلے نہ پڑا۔ ہاں اننا ضرور سمجھ سکا کہ آبا رسالوں میں ہماری غیر معمولی دلچسپی کے تعلق سے ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں میں چاہتا تھا کہ ہمارا ماسٹر دل کھول کر آبا سے باتیں کرے، انہیں وہ ساری باتیں سمجھائے جو ہمیں سمجھانا ہے۔ وہ صاف صاف کہہ دے کہ آبا ان معاملات میں دخل نہ دیں جیسے وہ کئی بار ہمارے سامنے کہہ چکا تھا کہ صدر مدرس صاحب کے بچوں کو اس نے صرف اس لیے پڑھانا چھوڑ دیا کہ وہ بے سبب دخل و مداخلت کرتے تھے۔ لیکن اس نے آبا سے کچھ نہ کہا۔ یہ تک نہ کہا کہ ہم لوگ اپنا ہوم ورک برابر کر لیتے ہیں۔ کبھی ادھر رہیں چھوڑتے اور صبراً ان رسالوں ہی کے ہو کر نہیں رہ جاتے، اور پھر ان رسالوں کی مدد سے اس نے ہم میں نہ سنسٹر پڑھنے کا شوق پیدا کیا تھا بلکہ اتنی بصیرت پیدا کی تھی جو ہماری عمر کے بچوں میں نہیں سمیٹ کر سکتی۔

مجھے ماسٹر صاحب کی اس خاموشی اور بندوبست پر چہاں فصّہ آیا وہیں بے پناہ ہمدردی بھی ہوئی۔ ہمدردی اس لیے کہ آبا کے آگے ہمارا ماسٹر موجود ہی نہ تھا۔ وہاں تو وہی اجنبی تھا۔ جو روز شام کو دودھ لٹکانے کے آگے سے سہا سہا سا گذرتا ہے

دوسرے دن سارے کے سارے پرچے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اور مشویماں باور کیجیے دور روز بالکل ادا اس رہے، پڑھنے میں جی ہی نہ لگتا۔ اب یہ رسالے ہیں

اُٹھی پر چھائیاں

ابھی

ہفتے میں عشر ایک دن ملنے لگے۔ نیا ہفتہ شروع ہوتا تو ہم نئے شمارے کی آمد کے منتظر رہتے۔ لیکن ابکی بار نیا شمارہ بھی غائب تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب آئے تو معمول سے کچھ زیادہ ہی خوش خوش تھے۔ غنچے کا نیا شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں اور مشومیاں جھپٹے تو انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر رسالے کو ہماری پہنچ سے دور کر دیا۔ کہنے لگے کہ آج تو ہم دونوں ہی سے مٹھائی کھائیں گے۔ لیکن یہ بات انہوں نے کچھ اتنے دھیمے سہمی کہی جیسے خوشی کی نہیں غم کی خبر سن رہے ہوں۔ ان کے چہرے پر جس نامعلوم خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے ان دنوں تو کم ہی محسوس ہوئیں۔ لیکن آج خیال کرتا ہوں اس کرب کی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اس خوف نے ہمیں بھی سمجھا دیا کہ چیخ کر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ دراصل ایک لمحہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا مشردہ سنانے والے ہیں۔ اور اس لیے بہت بے چین تھا۔

میں نے اچھل کر ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے نیا رسالہ چھین لینا چاہا تو انہوں نے مجھے جھک کر سینے سے لگا لیا۔ پھر خود ہی کچھ ورق الٹا کہ رسالہ میری طرف بڑھا دیا۔ علانیہ میرا نام جیسے چمک رہا تھا۔ میری کہانی چھپ چکی تھی، میں چاہتا تھا کہ رسالہ اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ ناچتا، اچھلتا بھاگا بھاگا آبا کے پاس جاؤں، امی سے چپٹوں، انھیں بتاؤں کہ میرا نام چھپ کر آیا ہے۔

مشومیاں الگ اچھل پڑے ان کی پہیلی بھی چھپ چکی تھی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو پرچہ انہوں نے ہمیں دے دیا۔ کہنے لگے ”ابا اور امی

سے چھپا کر پڑھنا اور ابھی انھیں بتلانا مت۔

اس قسم کی مجبوری خدائے دے کسی کو۔ اپنا کارنامہ کسی مذموم فعل کی طرح چھپاتے پھرناد وہ بھی اس عمر میں جو بجائے خود کارنامہ ہی کا رنامہ ہو۔

دل پر وہ وہ بیتی ہے کہ آج اس شدت احساس کا اعادہ مشکل ہے۔ رسالہ بند کرتا تو مشو میاں جھپٹ پڑتے۔ مشو میاں جھپٹ پڑتے تو جھٹ سے بند کیے ہوئے رسالے کو کھول کر جہاں میری اپنی انگلی پہلے ہی سے بطور ترک محفوظ رہتی میں اپنا نام پھر ایک بار دیکھ لیتا جو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے روشنائی سے نہیں روشنیوں سے لکھا گیا ہے۔

کتنی بار دل فستق پائی ہے۔ وہ تو جیسے قسم کھائے بیٹھا تھا کہ ماسٹر صاحب خواہ برامین یا روٹھ جائیں لیکن اس قسم کی مہمل پابندیوں کو اپنے پر عائد نہیں کریگا دل ہی تو متناوہ بھی نتھامتا سا۔ آبا بھلا برا کیوں مانیں گے۔ کلاس میں تو سب ہی پاس ہوتے ہیں۔ اس طرح کہانی تو ہر ایک کی نہیں جھپتی نا۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ کوئی چپکے سے کانوں میں کہتا۔ آبا اور امی سے چھپا کر پڑھنا۔ ابھی انہیں بتلانا مت۔ آبا اور امی سے۔۔۔۔۔ ابھی انہیں بتلانا مت۔

دل میں پھٹ پھٹ چھوٹ رہی ہوں تو اس کی جوت کم سے کم چپکے پر تو دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ جوت کسی نے نہیں دیکھی۔ میں نے ہمت کی۔ پرچہ اپنے ہاتھ میں تنھائے بے وجہ امی اور آبا کے آگے سے سوا بار گزرا ہوں۔ کن انکھوں سے میسر ہاتھ میں پرچے کو دیکھ کر انھوں نے دانستہ ہی اس ضمن میں کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ جی کس کس طرح چاہا ہے کہ امی جھوٹ موٹ پوچھ لیں کہ ہاتھ میں کیا ہے اور میں انہیں چمٹ کر بتلاؤں کہ ہاتھ میں پرچہ ہے اور پرچے میں میرا نام ہے۔ لیکن آبا یا امی نے ایسی کوئی بات ہی نہ کی۔ آبا اٹھ کر سونے کے لیے جب اپنے سونے کے کمرے میں جانے لگے تو میں

اُٹھلی پر چھائیاں

اجنبی

مجھ کو اس طرح اپنے بستر تک پہنچا جیسے کسی غنچوار کے سینے پر سر رکھنے کی خواہش کے آگے مجبور ہو گیا ہوں۔ چپکے سے لیٹ گیا تو پتہ نہیں کیوں میرا تکیہ میرے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ لیکن میں نے دوسرے دن یہ بات ماسٹر صاحب سے نہیں کہی حالانکہ اب دل یہ چاہنے لگا تھا کہ تکیہ میں سر دے کر اپنے کارنامے پر سسکنے کا حال ماسٹر صاحب کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے۔ دل بیک وقت کتنا چالاک اور مور کھ ہے۔ آج سوچتا ہوں تو وصف اس عمر پر پیار نہیں آتا ساری انسانی فطرت پر پیارا تا ہے۔

دوسرے دن جب ماسٹر صاحب نے پرچہ واپس لے جانے کے لیے مانگا تو میرا جی چاہا کہ ان سے لیٹ کر پھر روٹروں اس طرح گئی رات کا راز بھی ان پر افشا ہو جائے اور پھر ان کی ساری ہمدردیاں الگ۔ سٹیٹ لول گا۔ لیکن یہ آنسو بھی عجیب سی شے ہیں بعض وقت اس طرح جل دے جاتے ہیں جیسے ہم سے آشنا ہی نہ تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے خود ہی کچھ محسوس کیا اور کہا کہ ایک دن اور میں پرچہ اپنے پاس رکھوں۔

اسکول میں سالانہ امتحانات قریب میں ہونے والے تھے۔ ہمیں اس امتحان سے کچھ لینا دینا نہ تھا کیوں کہ آباہمیں آئندہ سال اسکول میں شریک کروانے والے تھے۔ بیٹھے بٹھائے ماسٹر صاحب نے میری نوٹ بک سے ایک کاغذ نکالا اور لگے عرضی گھسیٹنے۔ لکھ چکے تو جاتے ہوئے میرے ہاتھ میں تنہا کر کہا کہ آبا کو دے دینا آبا باہر لان ہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ پانی کا چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ ہوا میں مٹی کی کچھ سوندھی سوندھی سی بو تھی۔ ماسٹر صاحب کے جاتے ہی خوب خوب کھیلنے پر طبیعت مائل تھی۔ مجھے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہ تھا۔ آبا تک ماسٹر صاحب کی

اُجلی پر چھائیاں اجنبی

عرضی پہنچا نا۔ ان کے پڑھنے تک ادب سے کھڑے رہنا پھر ان کا جواب ماسٹر صاحب تک پہنچا نا۔ میں نے سوچا، صاف صاف کہہ دوں کہ ماسٹر صاحب آپ خود آبا سے مل لیجیے نا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں۔ سٹیڑھیوں تک آتے آتے ہمارے ماسٹر صاحب غائب ہو چکے تھے اور آبا کے آگے کن کھائے ہوئے نینگ کی طرح کوئی انہی ڈول رہا تھا۔ بالکل بے جان سا۔ جیسے دل و دماغ سے عاری ہو۔ مڑ مڑ کر ٹوٹتا ہوا۔ دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اُپر اٹھائے ہوئے۔ اف کیسی عجیب سی بات تھی۔ وہ یقیناً ہمارا ماسٹر نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں آج بھی نظروں سے اوجھل ہونے تک اس اجنبی کو دیکھتا رہا۔

میں نے ماسٹر صاحب کی عرضی امی کے حوالے کی کہ آبا اندر آئیں تو وہ انہیں دے دیں، اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھیلنے چلا گیا۔

رات کو آبا اندر آئے تو میں ساری باتیں بھول بھال کر اپنا ہوم ورک کر رہا تھا اور اس بات سے بالکل ناواقف تھا کہ آبا اور امی مسکرا مسکرا کر بڑی محبت سے میری طرف دیکھ دیکھ کر میسرے تعلق سے باتیں کر رہے تھے۔ آبا نے مجھے بھارا تو میں چونکا جب میں قریب گیا تو وہ کہنے لگے ”تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تمہارے ماسٹر صاحب نے کیا لکھا؟“ ظاہر ہے کہ میں نفی میں سر ہلا سکتا تھا۔ اس لیے کہ ماسٹر صاحب نے اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ آبا کہنے لگے کہ ”وہ تمہیں چھٹی جماعت کے امتحان میں بٹھانا چاہتے ہیں تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ تو اسکول میں ٹل کلاس میں تمہیں داخل کر سکیں تم دے سکو گے چھٹی جماعت کا امتحان؟“

میرا گھبرا جانا ضروری تھا۔ اس لیے کہ میں نے آج تک نہ کسی اسکول میں تعلیم پائی

اصلی پرچھائیاں
تھی اور نہ کہیں دیکھا ہی تھا کہ امتحان کس طرح دیا جاتا ہے ابانے مکرر پوچھا تو میں نے
صرف اس قدر کہہ دیا کہ ماسٹر صاحب کہتے ہیں تو میں دے سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا ابائیر
جواب سے کچھ مطمئن ہی تھے۔ لیکن امی کہنے لگیں کہ وہ ان کا ماسٹر خود نا تجربہ کار ہے۔ ذرا
آپ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی تو مشورہ کر دیکھیے نا۔ وہ تو آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔
ابانے صفحہ اتنا کہا کہ میں ماسٹر صاحب کو یہی جواب دے دوں کہ وہ اس ضمن میں
ہیڈ ماسٹر صاحب سے مشورہ کر کے انہیں جواب دیں گے۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب آئے تو انہوں نے نشست سنبھالنے سے پہلے ہی مجھ
سے پوچھا کہ ابانے کچھ جواب دیا۔ میں نے جواب کہہ سنایا۔ تو وہ بڑے منہم سے بیٹھے
ہوئے کچھ دیر غلاؤں میں گھورتے رہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بیٹھے نہیں ہیں بلکہ
نظرے کھڑے ہی اس اجنبی سے گلے مل رہے ہیں جو روزنامہ کو ابائے کے سامنے سے گزرتا
ہے۔ اس دن ماسٹر صاحب نے نہ ہمارا ہوم ورک ہی ٹھیک سے دیکھا نہ پڑھانے
میں دلچسپی لی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو دروازے تک پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے، کہنے لگے ”بابا“ ذرا دیکھنا
ابائے کے پاس کون کون ہیں؟ میں نے دیکھا تو ابائے اور ہیڈ ماسٹر صرف دونوں ہی تھے میں
نے جب ماسٹر صاحب سے کہا تو ان کے قدم جیسے زمین میں گر کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے
منوں نے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ٹیڑھ بول پر پہنچتے پہنچتے جیسے کہیں غائب ہو گئے
میں نے دیکھا کہ آج وہ اجنبی کچھ زیادہ ہی بوکھلایا ہوا ہے جو ابائے کے سامنے سے گزرتا
ہے لیے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ چلتا چلتا بالکل اس طرح رکا جیسے
لوں میں اس کا وزن بوجھ ہو گیا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے وہیں سے پکارا ”ماسٹر صاحب ذرا“

اصلی پرچھائیاں
 اجنبی اور اجنبی محرموں کی طرح سہا سہا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی غیبی قوت
 نے اس کو دہرا کیا پھر سر پر اتنا بوجھ پڑا کہ اس کے پیر جواب دے گئے۔ اور وہ سیدھا
 تنہا ہوا مٹی کے گڑے کی طرح کرسی پر ٹک گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اس سے مخاطب ہوئے۔ ”صاحب کا خیال ہے کہ اگر آپ کو اس
 بات کا پوری طرح یقین ہے کہ بابا کامیاب ہو جائیں گے تو انہیں امتحان میں شریک کر دیجئے۔
 کامیاب نہ ہوں تو آئندہ سال ساتویں جماعت میں داخلے کا امکان اس لیے ختم ہو جائے گا
 کہ صاحب اس کو مناسب نہیں سمجھتے۔

اُور ہاں ”ابا کہنے لگے۔ ”پہلی بار ناکام ہو تو بچہ امتحان سے ہمیشہ کے
 لیے خائف ہو جاتا ہے۔“

”ہاں صاحب یہ بچوں کی نفسیات ہے۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایمان
 لانے کے انداز میں تائید کی۔

میراجی کس قدر چاہا کہ ہمارا ماسٹر اس خود آگہی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ
 ان لوگوں میں کرے جو وہ پڑھاتے وقت کیا کرتا ہے۔ لیکن جیسے یہ ناممکن تھا۔ اس
 لیے کہ وہاں تو ہمارا ماسٹر تھا ہی نہیں۔ وہ کم آمیز اجنبی تھا جو شاید اپنے وجود سے
 بھی ڈرتا ہے۔

جوتے کی ٹو سے قدموں تلے بچھی ہوئی لان کو کریدتے ہوئے اور جھکی جھکی
 نظروں کو ابا سے ملانے کی کوشش کرتے ہوئے جب وہ مبہوت بیٹھا رہا تو ابا نے
 اس کو پھر سوتے سے جگایا۔

”وآخر آپ کا کیا خیال ہے؟“

اجلی پر چھایاں

اجنبی

اس نے اس لجاجت سے درخواست کی کہ جیسے آبا کے انکار پر ان کے قدم ہی تو پگھلے گا۔ جیسے میرا امتحان میں نہ بیٹھنا اس کے لیے باعثِ تعزیر ہو۔

میری امتحان میں شرکت طے ہو گئی تو وہ دوسرے دن سے غائب تھا۔ تین دن ہو گئے لیکن اس نے ہمارے گھر کا رخ نہ کیا۔ مجھے ہمارے ماسٹر صاحب کے چھوٹے بھائی سے جو میرا دوست تھا اور کبھی کبھی ملنے آتا تھا معلوم ہوا کہ وہ بالکل اچھے خاصے ہیں اور بلاناغہ اسکول جاتے ہیں۔

آبا نے منشی جی کو سمجھا کر انھیں بلوایا اور نہ آنے کا سبب دریافت کروایا تو ماسٹر جی نے کہلا بھیجا کہ انھیں شدید بخار تھا۔ مجھے یہ جھوٹ اچھا نہیں معلوم ہوا لیکن ماسٹر صاحب تو ہمارے چیتے تھے نا۔ میں نے پردہ پوشی کی جیسے ان کا محسن ہوں۔ وہ پھر آنے لگے اور مجھ سے تین دن نہ آنے کا کوئی سبب بھی نہ بتایا۔

امتحان ختم ہوا تو اپنی کلاس کے ضلع جہ کے سارے بچوں میں مسیکر نمبر زیادہ تھے ہید ماسٹر صاحب آبا کو مبارک باد دینے آئے تو آبا نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمارے ماسٹر صاحب کی بہت تعریف کی اور اتنے اچھے ماسٹر کے مقرر کرنے پر ہید ماسٹر صاحب کا منوں نے پھر ایک بار شکریہ ادا کیا، ہمارے ماسٹر صاحب ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں مجھے کچھ زیادہ سبلی بھی نہ لگیں۔ اس لیے کہ میری اپنی اہمیت میری سنایاں کا مانیابی کے باوجود جزوی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ہید ماسٹر صاحب نے میری پٹیٹھ ٹھوٹک کر مجھے چٹا کر میری تعریف کی اور اپنے پاس ہی کرسی پر بٹھالیا تو پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہا کہ اب وہ مارے ماسٹر صاحب کی اتنی تعریفیں کریں کہ آبا ان کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ پھر ماسٹر صاحب کی باتیں شروع ہو گئیں — خود آبا کہنے لگے کہ اس مبارک و مسعود موقع پر ماسٹر صاحب

اجلی پر چھائیاں اجنبی

کے اب ناک نہ آنے کا انھیں بڑا دکھ ہے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ انھیں اس کی اطلاع ہے کہ ماسٹر صاحب ان سے کچھ خطا بھی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو آبا کا یہ سنجیدہ رد عمل، میں نے محسوس کیا کہ کچھ ٹھیک نہ معلوم ہوا، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آبا ایک معمولی ماسٹر کو اتنی اہمیت دیں کہ اس کے حوصلے ان سے خفگی تک بڑھ سکیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔ ”یہ آپ کیا فرماتے ہیں صاحب۔ وہ سبلا آپ سے کیا خفا ہو سکے گا جس قدر ایسا نادر آدمی ہے اتنا ہی سخی بھی ہے۔ بالکل موڈی۔ لیکن آبا کی نظر میں جیسے ان باتوں سے بھی ہمارے ماسٹر صاحب کی اہمیت کم نہ ہوئی۔“

وہ کہنے لگے ”میں آبا کو نشی جی کے ساتھ ان کے گھر بھجوا رہا ہوں۔ وہ اس پر بھی نہ آئیں تو سوچا ہے خود ان سے ملنے چلا جاؤں۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ آبا تمھارے آبا چوں کہ ضلع کے سب سے بڑے عیدار ہیں اس لیے ذرا سے سینک بھی ہیں۔ بالکل موڈی۔ لیکن جیسے ان کی گنگائی بندھ گئی تھی۔

میں نشی جی کے ساتھ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے مجھے آتا ہوا دیکھ کر ایک ہی جست میں اپنی چوکھٹ اور سیڑھیاں پھلانگ لیں۔ جھپٹ کر مجھے اپنے سینے سے چٹالیا۔ میری آنکھیں، میرے گال، میری پیشانی چٹا چٹ چومنے لگے۔ مجھے شرم آتی رہی اور نشی جی کھڑے اپنی محدبیشہ والی عینک سے اپنی آنکھوں کی جوت بڑے پیار سے ہم پر پھینکتے رہے۔ ماسٹر صاحب مجھے چوم کر سیدھے ہوئے تو فوری انھوں نے منہ پھیر لیا۔ لیکن ان کا آنسو پہلے ہی میری پیشانی سے دھلک کر میری ناک پر پہنچ چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انھوں نے جس عطر سے مجھے لپٹا یا تھا۔ اسی

اجلی پرچھائیاں

اجنبی

سرعت سے مجھے چھوڑ کر وہ الگ کیوں ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اپنے سینے میں بھی آنسوؤں کا ایک سمندر ہے اور وہ آنکھوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور میں بے طرح سسکنے لگا۔ یہ سب کچھ دیکھتے کے دیکھتے ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ مجھے تمام کراپے برآمدے تک لے آئے، اپنے آنسو چھپا کر میرے آنسو پونچھے۔ سامنے دھری ہوئی لکڑی کی معمولی سی کرسی کھینچ کر مجھے بٹھایا۔ اسٹول منشی جی کی طرف بڑھایا اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کیوں کہ ان کے اپنے بیٹھنے کے لیے صرف مٹی کا فرش باقی تھا۔ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کیں۔ ان کو کھڑا دیکھ کر میں بھی اسٹول کھڑا ہوا تو وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے برابر بٹھالیا۔

میں لوٹنے لگا تو آنکھوں نے میری پیشانی چومنی چاہی، جیسے بہت بزرگ آدمی ہوں۔ درآنحالیکہ امی تو انھیں فسلر اس لیے خاطر میں نہیں لاتی تھیں کہ ان کی نظر میں نیا ماسٹر بالکل نا تجربہ کار لڑکا تھا۔

میں نے لوٹتے لوٹتے ان سے پوچھا کہ وہ سارے پرچے میرے حوالے کر دیں تاکہ میں کم سے کم اپنی چھپی ہوئی چیزیں اس موقع پر آبا اور امی کو بتلا سکوں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ ایک دم کھل کر گلزار ہی گلزار بن گیا۔ کہنے لگے ”بابا میں تو سمجھتا ہی گیا تھا۔ پیا تعلیم میں تمھاری تازہ کہانی چھپ چکی ہے۔“ اور وہ اس طرح اندر جھپٹے جیسے ایک منٹ کی تاخیر بھی کسی بنے بنائے کام کو بگاڑ دے گی۔ جیسے تنھوڑی سی دیر ہو جائے تو میری کہانی کے صفحات بالکل سادھا سادھا سے لگنے لگیں گے اور ان کے سارے کے سارے حروف مٹ جائیں گے۔

سہ رنگی ٹائٹل کا خوبصورت سارسالہ میسر ہا تھا میں تنہا میں جب اوراق

اجلی پر چھائیاں
الٹ پھیر کر دیکھ چکا تو اسنوں نے مجھ سے یہ کہہ کر واپس مانگ لیا کہ آج شام ”میں خود اپنے
ساتھ وہ پرچے بھی لے آؤں گا جن میں تمھاری کہانیاں چھپی ہیں میں چاہتا ہوں کہ آبا
کو ساری چیزیں خود ہی بتاؤں“

شام تک ماسٹر صاحب کا منتظر رہنا سیکر لیے معمولی بات نہ تھی۔ میں نے صرف
ایک ہی بار تو اپنا نام ”پیام تعلیم“ میں دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس دل ہی دل میں
رہ گئی تھی۔ جس کے لیے شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کو لان پر کرسیاں بچھ گئیں تو آبا کی آمد سے پہلے ہی میں کھیں کو دیں حصہ لیے
بغیر بہت ہی مقطع بنا ماسٹر صاحب کا منتظر تھا۔ وہ دیر تک نہیں آئے تو میری بے چینی بڑھنے
لگی، آبا نے دو ایک بار کہا بھی کہ ”و جاؤ کھیل لو، آج اس طرح یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ میں
نے کہا ”ماسٹر صاحب آنے والے ہیں نا۔“ آبا مسکرائے۔ کہنے لگے ”مجھے معلوم ہے بھی
وہ آجائیں تو میں تمہیں بلالوں گا۔“

لیکن اس غیر معمولی تاخیر سے میں مشتبه ہو چلا تھا، ہو سکتا ہے کہ وہ گجر کر نہ آئیں
اور مجھ سے جھوٹا ہوا ہی کہہ دیا ہو۔ میں گیٹ تک جا کر ان کا انتظار کرنے کے لیے اٹھا تو
ترشی ہوئی شاداب ہارٹھ کے پیچھے سے وہ بہت ہی مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔
میں نے دبی زبان میں آبا سے کہا بھی کہ وہ آگے ہیں لیکن وہ کسی صاحب سے باتیں کرنے
میں منہمک تھے۔ جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

ماسٹر صاحب آج پتہ نہیں اس آدمی کو کہاں چھوڑ آئے تھے جو آبا کے آگے
ہمیشہ ان کی نمائندگی کرتا آیا تھا۔ آبا کو باتوں میں منہمک دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون
ہوا کہ چلو ماسٹر صاحب کو یہ احساس تو ہے کہ آبا ان کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن

جلی پر چھائیاں
اسٹر صاحب آج آبا کے وجود اور عدم وجود ہی سے جیسے بے نیاز تھے میں نے پہلی بار اسٹر صاحب کو آبا
سے سائے اس طرح دیکھا جیسے وہ کمرے میں بیٹھے ہم بچوں کے نزع میں مطمئن ہوں۔
اس اثنا میں آبا کی نظر ان پر پڑی تو انھیں دور ہی سے دیکھ کر آبا تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے
البا اس تکیرم کے پیچھے کچلی ساری شکر بخیر یوں کا ازالہ بھی آبا کا مقصود ہو۔

آج ماسٹر صاحب میری سمجھ سے باہر تھے۔ آبا کو کھڑا دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے
سکرتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے رہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ آدمی پچھلے زندہ
ہیں ہو سکتا جو ہمارے ماسٹر کو بارہ نک لاکر پیچھے ڈھکیل دیتا تھا، اور خود آبا کے آگے
اس طرح کی حرکتیں کرتا جیسے بقول منی کے۔ کلو کے فٹس آرہے ہوں۔

ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں پیام تعلیم اور غنچہ کے رسالے دیکھ کر میری توجہ ان کی
خصیت سے ہٹ کر انہی شخصیت میں مرکوز ہو گئی کہ ابھی ابھی دیکھتے کے دیکھتے آبا کے
کے میری ادبی حیثیت مسلم ہو جائے گی۔

ماسٹر صاحب آبا کے قریب آئے تو انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور میری کامیابی
زنجیں مبارک باد دی۔ میں نے اس درجہ خود اعتمادی اپنے ماسٹر میں کبھی نہیں دیکھی
فی۔ مجھے آبا سے ان کا اس طرح ملنا ایک عجوبہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی کی موت پر
بے غایت درجہ خوشی ہونی چاہیے تھی جو ماسٹر صاحب کو بے طرح اپنے شکبے میں بکڑے رہتا
نا اور جس کے ہاتھوں ماسٹر صاحب کی زندگی ہی میں کئی بار موت واقع ہو چکی تھی لیکن
برا ذہن یہ ساری باتیں سوچنے کے لیے اس وقت تیار نہ تھا۔ میری ایون خواہش تو
نشر یہ تھی کہ ماسٹر صاحب کی بغل میں دبے ہوئے سارے رسالے پکب جھکے تک آبا
سے ملنے کھل جائیں اور ان کے صفحات پر میرا نام چمکتا، دکھتا ہوا انھیں نظر آئے۔

ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے میری تعریفیں کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے ہمارے کمرے میں بیٹھے ہم سے باتیں کر رہے ہوں۔ کئی بار تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب موجود نہیں ہیں ورنہ آبا کی موجودگی میں ماسٹر صاحب کا اس آدمی میں پناہ لینا بالکل یقینی تھا جو اپنے اندر ماسٹر صاحب کے سارے وجود کو چھپا لیتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں آج وہ ذلیل اور بزدل آدمی کہاں فرار ہو چکا تھا۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ میکے پر تو زین پر نہ تھے۔ جیسے اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہوں۔

جب ماسٹر صاحب نے آبا سے کہا کہ آپ بابا کو رسالے اور دوسری کتابیں بھی پڑھنے کی اجازت دے دیجیے۔ وہ جو بھی پڑھتے ہیں اس میں میری مرضی کو دخل رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے کورس کی کتابوں کے سوا کچھ اور پڑھنے سے انہیں منع کیا ہے۔ تو آبا نے دینی زبان میں صفا اتنا کہا کہ ”میں نے بالکل منع تو نہیں کیا تھا۔“ ماسٹر صاحب نے رسالے ان کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”دیکھیے ان کی کہانیاں اور مضامین ان رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اسکول بچوں کوئی لڑکا اول تو آجھی سکتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتیں۔“

آبا مسکراتے رہے، اور رسالوں کے ورق الٹ الٹ کر میرا نام دیکھتے رہے مجھے اتنی خوشی زندگی میں کبھی حاصل نہ ہوئی تھی جو ماسٹر صاحب کی زبانی اپنی تعریف سن کر اس وقت حاصل ہوئی تھی۔ آبا نے رسالے انہی کو بتانے کے لیے رکھ لیے۔

اس کے بعد ماسٹر صاحب برابر آتے رہے۔ تعطیلات ہی میں نئی جماعت کی نئی کتابیں شروع کر دی گئیں اور پڑھنے لکھنے میں مجھے بڑی لذت سی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کورس کی کتابیں، کبھی رسالے یا دوسری کتابیں پڑھتا رہتا۔ رسالے

بلی پر چھائیاں
 رہتے وقت بھی کبھی امی آجائیں تو مجھے ان کی آمد کی پرواہ نہ ہوتی۔ بعضے تو ایسا بھی
 رتا کہ امی میری ہانہ پکڑ کر مجھے ٹیبل سے اٹھا دیتیں کہ بھری شام کو پڑھتے رہنے
 سے آنکھیں اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کھیل کود کے وقت کھیلنا بھی تو چاہیے
 نہ۔ اس طرح اٹھاتے وقت انہوں نے نصاب یا غیر نصاب کی کتاب کی کبھی بھی
 زیق نہ کی اور یہی بات مجھے بڑھاوا دینے کے لیے بہت کافی تھی۔

مشومیاں کہنے لگے کہ امی اب ماٹ صاحب بالکل اچھے ہو گئے ہیں۔ انہیں
 پاس بھی نہیں آتے، اور منی ان کی بہت دوست ہو گئی ہے۔ — مجھے
 شومیاں کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں نے انہیں دس ڈانٹا۔ فٹس کب آتے تھے جلا
 سٹر صاحب کو۔ وہ تو منی ایسی اوٹا ٹانگ باتیں کرتی کرتی تھی، لیکن تم تو سیدھے
 نا، تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ”مشومیاں تو خیر چپ ہو گئے، لیکن امی نے مجھے
 ی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے ہمیشہ۔

آہستہ آہستہ ہم اس شخص کو بھول گئے جو ہار ھ کے پاس سے ماسٹر صاحب کو
 چھ دھکیل کر آبا کے آگے سے گذرنا ہوا ہمارے کمرے کی سیڑھیوں تک پہنچ کر گریں
 سب ہو جاتا تھا۔

میں تو اپنے کمرے میں ہمیشہ ماسٹر صاحب ہی ملتے۔ سبھی گھبی وہ دبے پاؤں ہمارے کمرے
 داخل ہونے کی کوشش کرتا بھی تو جیسے ماسٹر صاحب سے خائف ہو کر فرار ہو جاتا۔ لیکن
 کے آگے تو وہ ماسٹر صاحب کو اس طرح دروچ لیتا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن
 یہ باتیں قریب قریب سب کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں یہاں تک کہ غدیرے اپنے ذہن سے بھی۔
 ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے کتابیں بغل میں دبائے چلے آتے۔ آبا ہونے
 تا تو ہنایت بردباری سے گردن ذرا سا خم کر کے ان کو سلام کرتے وہ بھی

اپنی کرسی سے نیم استادہ ہو کر جواب دیتے۔

ہم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں اپنے پرچے، اپنے رسالے بغیر کسی پس و پیش کے جب چلے پڑھتا، اور اب کبھی بھی آبا اور امی کو دیکھ کر نصاب اور غیر نصاب کی تفریق کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اپنی ہر حرکت اور ہر عمل پر ایک بھرپور اعتماد کا عالم زندگی کو کس قدر موقع بنادیتا ہے۔ بغیر شعوری طور پر میں کچھ اسی عالم سے گذر رہا تھا۔

امی اب ماسٹر صاحب کا نام لیتی تو اس میں عزت و توقیر شامل رہتی۔ وہ اگلا سا انداز نہ ہوتا جس سے کبھی کبھی مجھے دکھ ہوتا تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب تین دن تک نہیں آئے معلوم ہوا کہ ان کی ترقی کا مسئلہ پیش ہے اور وہ اسی لیے کوشاں ہیں مجھے معلوم تھا کہ ماسٹر صاحب کو ان کے اسکول میں ترقی دے دی گئی ہے لیکن کچھ روز سے یہ افواہیں بھی تھیں کہ ان کے کسی ساتھی نے اس ترقی کے خلاف اپیل کی ہے۔ اسکول میں جب وہ مجھ سے ملے تو انہوں نے صفا اتنا کہا کہ ”بابا، اپیل آبا کے پاس ہی کی گئی ہے اور ان کا فیصلہ قطعی اور آخری ہو گا۔ اس لیے کہ اور آگے جانے کی ہمت میسر مخالف میں نہیں ہے۔“

میں نے اتنے دن سے نہ آنے کا سبب پوچھا تو جواباً انہوں نے شب کو آنے کا وعدہ کیا اور کچھ کہے سے بغیر چلے گئے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بھی بہت متاثر ہوا۔ پتہ نہیں میسر ذہن نے کیوں اس طرح سوچا کہ وہ ان دنوں دانستہ ہمارے گھر آنے سے گریز کر رہے ہیں۔ تاکہ آبا بغیر کسی جانبداری کے اپیل کا فیصلہ کر سکیں۔ چاہے وہ ماسٹر صاحب کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ شام کو ماسٹر صاحب آئے تو آبا لان پر پڑی ہوئی ٹاک چیر نیم دراز حالت میں سگاری پی رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں نیا رسالہ دیکھ کر میں چھٹا تو ترشی ہوئی شاداب باڑھ

اُجلی پر چھائیاں

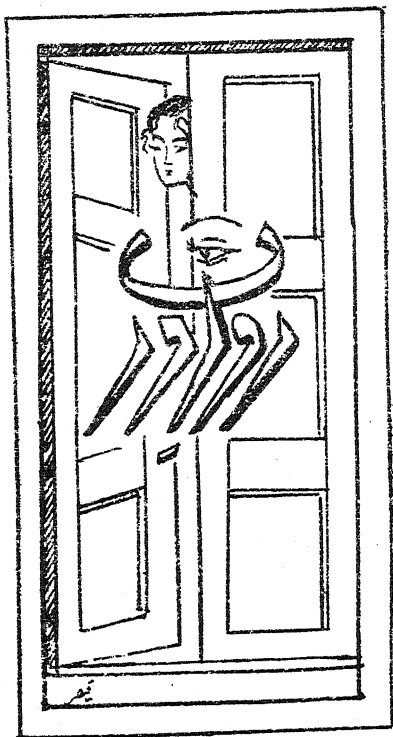
اجنبی

سے آگے بڑھتے ہی ان کی آنکھیں آبا سے چار ہوئیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔
ماسٹر صاحب جیسے کہیں غائب تھے۔

اسی بزدل آدمی نے بڑھ کر ان کو آج پھر دبوچ لیا تھا اور وہ آبا کے آگے اس طرح
مضمحل اور نڈھال قدم اٹھا رہے تھے جیسے اب دم توڑ دیں گے اب دم توڑ دیں گے۔
سہمے سہمے سے آبا کی طرف کن آنکھوں دیکھتے ہوئے ٹوپی کو درست کرتے ہوئے
شیروائی کے دامن کو چمکی میں لے کر اپنی رانوں میں اڑتے ہوئے۔ ٹرٹڑ کر کون کھائے ہوئے
پتنگ کی طرح۔ افسیر اللہ۔

ایانے مجھے پکارا تو جیسے میں سہم گیا۔

ان کے قریب پہنچتے پہنچتے جانے کیوں ہاتھ پیچھے کر کے میں نے اپنا
رسالہ چھپانے کی کوشش کی، پھر گھبرا کر باڑھ میں پھینک دیا۔ جس میں میری کہانی
تھی۔ جس میں میرا نام روشنائی سے نہیں روشنی سے لکھا ہوا ہوگا۔



ذکیہ آج پھر تمھاری گھنی پلکوں پر موقی چمک رہے ہیں۔ میں نے ان موتیوں کو کبھی بٹورنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس لیے کہ میں ان کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موقی انمول ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان موتیوں کی اب نے کسی کے دامن دل کو جھلس دیا ہو لیکن تم برا نہ مانو تو تم سے ایک بات کہوں میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ تم جب کبھی روٹی ہو اس وقت روٹی ہو جب کہ تمھیں ہنسنا چاہیے تھا، کم از کم مسکرا نا تو ضرور چاہیے تھا تمھیں۔ نرم مسکراہٹ، شیریں مسکراہٹ، مسکراہٹ جو ستارہ صبح کا ہی کی کوئل کرن کی طرح گداز ہو۔ مسکراہٹ جس کی سرخی گھلتی ہوئی نکلا لی کلی کے سینے میں تمھارے روئے ہوئے خون کے آنسوؤں سے دھل کر منجمد ہو گئی ہو۔ اور مجھے تمھاری یہ مسکراہٹ بہت پسند ہے ذکیہ۔ میں اس مسکراہٹ کا احترام کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مسکراتی رہو۔ کرنیں ہی کرنیں بکھرتی رہو۔ کلیاں ہی کلیاں چمکاتی رہو۔ لیکن نہیں مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم سے کوئی ایسی بات ضرور بچائی ہے جس کا میں تم سے اظہار کرتا تو شاید تم رو پڑتیں۔ درآسا لیکر اس باسکے

اُجلی پر چھائیاں

روزانہ

اظہار کے باوجود مجھی تم مسکرا سکتی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے اور مجھے تمہاری پلکوں پر جھلکتے ہوئے ستاروں سے وحشت ہوتی ہے لیکن ٹیپٹر انجام سے بے خبر ہو کر میں تمہیں صفا اتنا بتا دوں کہ میں نے ایک بات تم سے غلط کہی میں نے کبھی تمہاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کیا۔ کوئی مرد کسی عورت کی مسکراہٹ کا احترام نہیں کر سکتا۔ یا پھر کر سکتا ہو گا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ میں اپنی بات کہے جاؤں تو ٹھیک ہے۔ باوجودیکہ تم سب سے بہت عزیز ترین دوست کی بیوی ہو لیکن میں اس کو کیا کروں ذکیہ کہ زندگی کی ساری رعنائی، زندگی کی ساری شادابی صفا تمہارے ہونٹوں کے مقدس میں آگئی ہے۔

دنیا کے سارے اجالوں کو تم نے اپنے ہونٹوں کے مخراب میں محصور کر رکھا ہے اور جب تم مسکراتی ہو تو میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ تمہارے ہونٹوں سے پھوٹی ہوئی اُجلی کرنوں کے تانے بانے میں بے طرح بکرا جا رہا ہوں۔ لیکن اسی لمحہ مجھے اپنی دیانت داری خود کو فریب دینا سکھالیتی ہے اور میں احترام کا لفظ استعمال کر کے خود کو فریب دیتا ہوں۔ تم کو فریب دیتا ہوں اور اپنے عزیز ترین دوست کو فریب دیتا ہوں جس کی تم بیوی ہو۔ اس لیے کہ میں تمہاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کرتا بلکہ تمہاری مسکراہٹ مجھے پسند ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجھے کسی کی گوری یا پس پسند ہیں۔ کسی کی خروچی انگلیاں پسند ہیں کسی کی ناک کا تل پسند ہے۔ یہاں تک کہ کسی کا طرز گفتگو پسند ہے۔ کسی کا انداز سپردگی پسند ہے۔ اسی طرح ذکیہ مجھے تمہاری مسکراہٹ پسند ہے۔ میں نے گوری یا ہوں سے لے کر عالم سپردگی تک کسی کا احترام نہیں کیا ہے تو میں تمہاری مسکراہٹ کا کیسے احترام کر سکتا ہوں — لیکن یہ سب باتیں میں تم

جلی پر چھائیاں
 سے کہ نہیں سکتا کیوں کہ تم میرے بہت عزیز دوست کی بیوی ہو، اور میرا دوست
 مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ اتنا اعتماد کہ تمہیں خود پر اتنا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اور نہ
 خود مجھے اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہے۔ میرا دوست غالباً تمہیں بے اندازہ چاہتا
 ہے لیکن اس کے باوجود تم نہیں مسکراتیں۔ تم نہیں مسکوا سکتیں اور نہ میں تم سے مسکرانے
 کا خواہش کر سکتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کا
 تمہیں بھی علم ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر تم اس بات کو سمجھ چکی ہو کہ تمہارے
 زانیوں میں گھٹ کر جس اُجالے نے دم توڑ دیا ہے، جس اندھیرے نے جنم لیا ہے
 اس اندھیرے پر تم فستح نہیں پاسکو گی۔ لیکن اس میں میرے دوست کا کوئی تصور
 میں ہے۔ تمہارے دونوں بچوں کا کوئی تصور نہیں ہے، اور نہ خود میرا اپنا اس میں کوئی
 شے ہے کہ میں ایک عزیز دوست کی بیوی کی مسکراہٹ کے لیے تڑپ رہا ہوں لیکن میرے
 بچے کا انداز بالکل وہی ہے جو گوری باہوں کے میری گردن میں حائل نہ ہونے تک تھا
 رٹی انگلیوں کے میسرے لے بالوں سے نہ کیلئے تک تھا۔ ادا اس آنکھوں کے میری اپنی
 نبیوں میں نہ جھانکے تک تھا، اور ناک کے تل تک میرے ہونٹوں کے نہ پہنچنے تک تھا۔
 سب بے گناہ ہیں ذکیہ۔ یہاں تک کہ تم بھی بے گناہ ہو۔ تم جو میری موجودگی میں اپنی
 ٹی ہوئی مسکراہٹ کو ڈھونڈ کر لے آتی ہو۔ تم جو میری قربت پر اپنے ہونٹوں سے
 جی ہوئی جلیوں کو اپنے معاشرے کے ظالم ہاتھوں سے چھٹ کر اپنے ہونٹوں پر
 سے لہرا نا چاہتی ہو، لیکن جلیوں کے بجائے صفحہ جگنو چمک کر رہ جاتے ہیں۔ اور
 جگنوؤں کی روشنی سے بھی میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس خیرگی کو میں تم پر
 نہیں کر سکتا، اور پوری قوت سے اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ انہیں جھپکے تک

اُعلیٰ پر چھائیاں
 نہیں دیتا، صرف اس لیے کہ تم میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہو، اور صرف اس لیے
 کہ اگر میری آنکھیں جھپکتی ہیں تو تمہارے ہونٹوں کے محراب میں یہ جھللاتے جگنو ایک دم سے
 گہرے اندھیرے میں بھٹک جاتے ہیں۔ ایسے اندھیرے میں جہاں وہ روشنی نہیں اگل سکتے
 بلکہ تاریکیاں ان کی روشنی کو نگل لیتی ہیں اور تمہاری گھنی پلکوں پر موتی چمک اٹھتے ہیں،
 صبر اس لیے کہ میں تمہارے شوہر کا عزیز ترین دوست ہوں اور وہ تم پر اور مجھ پر
 دونوں پر اعتماد کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے تمہاری پلکوں پر چمکتے ہوئے
 ان موتیوں سے کیا لینا ہے جن کی قدر و قیمت سے میں واقف نہیں ہوں اور جو
 میرے عزیز دوست کی زندگی کی پونجی ہیں۔

ہاں اور سونو ذکیہ — کیا میں آج تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے تمہارے ہنسنے
 اور رونے کے سوا تمہاری خاموشی سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ جب تم روتی ہو تو مجھے
 ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہو، اور ہنستی ہو تو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کی بجائے آنکھوں
 میں آنسو دکھائی دیتے ہیں، اور جب تم خاموش ہوتی ہو تو میں محسوس کرتا ہوں جیسے
 تم کچھ بول رہی ہو، اور جب تم بولتی ہو تو محسوس ہوتا ہے جیسے بالکل خاموش ہو،
 اتنی خاموش کہ تمہاری اپنی آواز بھی تمہارے اطراف پھیلے ہوئے بیکر اا سناٹے
 سے بچ کر خود تمہارے اپنے کانوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی ہے — تمہیں بتاؤ
 ذکیہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے، کیا ہے، کیا تم وہی ہو جو تم نظر آتی ہو یا وہ
 ہو جو نظر نہیں آتی۔

تم اس دن کرید کرید کر سر ٹیڈا نا سے متعلق پوچھ رہی تھیں — میں دانستہ
 اس موضوع سے گریز کر رہا تھا۔ تم چاہتی تھیں کہ میں کسی بات کا اعتراف کر لوں کسی

جلی پر چھائیاں

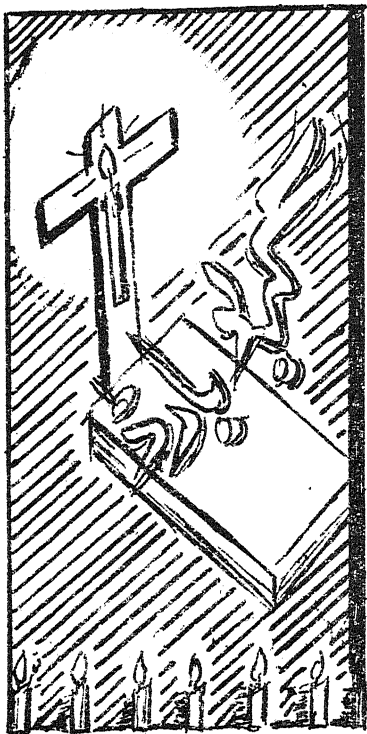
روزانہ در

یسی بات کا جس کے غلط ہونے سے شاید تمہیں تکین ہوتی — دیکھو ذکر سرٹانا
 ناشوہر اس کو بے پناہ چاہتا ہو گا۔ اس کی محبت کی تاریخ اور جزافیہ سے میں قطعی
 واقف نہیں ہوں، اور نہ میں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں
 کہ سرٹانا ایک خوبصورت عورت ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے اور اس ایک بچے کے
 مدد و محسوس کرنے لگی ہے کہ اس کو ایسے محرم استعمال کرنا چاہیے جس میں سینے کو
 بڑک عورت دو شیرنگی کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس کرتی ہے، اور وہ سہول
 تی ہے کہ یہ اسبھا کرکڑے کے کلف کارمین منت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ پالنے والی
 کا بچہ ہو۔ مجھے شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ زال کو پورا یقین
 ہے اور سرٹانا سبھی کچھ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ لیکن مجھے تو مفروضات معلوم ہے کہ زال
 رٹانا کو زمین سے بہت بلند یوں پر ہواؤں میں اڑانا چاہتا ہے۔ اڑتے ہوئے
 ہلکے بادلوں کی نمی سے اس کی ملائم ریشمی زلفوں کو جھگو کر اپنی انگلیوں سے اس کی
 زل میں کنگھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سرٹانا اس کے ساتھ زمین سے
 تہ اوپر اٹھ کر زمین کی پستیوں پر مسکرائے، اور وہ اُبھرتے ہوئے چاند کی کرنوں
 زکر سرٹانا کے ہونٹوں پر قرض کرنے کے لیے چھوڑ دے اور اس کو بتائے کہ
 اگے ہونٹوں پر لب اسٹیک نہیں بلکہ شفق کی سرخیاں مل دی گئی ہیں، اور
 برانا ان باتوں پر ایمان لے آئے۔ لیکن سرٹانا کو زمین سے بے حد انس ہے
 باہتی ہے کہ اس کے پاؤں بالکل زمین پر رکے رہیں، اور اس سے کوئی چپکے
 کہہ کہ تمہارا حسن خود زمین و آسمان کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ شفق کی
 یاں تمہارے گلنار عارض پر نشان رہیں، اور تمہاری ریشمی زلفوں کے آگے

نرم اور ملائم ابر کے ٹکڑے بیچ ہیں۔ تمھارے کانوں میں سجے ہوئے ٹاپس پر سو بار ستارے نقد کیے جاسکتے ہیں۔ تم مسکراتی ہو تو سویرا مہونے لگتا ہے اور تم خاموش ہو جاتی ہو تو آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ اور میں نے اپنی مضبوط باہوں میں سر ڈالنا کو جو کدھر اس سے کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔ ایسی باتیں جس سے اس کا وقار اس کی اپنی نظروں میں اور بڑھ گیا۔ ایسی باتیں جس سے وہ خود کو زیادہ حسین محسوس کرنے لگی۔ ایسی باتیں جن سے اس نے خود نمائی سیکھی اور اس کے غرور نے پاٹل زال کو آسمان کی وسعت میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا اور سر ڈالنا مجھ سے قریب تر ہوتی گئی لیکن بہت جلد پاٹل زال کے مجھ سے ہوئے پٹل نے سر ڈالنا میں جاگی ہوئی خود نمائی کے پرچے اڑائیے اور میرے سارے انقلابی نظریوں کو اپنی گولیوں سے سسما کر دیا، اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ لیکن سر ڈالنا کی آنکھیں آج بھی میرے لیے بے خواب ہیں، وہ آج بھی زال کے پہلو میں بیٹھ کر میرے متعلق سوچتی ہے۔ اس کا دل کمزور ہو گیا ہے۔ پاٹل زال اب اس کو آسمانوں کی وسعتوں کی سیر نہیں کرا سکتا۔ یہ زندگی کی کوئی بہت بڑی ٹریجڈی نہیں ہے ذکیہ۔ ہمارے سماج کا حسن ان ہی سانچوں سے نکھرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی خوبصورتی انہیں حسرتوں سے قائم ہے۔ ہمارے شب و روز انہیں ناکامیوں سے تابناک ہیں۔ ہم زندگی میں کسی چوٹ کے، کسی کسک کے، کسی ہلکے سے درد کے قائل ہیں۔ کسی ایسے درد کے، کسی ایسی کسک کے جس کے بغیر ہماری تخلیقی صلاحیتیں ختم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ درد زندگی میں صرف تمہیں اور مجھے ہی حاصل نہیں۔ پاٹل زال کو بھی حاصل ہے۔ سر ڈالنا کو بھی حاصل ہے۔ قریب قریب اپنے وطن کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہے جو زندگی کے ناخدا ہیں تخلیقات کے خدا ہیں۔

اچھا اب تم سجاگ جاؤ ذکیہ۔ میری بیوی آرہی ہے اور اپنے پانچوں بچوں کو ساتھ لیے ہوئے آرہی ہے اور اب میں تمہیں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا، ورنہ وہ سمجھے گی کہ میں ہمیشہ افسانہ ہی لکھتا رہتا ہوں اور کھڑی کھڑی دور دور تک خلاؤں میں گھورے گی لمحہ محو کے لیے مجھ سے اور اپنے پانچوں بچوں سے بے نیاز ہو جائے گی۔ ہاں ذکیہ سوچ رہا ہوں کہ جب تم خود اپنے بچوں میں گھری ہوئی میرا یہ اوٹ پٹانگ خط پڑھتی رہو گی تو تمہاری نظریں کبھی میری تحریر پر ہوں گی، کبھی اپنے دروازے پر کہ کہیں تمہارا شوہر نہ آجائے۔ میرا دوست نہ آجائے لیکن کبھی جب میں تم سے ملوں گا تو تم اپنی اس کیفیت کا اظہار تک مجھ سے نہ کرو گی جو تم پر میرا خط پڑھتے وقت طاری ہوگی۔ یہ سارے جذبے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور اپنی موت مر جاتے ہیں۔

ذکیہ چپکے سے مجھے بتا دو تم نے اپنے سینے میں کس کس طرح مجھے چھپا رکھا ہے۔ بھری برساتوں کے روپ میں یا دینی دینی چنگاریوں کے روپ میں۔



اس کی ممی نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا اور فوراً کہہ اٹھی کہ ”وہ گھر پر نہیں ہے۔“
میں جانتا تھا کہ اس کی ممی ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں ہماری دوستی ناپسند ہو۔

پھر وہ مسکراتی کیوں نہیں؟
”تم سے کہیں اپائنٹ منٹ (APPOINTMENT) تھا کیا۔؟“
”ہاں“ میں نے کہا۔ ”میں کوئی نصف گھنٹہ انتظار کر کے آ رہا ہوں۔“
”وہ گریویارڈ گیا ہو گا۔“
”گریویارڈ!! — مجھے بہت تعجب ہوا — ہارڈنگ تو ان لوگوں میں سے ہے جو مگر سبھی گریویارڈ نہیں جاتے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیوں خیریت تو ہے۔؟“
کہنے لگی۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ تم بھی چلے جاؤ تو خود سمجھ لو گے۔“

مئی تو پہیلیاں بھجوا رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

”دو اکیلا گیا ہے یا اپنی بھی آئی تھی؟“

”دو اپنی کوئی پسینے جھکے اور نہ نہیں آئی۔“

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے جی چاہتا تھا کہ اپنی کے پسینے بھر کے طویل غیاب کے بارے میں مئی سے تاثر توڑ بیسوں سوالات کر دوں لیکن یہ سوچ کر کہ میرے استفسارات کو وہ جذبہ رقابت پر محمول نہ کرے میں نے کوئی بات ہی نہ پوچھی۔
حالانکہ مئی کو بہ وجہ غلط فہمی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔

میں نے اس سے وداع ہوتے ہوئے سوچا کہ ہارڈنگ نے بھی مجھ سے کچھ نہ کہا۔ اور اپنی کے ساتھ تو گئے اتوار ہی کو میں نے پی تھی اور وہ معمول سے زیادہ ہی خوش تھی۔ کوئی ایسی بات اس نے بھی نہیں کی۔

گریویارڈ کوئی دور نہ تھا۔ ام۔ ال۔ ایز کوارٹرس کے بالکل سامنے۔

میں نے اپنی اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا اور ہارڈنگ کی مئی نے مسکرا کر دروازہ بند کر لیا۔

میری نظروں میں ہارڈنگ کا ہنسی مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مئی کی مسکراہٹ سے کس قدر مشابہ تھی۔ پخلا ہونٹ دیا کر باجھوں کو خفیف سی جنبش دے کر کچھ اس طرح مسکراتا جیسے ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ سکر رہی ہوں۔
گریویارڈ دینچا تو وہ ساری اداسیاں جو راستے میں ذہن نے پیدا کی تھیں اور جسے دل نے چپکے سے اپنے پر مسلط کر لیا تھا پتہ نہیں کہاں کھسک گئیں۔

اُجلی پرچائیاں گریویارڈ
 زندگی کی ہل چل، اس کی حرارت، اس کی چہل پہل، اس کی چلت پھرت —
 زندگی کا سب سے برا حصہ یہی تو ہے۔ گریویارڈ کے تصور نے یہ سارا حسن مجھ
 سے چھین لیا تھا۔ اور پھر ہارڈنگ کبھی بھی کسی قبرستان کو نہیں جاسکتا۔
 اس کی فطرت، اس کا کھلنڈراپن، اس کی شرارتیں ان کے لیے ایسے مقامات پر ہیں
 جگہ ہی نہیں ہے۔

اب جب کہ گریویارڈ کے قریب پہنچا ہوں تو سمجھ میں آیا کہ ہارڈنگ اپنی ساری
 شخصیت کے ساتھ جوں کا توں یہاں تک آسکتا ہے۔
 گریویارڈ پر اپنی لمبی لمبی گھنی شاخیں پھیلا کر رات کی تاریکیوں میں جھومنے والے
 دیونا درخت بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقموں اور قبروں پر سبھی ہوئی موم بتیوں کی روشنی کے
 آگے جیسے اپنی ساری رعوت اور طنطنہ کھو چکے تھے۔ ان میں بڑی مڑی آگئی تھی بڑا
 گدازا گیا تھا، مختصر یہ کہ بڑی زندگی آگئی تھی۔

گیٹ پر پہنچنے تک کتنے شانوں سے شانے ہلکے لکڑے لکڑے ٹبر ہٹا رہا ہے۔ کچھ نوجوان
 تو آئے ہی گویا اس سحر کی کے لیے تھے۔

بوٹدری کے باہر پھولوں، مٹھائیوں، کھلونوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔
 ٹھیلوں پر کھاری چیزوں سے پتیلی ستالیاں سجائے ٹھیلے والے گھنٹیاں بجا رہے تھے
 احاطے کے اندر کا سماں اور سبھی دیدنی تھا۔ ساری فضا جگمگاتی تھی۔ سارا
 ماحول سلگ اٹھا تھا۔ ہر قبر پر سر ہانے سے پانسی تک تین تین چار چار پتوں کے
 فاصلے پر موم بتیاں جما کر جلائی گئی تھیں۔ موم بتیوں سے جو جگہ بچ رہی
 تھی اس کو سرخ اور پیلے پھولوں سے ڈھنک دیا گیا تھا۔ اس طرح ساری کی

اُجلی پر چھائیاں گریویارڈ
ساری قبریں پھولوں اور ننھے ننھے شعلوں سے ڈھنکی چھپی دہنیں بن گئی تھیں جیسے
سرخ اور زرد زرین ڈوپٹوں پر سونے کی چمکیاں ٹانگ دی گئی ہوں۔

موم بتیاں آہستہ آہستہ پگھل رہی تھیں، ان کی ٹانگ آنکھوں سے دھلکتے ہوئے
آنسو ان کے قدموں میں پڑے ہوئے پھولوں کے کھلے ہوئے سینوں میں حدت اور
حرارت پیدا کر رہے تھے۔ پھر یہ آنسو خود سرد ہو کر منجمد ہو جاتے۔ جیسے
سرخ اور زرد سیپوں کے کھلے ہوئے سینوں میں موتی دمک رہے ہوں۔

زندگی میں موم کی طرح جلنے کا انداز۔ پتہ نہیں ان قبروں میں ابدی نیند
سونے والوں میں کن کن کے حصے میں آیا تھا۔

گریویارڈ کے احاطے میں داخل ہو کر قبروں کے قریب پہنچنے پہنچنے تک میسر
ذہن اور دل میں پھر اداسیاں اور محرومیاں اپنے لیے جگہ بنا رہی تھیں۔ دل کا
کچھ عجیب سا عالم تھا جیسے موم تہی ہی کے مانند بغیر کسی شعلے ہی کے پگھل رہا ہو۔
قبروں کے درمیان چھٹے ہوئے گز گز سب کے فاصلے جیسے پھولوں اور شعلوں
کی اس کھیتی میں پگھلنے والوں کا کام دے رہے تھے۔

زندگی جیسے ان پگھلنے والوں پر اس قدر نرمی سے پاؤں دھر رہی تھی کہ مبادہ
سوئی ہوئی موت بیدار نہ ہو جائے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جاگنے والے
سونے والوں کی نیند کی حفاظت کر رہے ہیں۔ کچی نیند کی جوا بھی ابھی لگی ہے
جوا بھی ابھی ٹوٹ جائے گی۔

اداس چہرے بھیگی ہوئی آنکھیں غمزدہ دل۔ موم بتیاں قبروں پر چل رہی تھیں۔
موم بتیاں قبروں کے اطراف انسانی صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔

کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبا دیا۔

وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔

”میں نے آدھ گھنٹے تک تمہارا انتظار کیا۔“

”مجھے تمہاری آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔“

دور پر زور دیتے ہوئے ہارڈنگ نے بات ہی بدل دی۔

میں سپر بھی مسکرا نہ سکا۔

ادھر ادھر نظر میں اٹھا کروہ اطمینان سے ”بل گم“ چبانے لگا۔

”کہاں رہے تم“ میں نے پوچھا۔

”بروج کے گھر گیا تھا۔ وہ نہیں ملا۔ پھر اپنی کے گھر گیا۔ وہ بھی

نہیں ملی۔ پھر ویکا چیز مینیا۔ تم بھی نہیں ملے۔“

”پورے بتیس منٹ ”ویکا چیز“ میں انتظار کر کے میں تمہارے گھر گیا تھا

— تم نہیں ملے۔“

”کوئی کسی کو نہیں ملا۔“ وہ سپر مسکرانے لگا۔

”کچھ پی بھی؟ بہت سوبر معلوم ہوتے ہو؟“

”ہاں صفر دو پک“ میں نے جواب دیا۔

”چلو کچھ گھومیں پھریں۔“

”نہیں یارب چلیں یہاں سے۔“

”کیوں؟“ اس نے میرے شانے پر ایک ہلکی سی چپت لگا دی۔

”تم بھاگ جانا چاہتے ہو اس ماحول سے۔ کیوں ہے ناپسی بات؟“

اُجلی پرچھائیاں گریو یارڈ
 میں جلتی ہوئی موم بتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جواب نہ پا کر اس نے میری ہانہ
 پکڑ لی اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ دبے پاؤں آہستہ آہستہ، قبروں کے
 درمیان۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔

”وہ دیکھو“۔ دائیں جانب انگلی اٹھا کر اس نے بتایا۔

اپنی اور بروج ایک قبر کے پائنتی سر جھکائے کھڑے تھے۔

”یہ بروج بھی عجب نان سنس ہے یار“

”کس کی قبر ہے وہ۔“ میں نے ہارڈنگ کی بات کو سُنی ان سنی کرتے

ہوئے پوچھا۔

”اپنی کے بڑے بھائی کی۔ میرا بہت پیارا دوست تھا۔ دوست

بھی اور دشمن بھی۔ بات بات پر چمٹ جاتا۔ اسی طرح بات بات پر جھگڑ بھی پڑتا۔

شدید محبت کرتا تھا۔ پگلا کہیں کا۔ میں نے کتنی بار سمجھایا۔ یار عورت سے خود

عشق نہ کرو۔ دھیمی سی آہ اس کے دل میں لگا کر بس ہوا دیتے رہو۔ یہاں تک کہ

وہ دیوانگی کی حد تک تمہیں چاہنے لگے۔ جب قدموں میں آگرے تو اٹھا کر سینے سے

لگا لو۔ تم خود اپنی آنکھیں اس کے تلوں پر ملتے رہو گے تو وہ تمہاری ہنستی اور

جاگتی ہوئی آنکھوں کو پاؤں تلے روند کر گزر جائے گی۔“

”کیا زیادہ پی لی ہے۔“ میں نے ٹوکا۔

”کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ لیکن تم سے زیادہ۔“ وہ پھر کہنے لگا۔

”لیکن اس نے میری بات کا ہمیشہ مذاق اڑایا۔ اس نے محبت میں بڑے

کڑے امتحان دیئے یار۔ لیکن اس کی محبوبہ اسے نہ سمجھ سکی۔ اور جب وہ سمجھ

علی پر چھائیاں
تھی — وہ انتظار نہ کر سکا۔ اس نے بغیر کسی سے کچھ کہے سنے، دنیا ہی چھوڑ دی —
اس قدر اسٹارٹ متواہ — بالکل اپنی کی طرح — میں اگر اس کی طرح حسین ہوتا اور
بیرادینا میں سب کچھ لٹ جاتا تو بھی صاف اپنے ہی حسن کی خاطر میں کسی قیمت پر سبھی زندگی
و نہ چھوڑتا — لیکن اس ظالم نے کھو و فام اپنی رگ میں انجکٹ کر لیا —
پکلا کہیں کا —

اس نے بات ختم کر دی اور کہیں دور دور دیکھنے لگا۔
موم بتیاں جل رہی تھیں — گچھل رہی تھیں — میں چاہتا تھا کچھ اور پی سکوں۔
”وتم اپنی کو یہاں چھوڑ کر چل دینا تو پسند نہیں کرو گے — وہ تمہاری بھی
انہی ہی دوست ہے جتنی میری۔“

مجھے محسوس ہوا جیسے ہارڈنگ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ لیکن میں نے صرف
ہوں کہنے پر اکتفا کیا۔

دوریوں سے اس نے نظریں ہٹالیں — مجھ سے آنکھیں چاکیں۔ لبوں پر
وہی نرم نرم سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن آنکھیں جیسے اس مسکراہٹ کو جھٹلا رہی تھیں۔
اس نے کہا چلو وہیں چلیں — اور ہم دونوں بڑھ گئے۔

ایک بڑھیا ایک قبکے سر ہانے سنگ مرمر کی صلیب سے چٹی ہوئی سسک رہی
تھی۔ جبکہ سفید بال تھے جو کالی ربن سے کس لیے گئے تھے۔ آسنوؤں کو چہرے
کی ٹھریوں سے گذر کر قبر کے پھولوں پر گرنے میں شاید دشواری ہو رہی تھی — مجھ
یسا معلوم ہوا جیسے یہ ایک ایسی موم بتی ہے جس کا گھٹلا ہوا موم شعلے سے کچھ ہی نیچے
ہم جا کر سرد اور منجمد ہو جاتا ہے — گھٹلے ہوئے موم کی تہہ پر تہہ چڑھنے لگتی ہے

گریو یارڈ

اُجلی پر چھائیاں

اور موم تہی کو زیادہ دیر تک جلنے میں مدد دیتی ہے۔

پتہ نہیں یہ سرتا پاسفید بڑھیا کب تک جلتی اور گھلتی رہے گی۔ ویسے
قبر کے سرہانے جاگتی ہوئی اس زندگی میں اور قبر کے اندر سوئی ہوئی موت میں
قدم دو قدم ہی کا تو فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ صلیب کے نیچے لگے ہوئے کتبے نے میرا داس بکڑ لیا۔

IN LOVING MEMORY

MY DARLING OF DAUGHTER

AGE 18 YEARS

I MISS YOU IN THE MORNING .

I MISS YOU IN THE DAY .

I MISS YOU DAUGHTER DARLING .

IN A THOUSAND DIFFERENT WAY .

ALL THE WORLD SEEMS DARK WITHOUT THEE

MEMORY TURNS EACH THOUGHT TO PAIN

LOVE IS VACANT LIFE IS WEARY

TILL IN HEAVEN WE MEET AGAIN.

میراجی چاہا کہ پھونک مار کہ اس قبر کی ساری موم بتیاں بجھا دوں۔

اتنی کے پاس پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں تھک گیا ہوں۔

غم کچھ اس طرح دبے پاؤں دل میں داخل ہو رہا تھا جس طرح جنازہ قبرستان
میں داخل ہو رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر سپر بڑھیا کو دیکھا۔ وہ مجھے نظر نہ آئی۔

کتنے ہی غمزدہ دل، کتنی ہی جھگی ہوئی آنکھیں، کتنے ہی اداس چہرے۔

موم کی طرح قبروں کے اطراف جل رہے تھے۔

بڑھیا کہیں نہیں جاسکتی۔ میں نے سپر پلٹ کر دیکھا۔ وہ قبر پر دوہری

اُجلی پر چھائیاں
گر یو یارڈ
ہو کر قریب قریب لیٹ چکی تھی جیسے اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کو سینے سے لگا رہی ہو۔

لیکن ننھے ننھے آگ کے شعلے جیسے دو دلوں کے بیچ میں حائل تھے — میرا
پھر جی چاہا کہ پھونک مار کر اس قبر کی ساری موم بتیاں بجھا دوں۔

انہی — ہارڈنگ اپنی کو پکار رہا تھا — مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے
ہارڈنگ کی آواز خود اس قبر سے آرہی تھی جس پر انہی جھکی ہوئی تھی اور اس کی بے پناہ
فول صورت آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے — گنگلے ہوئے موم کے قطروں کی طرح۔

انہی — میں نے ہارڈنگ کو اس قدر گر محوشی سے اپنی کا ہاتھ دباتے ہوئے
آج تک نہیں دیکھا — یہاں تک کہ کسی بار میں بھی نہیں — وہ تو انہی کو صرف
دق کرنا جانتا تھا۔ اس کو چیڑتا — اس کو ستاتا — بڑی بدتمیزی سے ہماری موجودگی
میں اسے آنکھ مار دیتا — وہ اس کے رویے کی بروج سے شکایت کرتی —
میرے آگے دگڑا روتی۔

کبھی کبھی تو وہ فٹے لٹا ستا تاکہ انہی کی آنکھیں ٹپل ہی پرچھلک جائیں — اس کے بعد اپنا
جام ہاتھ میں لے کر فوری اٹھ کھڑا ہوتا — ایک ہی سانس میں ساری کی ساری شراب
چڑھالیتا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر ایک ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے بیٹھ جاتا۔
پھر ہم سب کو دُش "کر کے ہمارے روکتے کے روکتے کچھ نہ کچھ بہانا تراش کر نکل جاتا۔
اس طرح ہمارا موڈ اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتا۔

انہی کے ساتھ اس کا برتاؤ مجھے بھی اچھا نہ لگتا — لیکن اس کو کسی کے
احساسات کا جیسے کچھ خیال ہی نہ تھا۔

اس نے ایسے کسی واقعے کو "چونگیم" یا "بل گم" چبانے سے زیادہ اہمیت نہ دی

گریو یارڈ

اصلی پرچھائیاں

اپنی اور بروج نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ اپنی کی آنکھیں سرخ ہو کر اور زیادہ
خوبصورت ہو گئی تھیں۔ بروج گرے رنگ کے قفل سوٹ میں بڑا اسمارٹ
لگ رہا تھا۔

ہارڈنگ نے اپنی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگا چلو اب چلیں یہاں سے
تم اس طرح اور روؤ گی تو میں تمہیں یہاں لگد گدا دل گا۔ تم مجھ پر بگڑو گی تو یہ
تمہارا بھائی جو چپ سادھے قبر میں پڑا ہے نا۔ وہ جھپٹ کر تمہاری حمایت میں میری
ٹائی پکڑ لے گا اور دم میں گتھ گتھا ہو جائیگا۔ اس سے پہلے کہ ہم جھگڑا کریں چلے چلو یہاں سے
مجھے ہارڈنگ کی باتیں کچھ اونٹ پٹانگ سی لگیں۔

لیکن وہ پھر کہیں دور دور دیکھ رہا تھا۔ اپنی بھی کچھ وہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید
دونوں ہی پالم کو یاد کر رہے ہوں۔

بروج بڑے پیار سے اپنی کو تک رہا تھا۔ اپنی کی نظریں دور یوں سے
واپس ہوئیں تو بروج کی نظریں جیسے ان کی منتظر تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے
کو دیکھا اور اپنی نے اپنا ہاتھ بروج کے ہاتھ میں دے دیا۔
ہارڈنگ اب بھی کہیں دور دور دیکھ رہا تھا۔
میری نظریں قبعر کتبے پر جم کر رہ گئیں۔

IN LOVING MEMORY
OF

HEARTY BROTHER
ROBERT PALMER

AGE 21 YEARS
BORN 1935
DIED 1956

ALL THAT YOU HAVE MEANT TO ME
WORDS CAN NEVER TELL
COMRADESHIP AND SYMPATHY
CHEERINESS AS WELL
EVERY DAY SHOWN DOUBLY BRIGHT
JUST BECAUSE YOU SHARED IT
EVERY TROUBLE WAS BORN LIGHT
WITH YOU TO HELP ME BEAR IT
LOVING THOUGHTS SHALL EVER LINGER
AROUND THE SPOT WHERE THOU ART LAID

”کب سے یہاں ہو چکے ہو؟“ ہارڈنگ نے بروج کو مخاطب کیا۔

”بہت دیر سے“ بروج نے جواب دیا۔

”و آفسو بہانے میں تم نے اپنی کوجھی مات کر دیا ہوگا۔“

”و کیوں“

”تم نرے بدھو جو ہو۔“

”و بروج زیر لب مسکرایا۔“

”لو کلا خشک ہو گیا ہوگا۔“ ہارڈنگ نے بیل گم اپنی اور بروج کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔

— اپنی نے انکار کر دیا۔

بروج نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا تو ہارڈنگ بے اختیار منس پڑا۔

”لے لو — لے سبھی لو۔ اپنی خفا نہیں ہوگی۔ تم اپنی کے سب سے وفادار

اُجلی پرچھائیاں
دوست ہو۔۔۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ تمہاری وفاداری تمہاری بیوقوفی
پر پردہ ڈال دے گی۔۔۔

بروج نے بڑے پیار سے ہارڈنگ کا کال چھو تے ہوئے کہا۔۔۔ ”تم
پھر شرارت پراتر آئے ہو۔۔۔“

”شرارت تو میں اب کرنے والا ہوں۔۔۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا شرارت کروں۔“
اپنی اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔

میں ہارڈنگ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ میسر پلے نہ پڑا۔
اس وقت میں قطعاً اس موڈ میں نہ تھا کہ اس کی شرارتوں کو پسند کرتا۔

میں پھر اپنے بائیں جانب کی ایک قبر کا کتبہ پڑھنے لگا جس پر ایک جوان
عورت اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت ادا اس بیٹی تھی۔ سب سے چھوٹا بچہ
پیرز کے پکیٹ میں سے پُدمینے کی ٹمکیاں نکال کر جبار ہاتھا۔

ONLY THOSE WHO HAVE LOST CAN TELL
THE LOSS OF A LOVED ONE WITHOUT A FAREWELL
ONLY THOSE - - - - -

اور اس نے پیچھے سے میری آنکھیں موند لیں۔۔۔ تم اپنا رخ بالکل میری
طرف کر دو اس وقت تک تمہاری آنکھیں روشنیوں سے محروم رہیں گی۔

میں پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ہارڈنگ نے اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے
میری آنکھوں کو آزاد کیا تو مجھے لمحے بھر تک جھک گئی ہوئی قبریں کچھ ایک دوسرے
سے گڈ مڈ ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اپنی کی سہیلی بہت احتیاط سے ریشمی دستی سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی

اُجلی پر چھائیاں گریو یارڈ

تھی۔ اپنی کچھ اس طرح اس کو تسلی دے رہی تھی جیسے خود اپنے آپ کو دے رہی ہو۔
ہارڈنگ نے میرے شانے میں چٹکی بھر کر ایک کالی اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کی طرف
اشارہ کیا جو بہت ہنس ہنس کر قریب ہی دوادھیڑ عمر کی عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔
دونوں عورتیں منہ کھولے بڑی حیرت اور استعجاب سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

بھری ہوئی چٹکی کی سوزش سے میں تلملا کر ابھی ٹھیک بھی نہ ہو پایا تھا کہ چبایا
ہوا بیل گم منہ سے نکال کر ہارڈنگ نے بڑی صفائی سے اس لڑکی پر دے مارا جو
اس کے کٹے ہوئے خوبصورت بالوں میں جا پھنسا۔ وہ بہت تیزی سے ہماری جانب
گھوم گئی۔ لیکن ہارڈنگ اس طرح انجان ہو گیا جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

میں نے اس کو ٹوکا۔ ”تم کہیں بھی اپنی شرارتوں سے نہیں چوکتے ہو۔“

”اب چلو بھی یہاں سے، مجھے شدید الجھن ہو رہی ہے۔“ میں نے پھر امر کیا۔
”کہاں چلو گے؟“

”فی الوقت تو اس احاطے سے باہر۔“ میں نے جواب دیا۔

اپنی کی نو جوان دوست اپنے ادھیڑ عمر کے شوہر کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی تھی۔

اپنی اس قبر کو تک رہی تھی جس کے سر پر بنے مریم کی مورقی سفید سفید

پھول گرا رہی تھی۔

ہارڈنگ نے اس کا ہاتھ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

”اگر تم آج میری بات مان لو تو میں تمہیں زندگی بھر تنگ نہیں کروں گا۔“

اپنی کا چہرہ جیسے شگفتہ پھول کی طرح دم بھر کو کھل اٹھا تھا۔

اپنی کی آنکھوں میں جیسے جگنو جھٹک آئے تھے۔

اپنی کی آنکھوں میں جو کچھ ہی دیر پہلے آنسوؤں سے سیجی ہوئی تھیں۔

اپنی کی آنکھوں میں جن میں رونے کے بعد سرخیاں گھل مل گئی تھیں۔

ہارڈنگ نے ان آنکھوں میں دیکھتے کے دیکھتے جگنو چھوڑ دیے۔

میں چپ چاپ اپنی کی آنکھوں کو نکھتا رہا۔

اپنی کی آنکھوں کو جو اس قدر حسین تھیں کہ ہارڈنگ کہتا تھا، موت ان آنکھوں

تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتی۔

اپنی جیسے ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

پھر اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور سر جھکا کر سسکنے لگی۔

ہارڈنگ نے اپنی کو آگے بڑھ کر تھام لیا۔ وہ دونوں آگے لگے تھے۔

میں اور بروج پیچھے چل رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے تابوت کے پیچھے چل رہے ہوں۔

موم بنیاں قبروں پر چل رہی تھیں۔ موم بنیاں قبروں کے اطراف انسانی

صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔

گیٹ پر پہنچتے پہنچتے میں نے پھر اس بڑھیا کو دیکھنے کی کوشش کی جو اپنی اٹھارہ

سالہ بیٹی سے باتیں کرنے کے لیے اس طرح آئی تھی جیسے زندگی موت سے نہیں

موت زندگی سے ملنے کے لیے چلی آئی ہو۔

لیکن میں اس بڑھیا کو نہیں دیکھ سکا۔

مجھے وہ عورت بھی دکھائی نہیں دی جو اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اپنے

شوہر کی قبر کے پائنتی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم گیٹ سے باہر آ گئے تو۔

بروج نے اپنی سے پوچھا — کہاں چلو گی اپنی۔

ہارڈنگ نے چھوڑتے ہی کہا ”SHE IS AT MY DISPOSAL“

میں نے علانیہ اس کے لمبے کی تلخی کو محسوس کیا۔

بروج نے مسکرا کر اپنی باہیں ہارڈنگ کے گلے میں ڈال دیں۔

چلو میسز بل گم ”تم جہاں چاہو سب وہیں چلیں گے۔

میں اس طرح خاموش تھا جیسے ابھی گریویارڈ کے احاطے ہی میں ہوں۔

بروج نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھجھوڑا۔

کہاں ہو تم ۹۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ہارڈنگ کہنے لگا — اپنی کو جو سب سے زیادہ ہنسائے گا اس کے حق میں

سب سے زیادہ شراب آئے گی۔

میں نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ جیسے سارے کاسا

گریویارڈ میسرینے میں آچھپا ہو — بظاہر اس قدر اس ہونے کی کوئی وجہ بھی

تو نہ تھی۔

مجھے کبھی اپنی کے بھائی کا خیال آتا۔

کبھی اس بڑھیا کا، کبھی تین سچوں والی جوان عورت کا، کبھی کتوں پر کند

کیے ہوئے ان الفاظ کا جن کو میں بغور پڑھتا رہا تھا۔

ہم ”کو الٹی“ کے لیے روانہ ہو گئے۔

میں نے اسکوٹرا سٹارٹ کی تو بروج میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اینی ہارڈنگ کے ساتھ اس کی موٹر سیکل پر تھی۔

ٹینک بند پر بند پینچے پینچے ہمارا موڈ کافی حد تک بدل چکا تھا۔

اینی مسکراتی مسکراتی اب بھی کہیں کھوسی جاتی لیکن ہارڈنگ دنیا بھر کی مسکراہٹیں آج جیسے اینی ہی کے لبوں پر دیکھنے کی ٹھان بیٹھا تھا۔

وہ پتہ نہیں اس سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ اینی آہستہ آہستہ مسکراہٹوں کے آگے جیسے سپردال رہی تھی۔

بروج نے مجھ سے کہا ”اینی سے اجازت لے لوں تو تمہیں آج ایک بہت اچھی سی بات بتاؤں۔

”میں نے کہا لے لوں اجازت۔“ اور اسکو ٹرکی رفتار بڑھا کر اینی کے برابر لے آیا۔

بروج کہنے لگا ”ابھی نہیں“

میں ہارڈنگ سے مخاطب ہوا تو بروج نے پیچھے سے میسرمنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے پہلے اینی سے اجازت لینا ہے، اس وقت تک تمہارے صبر کو آزمانے دو۔“

اسکو ٹر ہارڈنگ کے برابر آگئی تو اس نے موٹر سیکل کی رفتار اس طرح تیز کی جیسے مجھے چیلنج کر رہا ہو۔

میں نے اس کو روکتے ہوئے کہا کہ میں کبھی بھی اس کے اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے کہ میری بیوی ہے، بچے ہیں۔

اُعلیٰ پر چھائیاں
 اپنی نے ملکی سی چنچ کے ساتھ ہارڈنگ کو تیز چلانے سے روکا تو اس نے قہقہہ
 لگا کر اپنی ”سن ہم“ کو آہستہ کر لیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اپنی سے کہہ رہا تھا۔
 ”تمہیں کس بات کا ڈر ہے جب کہ تمہیں شوہر ہے نہ بچہ۔“
 اپنی نے ٹرے انداز سے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے جواب دیا۔
 ”زندگی صرف اسی لیے ہی تو خوبصورت نہیں ہو جاتی۔ وہ بہر حال
 قیمتی اور حسین ہے۔“

ہارڈنگ کہنے لگا۔ ”اتنا پیار ہے تمہیں زندگی سے۔“
 اور اس نے اپنی کو چھڑنے کے لیے رفتار بڑھا دی۔

یہ سلسلہ ٹینک بند کے پار ہونے تک جاری رہا۔ وہ ہنستا، رفتار تیز
 کر دیتا۔ اپنی اس سے چٹکتا تو وہ رفتار کچھ اور تیز کر دیتا۔ اپنی ڈرنے لگتی تو رفتار پھر
 دھیمی ہو جاتی۔

کوالٹی سپر کے تو اپنی نے اطمینان کا سانس لیا۔

کوالٹی اپنی نیم خوابیدہ اور نیم بیدار فضاؤں کے لیے مشہور ہے۔ وہاں سنبھل کر
 کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک ننھی مٹی سی خوشی ہے لیکن کہیں نہ کہیں
 کوئی غم گھات لگائے بیٹھا ہے۔

دھیمی دھیمی ریڈیو گرام کے لیے، مدھم مدھم روشنیاں، بوہل بوہل ماحول
 دبے دبے قہقہے، سرگوشیوں کے انداز میں باتیں، جیسے ہر ایک سو سو جتن سے کوئی
 چیز چھپا رہا ہو، ایسی چیز جو بہت زیادہ قیمتی ہو۔

اُجلی پر چھائیاں
 گریو یارڈ
 مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگ بڑے چاؤ سے ساری دنیا کی آنکھوں
 سے بچا کر اپنی زندگی کے غم یہاں لے آتے ہیں اور ایک دوسرے کی نظر سے بچ کر
 بڑے ختن سے کونے کونے میں چھپاتے پھرتے ہیں۔ جب لوٹتے ہیں تو پتہ نہیں
 ساتھ لے جاتے ہیں یا یہیں بھول جاتے ہیں۔

کوالٹی میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی ہمیں ہمارا مخصوص ”کارنر“
 مل گیا جہاں بیٹھ کر ہم نے محسوس کیا جیسے ہم نے بھی یہاں کسی وقت اپنا کچھ رکھ چھوڑا تھا
 دیواروں میں لگے ہوئے گہرے نیلے جالی دار ادھر کھلے کنول روشنیاں اس طرح
 پھینک رہے تھے جیسے روشنیاں بھی بڑے ختن سے رکھنے کی کوئی قیمتی شے ہوں۔
 روشنیاں درود دیوار سے جیسے کچھ دور دور تھیں۔ کچھ قریب قریب تھیں۔
 سلمے دیوار پر بہت ہی حسین سے گول حلقے میں دوسرے ٹپکوں کو دوکانے
 اس طرح چھو رہے تھے جیسے چھوتے ہوئے ڈر رہے ہوں۔

”اب یہاں کیا پڑھ رہے ہو“ ہارڈنگ نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں“ میں نے حسین حلقے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ اٹھ
 بچ رہے ہیں۔

اپنی کے لیے شیریں اور سب کے لیے سولن کے ساتھ ہی ہارڈنگ نے برے
 کو ایک لمبی چوڑی لسٹ سدا دی۔ پرائس، فشن، ہیلم۔

میں نے ہیلم فہرست سے نکلوا دیا۔ ہیلم یہاں اتنا لذیذ تیار نہ ہوتا تھا جتنا
 چینیز میں۔

— اپنی نے میری تائید کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم زندگی سے قریب تر ہوتے گئے۔
کچھ ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے زندگی ہمیں کپڑا رہی ہے، ہمیں چوم رہی ہے، ہمیں سینے سے لگا رہی ہے۔

اپنی خوش تھی — ہم سب خوش تھے — اس کی آنکھیں بے پناہ حسین ہو گئی تھیں۔

مجھے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اب بھی ڈر رہا تھا۔

کتنی وسعت ہے ان میں، کتنی گہرائی —

کون ہو گا جو ان آنکھوں میں رہ بس کر ان کا مقدر ہو گیا ہو گا۔

کون ہو گا وہ —

جانے کیوں تیرج کا چہرہ اس سوال کا جواب بن کر میرے ذہن میں بار بار

ابھر رہا تھا —

آہستہ آہستہ ہماری مسکراہٹیں دھیمے دھیمے تمہقوں تک پہنچ رہی تھیں۔

ہارڈنگ پرانی یادوں کے خزانے سے کمرید کمرید کر ایسے جواہر ریزے نکال

رہا تھا جن کے انمول ہونے کا اندازہ غالباً اپنی کو ہو سکتا تھا — لیکن میں بھی ان

کے پرکھنے میں دلچسپی محسوس کرتا رہا۔

بروج کچھ اس عالم میں تھا جیسے اس کو دنیا کی بہ نعت حاصل ہے۔

بالکل مطمئن — اتنا مطمئن کہ اس قدر اطمینان سے آدمی چھوٹا معلوم ہونے

لگتا ہے۔

بھری ہوئی پلیٹوں سے ہارڈنگ نے پرنس اورش کے قتلے اس احتیاط سے

اُٹلی پرچھائیاں
 اپنی کی پلٹ میں اتار دیئے جیسے کوئی کسی کے دل میں چپکے سے جگہ بنا رہا ہو۔
 اپنی نے ہارڈنگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔
 ”تم کتنا کھلا دینا چاہتے ہو مجھے۔“

”اتنا۔“ اس نے بڑے پیار سے اپنی کی ناک اپنی چٹکی میں لے کر مڑ دی۔
 اپنی کہنے لگی۔ ”بچپن میں تمہاری اس حرکت پر میں کس قدر خفا ہوتی تھی۔“
 ”تو کیا اب خوش ہوتی ہو۔“ ہارڈنگ نے غیر متوقع طور پر پوچھا۔
 ”کچھ ایسا خاص تو نہیں۔“

”پھر بھی ذرا سا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“

بروج نے اپنی کی باجھوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو جلانے کے لیے لائٹر جلایا۔
 اپنی سگریٹ جلانے کی تو اس نے ایک لمبا کش لے کر بروج کو بغور دیکھا۔
 پھر ایک اور کش لے کر کہنے لگی۔

”آج تم دونوں سے میں بڑی شرمندگی سے معافی چاہتی ہوں۔“
 ”کیوں میں نے پوچھا۔“

”میں نے اپنی شادی کی تم دونوں کو اطلاع نہیں دی۔“
 ”کیا معنی؟“ ہارڈنگ نے ہونٹوں سے لگا ہوا جام میز پر رکھ دیا۔

ایک ہفتہ ہوتا ہے میری شادی ہو کر۔۔۔ اپنی بڑے اطمینان سے یہ بات کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تو پھر میں تیسرے آدمی کو جن سے تم معافی نہیں مانگ رہی ہو مبارک باد

ہاں۔ اپنی نے بڑی نرمی سے کہا۔

میں نے بڑی گرجو شہی سے بروج سے ہاتھ ٹھایا۔ اس کے خوبصورت مستقبل کے لیے نیک تمنائیں پیش کیں۔

ہارڈنگ نے اٹھ کر بروج کو گلے سے لگایا۔ اور پھر اپنی سیٹ سنبھالتے سنبھالتے اس نے اپنی کی ناک اپنی ٹھکی میں لے کر مروڑ دی۔

شریر کہیں کی۔ مجھ سے چھپایا کیوں تم نے۔ ہارڈنگ نے بڑی محبت سے شکوہ کیا۔ اپنی نے ہارڈنگ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پھر ایک بار معافی مانگی۔ میں نے کہا ”چلو سستے چھوٹے۔ ورنہ کوئی اچھا سا تحفہ تو دینا ہی ہوتا۔“

”وہ تحفہ تو اب سخی دینا ہی ہوگا۔“ ہارڈنگ نے کہا۔

”کیوں دیں۔ اُلٹے جبر مانہ بھی تو لیا جاسکتا ہے۔“

ہارڈنگ لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا۔ غم کی کوئی پرچھائیں دور دور تک اس کے چہرے پر نہ تھی۔

میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بے نام سا غم ٹھپکے سے دل میں بس رہا ہے۔

ہارڈنگ کہہ رہا تھا میں تمہیں بالکل نیا تحفہ دوں گا۔ ایسا تحفہ جو صفر میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ شریر کہیں کی۔ اس نے اپنی کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اپنی نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چھپاتے ہوئے کہا۔

تم میسرے میری ناک ہی سلامت رہنے دو تو بس کافی ہے۔

بروج نے جمائی لی تو ہارڈنگ نے اس کا گلاس بھر دیا۔

وہ خود بہت تیز تیزی رہا تھا۔ میں نے اس کو ٹوکا بھی۔

اس نے اپنی باہیں میسرے گلے میں ڈال کر کہا۔ — یار آج پی لینے

دے نا۔

یہ بات اس نے کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے میرا دل پکڑ کر سارا خون پخوڑ

رہا ہو۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سب سے بے نیاز ہو کر کوالٹی کے خوابیدہ گوشوں

میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ — اپنے غم اور دل کے غم۔ جیسے وہ سب کو اپنا

لینا چاہتا ہو۔

میں نے کہا ”اب چلنا چاہیے۔ بہت ہو گئی ہے۔“

ہارڈنگ نے پوچھا۔ رات یارم۔

اینی نے کہا۔ — دونوں ہی۔

ہارڈنگ باہر نکلتے نکلتے لڑکھڑکیا تو بروج نے اس کو سنبھال لیا۔

ہارڈنگ نے اس کو بغور دیکھا۔ مسکرایا اور چپ چاپ آگے بڑھ کر اپنی

”سنہیم“ اسٹارٹ کر لی۔

اینی کہنے لگی۔ ”میں تمہارے ہی ساتھ چل رہی ہوں۔ آہستہ چلاؤ گے نا۔“

ہارڈنگ نے اینی کی ناک مروری۔ پھر کال تھپتھپا کر کہنے لگا ”تم میرے ساتھ آ سکتی ہو اینی“

تو میں ساری زندگی ہی کو آہستہ آہستہ چلاتا رہتا۔ بالکل اس گٹاری کی طرح جس کے

گریو بارڈ

اُجلی پرچھائیاں

پہیوں میں پھول بندھے ہوں۔ لیکن اپنی میں تمہیں راستے میں پھر ایک بار
ملوں گا۔ تمہارے لیے تحفہ لے کر۔ تمہارا منظر۔ اور پھر تم اس قدر آسانی
سے مجھے راستے پر چھوڑ کر آگے نہیں جاسکو گی۔ فی الوقت تو بروج میرے ساتھ ہے
مجھے اس کی زندگی بھی پیاری ہے اور خود اپنی بھی۔

اس نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی موٹر سیکل بڑھالی۔ پلٹ کر ہم لوگوں
پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہاتھ ہلایا اور دیکھتے کے دیکھتے اس قدر تیزی سے طوفان کی طرح
روانہ ہوا کہ مجھے وحشت ہونے لگی۔

میرے ذہن میں کوئی خیال بجلی کی رو کی طرح آیا۔

میں نے فوری اپنی اسکوٹر سنبھال لی۔

اپنی بڑی خوف زدہ سی نظر آرہی تھی۔

میں نے کہا۔ یہ بہت بُرا ہوا اپنی۔ میں کچھ اور کہہ نہ سکا۔

اپنی میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تم چلو ان کے پیچھے۔

وہ بہت فاصلے پر ہواؤں سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم ٹینک بینڈ پر

پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنی اسکوٹر اس قدر تیز کر دی تھی کہ مزید رفت ر بڑھانے
پر عارِشہ یقینی تھا۔

اپنی بے تحاشہ پکار رہی تھی۔ ہارڈنگ، ہارڈنگ۔

ہارڈنگ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ ہارڈنگ آندھیوں کا مذاق اُڑا رہا

تھا۔ ہارڈنگ زندگی سے بھاگ رہا تھا۔ ہارڈنگ موت کا پیچھا کر رہا تھا۔

گروہ یارڈ

اہلی پرچھاٹیاں

لیکن بروج بے چارہ۔

اپنی چیخ رہی تھی، میں چیخ رہا تھا۔

رک جاؤ ہار ڈنگ، خدا کے لیے رک جاؤ۔

ایسی میری پشت پر اپنا چہرہ رکھ کر سسکنے لگی۔ جیسے وہ غنودگی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر کسی کو پکڑ رہی تھی۔ رک جاؤ، رک جاؤ، بروج ٹھیرو!“ مجھے بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بالکل صاف سنائی دے رہا تھا۔ ہارڈنگ ڈبل ڈک کے بالکل مقابل تھا۔ ڈبل ڈک کا ہارن

پھر میں نے ایک آواز سنی۔ میری آنکھوں میں روشنیاں بھجے لگیں۔
مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔ مجھ میں اپنی آنکھوں
سے وہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

انجی میکر پاس نہیں تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کو ہاسٹل پہنچا دیا گیا ہے۔
وہ بالکل بے ہوش تھی۔

میں بے حس و حرکت چپ چاپ کھڑا رہا۔ کوئی پولیس انسپکٹر مجھے تسلی دے رہا تھا۔ مجھے پھر جگر سا محسوس ہوا۔ اسکوڑ کا سہارا لے کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھوں پر جیسے کوئی چپکے سے ہاتھ رکھ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے ہارڈنگ اور بروج کو ایک دوسرے کے برابر دفنا دیا گیا تھا۔ — اپنی غالباً اب تک ہاسٹل ہی میں تھی۔ — میرا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ — جی چاہتا تھا کہ خوب خوب ہنسوں، پھر چلا چلا کر روڑیروں —

اُجلی پرچھائیاں گریو یارڈ
 اتنا روٹوں کہ ہارڈنگ اپنی سن ہم کا رخ میری طشہ پھیر لے — میرا ذہن جاگتا تو
 آنکھیں صرف سی دیکھتیں کہ ہارڈنگ ہواؤں میں موت کا چچکا کر رہا ہے — بروج اس
 کو روک رہا — چلا رہا ہے۔
 مجھے بروج اور اپنی کی چھین صاف سنائی دیتیں۔

گریو یارڈ سے نکل کر میں سیدھے بارہنچا۔ لیکن گریو یارڈ میکر ساتھ ساتھ ٹرکوں
 پر چل رہا تھا۔ وہ ہر ٹرپر پر میرا چچا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بار میں بھی میرے
 ساتھ تھا۔

مجھے کبھی ہارڈنگ زیادہ یاد آتا، کبھی بروج۔ کبھی میکر ذہن نے ہارڈنگ کے
 خلاف بھی سوچا۔ کبھی میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے جن میں سے شاید دو ایک تو
 شراب میں مل گئے ہوں۔

میں اسی طرح دیر تک پتیارہا۔ پھر یکایک اٹھا — پتہ نہیں کون مجھے
 گریو یارڈ لے جا رہا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوا تو کسی کی سسکیاں صاف سنائی دے
 رہی تھیں۔

اپنی ہی ہو سکتی ہے۔ اپنی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے —
 میں قریب پہنچا تو اپنی نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

وہ بالکل گھائل ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی — اس کا چہرہ مٹی میں اٹا
 ہوا تھا جو آنسوؤں سے نم ہو کر اس کے گالوں، پیشانی اور ناک پر لگ گئی تھی۔
 میں نے دھیکر سے کہا — ”اپنی تم غلط سمجھ رہی ہو — یہ

بروج کی نہیں ہارڈنگ کی قبر ہے۔“
 اپنی نے مجھے ٹرپ کر دیکھا اور پھر اسی قبر سے چمٹ کر سمکنے لگی۔



فرانڈ فنس کی پلیٹ سے اس نے آخری قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، پھر قتلہ سے آخری کا ٹھکانا نکال کر فنس پر پھینک دیا۔
 زبیدہ نے تنک کر کہا دو سروں کی راہ میں کانٹے بچانے سے اپنے تلوے محفوظ نہیں ہو جاتے۔ شیکھر نے بات سنی ان سنی کر دی اور زبیدہ سے مخاطب ہو کر بغیر رم کا آخری قطرہ نکلا اس سے حلق میں اندیل لیا۔ زبیدہ نے اصرار کیا، "بات سن چکے ہو تو چاہے کانوں میں انگلیاں رکھ لو چاہے اس طرح پوز کرو کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑتا۔ بات جو لیٹ کی طرح دل میں کعب گئی ہے اپنی جگہ اہم ہے۔ گھاؤ کر کے ہی رہے گی۔"

شیکھر نے اب کی بار بھی کچھ نہیں کہا۔ اس کی نشیلی آنکھوں نے صرف ڈاکٹر کو دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔ لیکن ڈاکٹر چوں کہ چھیتی نکا ہوں سے اپنی بیوی زبیدہ کو منفردے بازی سے باز رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا اس لیے اس نے شیکھر کی آنکھوں کی زبان نہیں سمجھی جس میں ڈاکٹر کے لیے رحم بھی تھا ہمدردی بھی۔

اُجلی پر چھائیاں

ہیں کو اکب کچھ۔۔

ابو البشر نے لگا کر اٹھایا تو ڈاکٹر نے اپنا گلاس بٹھراتے ہوئے کہا کہ ایک آخری گھونٹ شیکھر کے اس شکار کی خوشی میں جس کے سینے کو چھیدنے کے لیے اس کی بندوں کی نالی میں پہلی بلیٹ بے چین ہے۔ ابو البشر نے ڈاکٹر کے گلاس پر دم کے تازہ کھلے ہوئے شیشے کو جھکایا تو زبیدہ برہم ہو گئی۔ اس نے غصے میں شیشے کے منہ کو اپنی نازک انگلیوں سے ڈاکٹر کے گلاس میں جھکادیا۔ ابو البشر کے شیشہ ہٹانے تک ڈاکٹر کے حصے میں کافی شراب اچھلی تھی۔ اس نے ہنسی ہوئی نظروں سے زبیدہ کو دیکھا لیکن بیزید کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہٹاتے اس کی نظروں کی ہراساںی پیار سے بدل گئی۔ بیزید نے بھی جواباً مسکرا کر اس کو پیار سے پچکارا۔ بس بھی کڑوا رنگ بس ہو چکا شکار اس طرح تو۔۔ ابو البشر نے کہا آج کچھ نہ کچھ تو مار کر ہی رہے گا شیکھر۔ نہ نہ ہنسی ناری ہی ہنسی۔ ابو البشر سب میں زیادہ پیے ہوئے تھا۔ جملہ ادا ہوتے ہوتے جیسے الفاظ خود نشے سے بوجھل ہو کر لڑکھڑا رہے تھے۔

شیکھر نے کہا، میری بندوق میں کوئی بلیٹ کسی ناری کے لیے نہیں ہے میری بندوق کو آج تک یہ تو بھین گوارہ نہ ہوئی۔ جانے کتنے کالے آج ہرنیوں کے غول سے کم ہو جائیں گے۔ جانے کتنی ہرنیاں اپنے پیاروں کے لیے جنگل جنگل تڑپتی پیڑیں گی۔ ہرنیوں کو اس طرح تڑپانے سے نروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میری بلیٹ اسی سینے کو چھیدتی ہے جس سینے میں اتنے جانے سے ہرنیوں کے کیچھے دہل اٹھتے ہیں۔ زبیدہ نے جھٹ سے لن ترافی شروع کی۔ ہرنیوں پر گولی چلانا کوئی بہادری نہیں ہے۔ ان کو اس طرح تڑپا کر بھی تو تم ایک خوشی کا خون کرتے ہو۔ ایک امید کا خون کرتے ہو، ایک اُجالے کا خون کرتے ہو۔ تم کسی ”کالے“ کی آنکھوں کو بے نور

اُجلی پرچھائیاں
 کر کے سمجھتے ہو کہ بے شمار ہرنیوں کی آنکھوں کا نور نہیں چھینا ہے اور اس خود ساختہ
 اصول پر اترتے ہو۔ میں کہتی ہوں چُن چُن کر ایک ایک ہرنی کو مار دو۔ جب تم اپنے غنی
 کیل سے اکتا جاؤ تو آخری گولی کالے کے سینے میں اتار دو اور اپنی نشانہ بازی پر ناز
 کرتے پھرو۔ کیا کبھی تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جنگل میں چوکرڑی بھرتی ہوئی
 یہ خوبصورت ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورت کی طرح بے زبان ہیں۔ تم کالے کو مار گئے
 ہو تو میں سوچتی ہوں جیسے تم نے کسی عورت کا سہاگ چھین لیا۔ میں دل مسوس کر رہ
 جاتی ہوں۔ کاش تم مسکرانے کی بجائے اس وقت شرم محسوس کر سکتے۔

شیکھر نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی بدوق اسٹھائی اور ہوا میں فیر کر دیا لمحے
 بھر کے لیے سب سہم گئے اور اس نے اپنا خالی گلاس میز سے اٹھا کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا
 دیا اور اطمینان سے مسکرانے لگا۔ ڈاکٹر نے شراب گلاس میں اٹریٹے ہوئے نہایت
 لجاجت سے کہا ”شیکھر جی تم زبیدہ کی باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ وہ بُری جذبہ بانی ہے
 اور ہمیشہ تم سے بات یہاں تک الجھتی ہے۔ میں اس کو بہتر سمجھتا ہوں کہ اس نے
 تمہیں غلط سمجھا ہے لیکن وہ تم سے انصاف نہیں کر پاتی۔“ دیکھو کس طرح
 سہمی ہوئی ہے!

شیکھر نے بات کاٹ دی۔ شراب میں سوڈا ملا کر تھرموس سے برون
 نکالتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ تم اپنی مسنر کو ذرا اچھی طرح سمجھا دو ورنہ کیا عجیب
 ہے یہ گولی تمہارے سینے میں اتر جائے۔ اس لیے کہ میرے ایمان میں ہرنیوں کو مارنا
 حرام ہے ہی۔ دونوں نے قہقہہ لگایا۔ ابوالبشر نے زبیدہ کو کن انکھیوں سے
 دیکھا تو وہ شیکھر کو کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

اجلی پر چھائیاں
ڈاکٹر نے شیکھر کی گود سے بندوق لیتے ہوئے کہا کہ پیارے تمہیں قسم ہے تمہاری
بندوق اور تمہاری جیب کا رکی، ظلم کبھی نہ کرنا تمہاری اس حرکت سے مجھے تو
شہادت کا درجہ مل جائے گا، اور شہیدوں کی جگہ صرف جنت میں ہے اور جنت مجھے
کسی قیمت پر بھی گوارہ نہیں ہے۔ میں دوزخ کا شیرانی ہوں مجھ سے دوزخ چھین
لو گے تو جنت میں میری روح دوزخ کے لیے تڑپتی رہے گی۔

زبیدہ نے منہ بنا کر کہا کہ تمہیں تو ہمیشہ مذاق ہی سو جھتا ہے ڈاکٹر۔
ڈاکٹر نے بڑی محبت سے زبیدہ کو دیکھا اور کہنے لگا کہ سچ کہتا ہوں ربی
جیلا یہ ابو البشر صاحب کی جنت کوئی رہنے کی جگہ ہے۔

سنوین نے کل رات کو ایک خواب دیکھا۔ شیکھر جی کے ساتھ شکار کی تلاش
کرتے رات کے گھٹا ٹوپ اندھروں میں ہم بھٹکتے رہے شیکھر کی جیب کا راکا بھی روشنیوں
نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ نہ جیب کا ر کے ہیلڈ لپس کام دے رہے تھے نہ سرج لائٹ میں
اُجالے کی ایک کرن ہی تھی اور اندھیرا تھا کہ بڑھ کر ہر چیز کو گل رہا تھا۔ ایسا اندھیرا جو میں
نے کبھی نہیں دیکھا۔ شیکھر جو میسر برابر بیٹھا تھا گھور گھور کر دیکھنے پر بھی نظر نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم کسی ایسی دنیا میں ہیں جو ہماری دنیا سے کچھ
مختلف ہے۔ میں نے چنچ کر شیکھر کو پکارا۔ آواز جیسے میسر حلق میں اٹک رہی تھی۔
بدقت تمام میں اسے پکار سکا۔ لیکن شیکھر نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اسیرنگ پر شیکھر نہیں
تھا۔ پھر یہ جیب کس طرح چل رہی ہے؟ میسر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے
ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ اُجالے میں چمک رہا تھا۔ میری عقل ماؤف تھی۔ ہاتھ کو جگہ کی
ہوئی روشنی سے مشکل ایک انچ ہٹ کر بی پناہ تاریکی تھی میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔ روشنی

اُجلی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...

وہ دائرہ جو میسر رہا تھا کو محیط کیے ہوئے تھا۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اب
میں سترِ ناقدم کانپ رہا تھا۔ جیب بالکل اس طرح چل رہی تھی جیسے اب الٹ جائے گی
میں نے محسوس کیا کہ جیب کوئی اور چلا رہا ہے جو انڈی ہے۔ شیکھر تو کبھی نہیں ہو سکتا۔
پھیسچڑوں کی پوری قوت سے میں نے پھر پکارا شیکھر تم کہاں ہو؟ چار الفاظ کے اس چھوٹے
سے جملے کو ادا کرنے میں میری ساری چرب زبانی جیسے گنگا ہو گئی تھی ایک مہیب سی
چیخ ساری فضا کو جھوٹ کر میرے کان کے پردوں کو چھینتی ہوئی میرے دل و دماغ پر
بجلی بن کر گری۔ میں نے مارے خوف کے آنکھیں میچ لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے
صاف دکھائی دینے لگا۔ کاش یہ سب کچھ مجھے دکھائی نہ دیتا۔ دھڑکی ہوئی جیب کا
کے سامنے شیکھر بھاگ رہا تھا۔ اس کا جسم کالے کا تھا۔ اس کے پیٹ میں دایں
بائیں دو تیر سو ست تھے اور خون رس رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق دانتوں میں پکڑ
رکھی تھی۔ جیب کا ریتھی تھی اور وہ آگے تھا۔ لیکن اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا
تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو ہم ایک بہت بڑے آہنی دروازے میں داخل ہوئے
تھے۔ جیب کے چاروں پیسے پھینکے ہوئے تھے۔ آہنی دروازے سے اس قدر لوکل
رہی تھی کہ میں وہیں پانی بن کر اور سچر بھاپ میں تبدیل ہو کر کہیں اڑ جانا اگر جیب
آہنی دروازوں کے درمیان ٹھہر جاتی۔ ہم جب دروازے کو پیچھے چھوڑ کر آگے
بڑھے تو ایک لٹو ووق صحرا دور دور تک نظروں کو محیط کیے ہوئے تھا۔ ایک
عجب فضا تھی جو سناٹوں، کیسیوں اور ادھیوں سے مل جل کر جنم لیتی ہے اور
جسے صفر دل محسوس کر سکتا ہے اور یہ احساسات آنسو بھی نہیں بن سکتے جیب
رک گئی۔ گرمی بے پناہ تھی۔ شیکھر سہما ہوا میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میری نظریا ایک

اُجلی پر چھائیاں
 ہیں کوالب کچھ....
 شیکھر پر پڑی تو میں نے جیب سے چھلانگ لگا کر اس کو چٹالیا۔ ہاتھ پھیر چھیر کر
 اس کے بدن کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر برابر تھی۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ شیکھر تم
 دو کالے کس طرح بن گئے تھے۔ یہ ہم کہاں آگئے ہیں لیکن میرا گلہ رندھا ہوا تھا۔ میں
 چاہتا تھا کہ شیکھر سے پلٹ کر خوب خوب رولوں سودہ بھی ممکن نہ تھا اس لیے کروٹ
 کے لیے آنسو ہی نہ تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ جب آنکھیں بہت جلنے لگیں تو
 شیکھر چیخ مار کر مجھ سے جدا ہو گیا۔ ڈاکٹر تمھاری آنکھیں کہاں ہیں؟ آنکھوں کی جگہ
 دو دھکتے ہوئے انگارے ہیں ڈاکٹر۔ اور ان انگاروں سے میرے کال جل گئے
 ہیں۔ مجھے کچھ سچی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیکھر کے کالوں پر واقعی دو انگارے
 دھک رہے تھے اور بس۔ کچھ عجیب سی غنودگی ہم پر طاری رہی۔ پھر یہ غنودگی
 مکمل بے ہوشی سے بدل گئی۔ اور جب مجھ پر ہوش آیا ہے تو دوزخ تک دھندھی دھند
 پھیلی ہوئی تھی۔ انتہائی گرمی تھی اور کبر بھی۔ اب یہ احساس ہی مٹ چکا تھا کہ
 یہاں کی ہر چیز اپنے فواص سے عاری کیوں ہے دن رہے گا تو اجالا نہیں رہے گا۔
 روشنی رہے گی تو اندھیروں کا غلاف اوڑھے ہوئے رہے گی۔ تارے نظر آئیں گے
 تو ٹھنڈک کا نہیں حدت کا احساس ہوگا۔ میں کچھ اسی قسم کی باتیں ابھی سوچ رہی
 رہا تھا کہ میرے پاس ہی ایک قہقہہ بلند ہوا۔ حالانکہ قہقہے کی آواز کچھ مانوس سی تھی۔
 لیکن میں غیر شعوری طور پر اس قہقہے سے بھی سہم گیا کیوں کہ کسی قبرستان کی فضا
 میں قہقہہ کیا معنی رکھتا ہے، اور پھر وہ شخصیت کون ہوگی جو اس فضا میں بھی قہقہہ
 لگا سکتی ہے۔ وہ آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میری حیرت کی انتہاء رہی جب میں
 نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے سوکھے درخت کے نیچے جس کی بے برگ و بار شاخ

اُجلی پر چھائیائیں
 ٹہنیوں پر قطار اندر قطار آلو میٹھے ہیں، دو آدمی ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے
 ہیں لیکن بات کرتے ہوئے جب وہ ہنستے ہیں تو ان کا چہرہ بسورتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہماری
 طرف ان میں سے ایک نے دیکھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر اتنا کہا کہ بے چارے
 نو وارد ہیں۔ جہنم کی ہوا ابھی انہیں لگی نہیں۔ دو ایک روز میں پر پرزے
 لکالیں گے۔ میں اور شکیر غور سے ان کی باتیں سن ہی رہے تھے کہ منہ میں پائپ لگا
 ہوئے ایک شخص گرم سوٹ پہنے ہوئے ادھر آ نکلا۔ سو کچے پیر سے پیٹھ لگائے ہوئے
 جو شخص کھڑا تھا وہ فوراً آگے بڑھا اور سوٹ پہنے ہوئے صاحب بہادر کے قریب پہنچ
 کر انہیں بغور دیکھنے لگا پھر فوراً بڑھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت
 مسرت سے پوچھنے لگا کہ حضور آپ اوپر کدھر آ گئے۔ سوٹ پہنے ہوئے حضور نے پائپ کا
 لمبا سا کش لے کر بڑے شانِ استغناء سے کہا کہ بھی تم نے ہاسٹل کی بلڈنگ والے
 معاملے میں جو مجھے پانچ فی صد دلایا تھا نابلس اسی ایک تصور کا خمیازہ بھگت رہا ہو۔
 منتھاری عنایات شامل حال نہ ہوتیں تو میں تم سے یہاں کسی طرح نہ ملتا۔ وارڈ نمبر
 (۳) کی چھت بیٹھ جانے سے جتنے مریض دوا خانے میں مرے تھے سالے سمجھوں نے میرے
 خلاف گواہی دی۔ میں کہتا نہیں تھا کہ یہ (۳) کا ہندسہ ہی بُرا ہوتا ہے۔ میں نے
 بہتر سمجھایا کہ میٹرل جو سپلائی کیا گیا تھا وہ خود بہت ناقص تھا لیکن یہاں مالکان جزا و
 سزا بالکل جاہل قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے تو ان کی مخلوق ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ہیں
 کیا۔ وہ نظری نہیں آتے، صخر الٹی سیدھی آوازیں نکالتے ہیں۔ جواب دیتا ہوں تو
 جواب اب جواب نہیں ملتا۔ جواب کیا دیں گے بے چارے۔ انجینیئر کا فن ہے کوئی مذاق
 نہیں۔ یہ لوگ فن سے بالکل نا بلد ہیں۔ مجھے دکھ ہے تو اسی بات کہ کن جو بہرہ ناشاس

اہل پرچھائیاں

ہیں کو اکب کچھ
لوگوں سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ رشوت و شہوت تو چلتی ہی تھی لیکن تم ہی بتاؤ گئے دار
صاحب کیا میں ملک کے چوٹی کے فنکاروں میں نہیں تھا۔ لیکن یہ اہل دوزخ فن کی
قدر ہی نہیں کرتے۔ میری خدمات انھیں حاصل ہوں تو قسم ہے اس دوزخ ہی کو
جنت بنا کر نہ رکھ دوں تو نام نثار اللہ ولد و فوالہ نہیں لیکن انجینئر صاحب کی زبان
سے اپنے اور اپنے والد محترم کے نام کی ادائیگی اس طرح ہو کر رہ گئی ”نثار ولد و فوال“
گئے دار نے بہت ادب سے پوچھا کہ سرکار کیا کسی مصلحت سے نام اور ولدیت میں
تھوڑی سی تبدیلی کر لی ہے ؟ انجینئر نے ماکانہ انداز میں کہا کہ گئے دار صاحب دوزخ
کی اس ناپاک فضا میں باری تعالیٰ کا نام ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص ادا
کرنے کی کوشش کرے تو اس پر ناری دُورے برسائے جاتے ہیں۔ مختاری پیٹھ شاہ
آگ کے ان ہتھروں کی شراب شراب سے واقف نہیں ہے۔ ہم دنیا میں سنتے تھے
کہ۔ خو۔ (وہ پورا لفظ ادا نہ کر سکا) کی لالٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن یہاں معلوم ہوا
کہ ہماری پیٹھ پر جو دُورے برستے ہیں اور جس کی تکلیف سے ہم پسینہ پسینہ ہو جاتے
ہیں دُنیا والوں نے اسی کا نام برق و باراں رکھا ہے۔ آس پاس دیکھ کر
گئے دار نے آہستہ سے انجینئر سے پوچھا۔ سرکار تمباکو نوشی منع ہے، پھر آپ یہ پائپ
کس طرح۔۔۔ انجینئر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہش کہا۔ گویا یہ گئے دار کو
خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو اس نے سرگوشی کے انداز
میں آہستہ سے کہا۔ دیکھو فشتروں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کے
مراتب کا لحاظ کرنا چاہیے۔ جتنا عظیم المرتبت فشتہ ہو گا اتنا ہی وہ دوسرے فرشتوں
کی نسبت زیادہ دیکھ سکے گا، زیادہ سن سکے گا، اسی لیے احتیاط لازم ہے۔ رہ گیا

اجلی پرچھائیاں
میں پائپ کس طرح پیتا ہوں تو سنو، میری نگرانی کے لیے جو فرشتہ مجھ پر متعین ہے اس کو پائپ بہت پسند آگیا ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ ایک دن وہ پائپ پیے گا اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔ ایک دن میں پیوں گا اور وہ میری رکھوالی کرے گا۔ آج میری باری ہے۔ اتنے میں گتے دار نے سنا ایک بہت ہی سیریلی گھنٹی کی صدا آئی اور جھٹ سے انجین نے پائپ اپنے تیلون کے اندر اس جیب میں رکھ لی جس میں وہ رشوت کی رقم اڑس لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ سن کر اور دیکھ کر گتے دار بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔

اب تو بات بالکل صاف تھی۔ میں نے اور سیکھر نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے کرموں کو بھوک رہے ہیں۔ دنیا ہم سے چھوٹ گئی ہے اور یہ مقام جہاں ہم ہیں وہی مشہور معروف دوزخ ہے جس کے تصور ہی سے ہم کانپ جاتے تھے۔

ڈاکٹر کی زبان ہمیشہ کی طرح فیخی کی مانند چل رہی تھی۔ کبھی مسکراہٹوں کبھی قہقہوں کے درمیان وہ مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ جب وہ سگریٹ جلانے کے لیے رکاوٹ ابوالبشر نے کہا کہ ڈاکٹر لگے ہاتھوں پورا خواب ہی بیان کر دو۔ سوائے زبیدہ ہیں کے یہاں کون ہے جو جنت میں جائے گا۔ دوزخ سے اب مجھے بھی کچھ دلچسپی ہونے لگی ہے۔ اس لیے کہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی وہیں جانا ہے۔

ڈاکٹر نے بہت محبت سے زبیدہ کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا کہ میں اپنی زبانی کو کسی قیمت پر سچی جنت میں نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرے بغیر سکھے کہاں رہ سکے گی۔ اس کے لیے ہر سائنس دوزخ ہی میں فراہم ہو جائے گی۔
زبیدہ نے جبر جبری سی ٹی ٹیجی اس قسم کا مذاق تمھیں لوگوں کو مبارک ہو۔

مجھے کیوں اپنے ساتھ گناہ میں گھسیٹتے ہو۔“

اُٹلی پر چھائیاں
ڈاکٹر میسر گویا ہوا۔ ”سچ مانو زنی، یہ انجینر اور گتے دار مجھے یقین ہے وہ سب
کچھ کر کے رہیں گے جو انھوں نے مجھے خواب میں کر دکھایا ہے۔“
شیکھر نے مداخلت کی۔ ”خیر آگے چلو تاؤ کہ پھر کیا ہوا۔“

کیا ہوا تھا۔ بات صاف تھی۔ دوسری گھنٹی پہلی گھنٹی سے زیادہ سُریلی تھی۔
جھٹ سے صاحب نے پائپ نکالا اور منہ میں رکھ لیا۔ دھویں کے ننھے ننھے تھمر غولے اپنی
خوشبو سے گتے دار کو مسحور کرنے لگے۔ گتے دار نے نہایت لجاجت سے کہا۔ سرکار، ایک دم
مجھے بھی عنایت ہو تا کہ اس دم کے سہارے میں اپنی پھلی زندگی کو کچھ دیر کے لیے یاد کر سکوں۔
صاحب نے پہلے تو کچھ پس پیش کیا پھر مسکرا کر پائپ بڑھادیا۔ گتے دار نے پائپ کو منہ لگا کر
جھوٹا کیے بغیر اپنے ہاتھ کی دھنکنی بنائی اور لبکاش مارا۔ آگ برف میں تبدیل ہو گئی تھی۔
صاحب مسکرایا۔ کہنے لگا میں جانتا تھا کہ تم پائپ کا لطف نہیں اٹھا سکتے اس لیے کہ تم
اجازت یافتہ نہیں ہو۔ گتے دار نے پائپ کو جھار کر پھر کوشش کرنی چاہی۔ پائپ
کو جھارنے سے برف کا ایک ٹکڑا نیچے گرا اور بے چارہ شیکھر جس کی زبان اور حلق
پیاس سے سوکھ رہے تھے دو ہی جہت میں برف کے ٹکڑے پر چھپنا۔ لیکن اس کے
منہ میں پیچھے پیچھے برف کا ٹکڑا چھو دکھتا ہوا انکارہ بن چکا تھا۔ ایک چمچ مار کر شیکھر نے دیکھا
ہوا انکارہ تنھوک دیا۔ گتے دار اور میں سہم گئے تھے۔ لیکن صاحب پائپ
منہ میں رکھے اطمینان سے دھواں اُڑا رہا تھا۔

پائپ منہ سے نکال کر صاحب ہم سے مخاطب ہوا۔ ”کب آئے ہو؟“
”آج ہی بلکا بھی ابھی، کچھ ہی دیر پہلے جناب۔“
”کیا کرتے تھے۔“

ہیں کو اک بچہ...

اصلی پرچھائیاں
”ڈاکٹر تھے“

”اور یہ جو تمہارے ساتھی ہیں“

”لینڈ لارڈ تھے۔ شکار کرتے تھے“

صاحب نے پاپ منہ میں رکھ کر حقارت سے دیکھا۔ کوئی بھی ہمارے کام کا نہیں۔ دونوں ہی قریب قریب ہم پیشہ بکھے۔ ایک جان بچانے میں مہارت رکھتا تھا اور ایک جان لینے میں ماہر تھا۔ یہاں ایسے کسی پیشہ ور کی ضرورت ہی نہیں اس لیے کموت کا ادھر گنہ رہی نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ بچا سکتا ہے۔ شیکھر نے اپنی بندوق چھپا لینے کی کوشش کی۔

صاحب نے بندوق پر اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا لینڈ لارڈ صاحبان یہ سارے کے سارے لینڈس اپنی ہی ملکیت سمجھے اور ان کے چپے چپے پر پرنٹکے پتھر پئے۔ ہم کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ صاحب نے گتے دار کو اشارہ کیا اور وہ دونوں آہستہ سے کھسک کر کہیں غائب ہو گئے۔

شیکھر نے مجھ سے کہا یار۔ سالانہ دار بن بیٹھا ہے یہاں بھی۔

لیکن میں بہت اداس تھا۔ اپنے فن کی بے مانگی کا احساس مجھے کچھ کے دے رہا تھا۔ دنیا تک جا کر کوئی پیغام پہنچانے والا ملتا تو میں سب سے پہلی بات جو کہلواتا وہ یہی ہوتی کہ اب میسے خاندان میں کوئی شخص بھی یہ پیشہ اختیار نہ کرے۔

ہم دونوں پر پھر وہی رقت کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر یوں ہی بے دلی کے عالم میں ہم بیٹھے رہے۔ بیکایک سامنے کی غار دار جھڑی کے جھنڈ میں کچھ سبز سبز سی پیدا ہوئی۔ ایک بہت موٹا تازہ رنگ دھڑنگ آدمی اپنے دونوں ہاتھوں سے

اُجلی پر چھائیاں
اپنی شرمگاہ چھپائے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ تنھوڑی
تنھوڑی دیر سے وہ تھلا کر بیٹھنے لگتا۔ اپنے ننگے بدن کو بار بار تڑپ تڑپ کر پہلنا
اس کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی۔ شکیں نے مجھے کہنی ماری۔ میں کھسک کر اس کے
بہت قریب ہو گیا۔ کہیں ان مراحل سے ہم کو بھی تو نہیں گزرنا ہے شیکھر لیکن شیکھر
اب ہچھی پھٹی آنکھوں سے ننگ ڈھنگ آدمی کے اطراف ہوا میں اڑتے ہوئے
بے حساب کفن دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہراساں
بڑھ رہی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سانس رک جائے گی۔
لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سانس رک جانے کا کوئی سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مر جانا بھی یہاں بس میں
نہ تھا۔۔۔۔۔ ننگ ڈھنگ آدمی اچھل اچھل کر کسی نہ کسی کفن کو کپڑا لینا چاہتا
تھا لیکن کفن تھے کہ اس کی گرفت سے صاف پڑ نکلتے۔ شرٹ پ شرٹ پ آواز آتی
اور وہ تڑپ تڑپ کر کھینے لٹے لگتا، کبھی بے تحاشہ بھاگنے لگتا۔

اپنی شرمگاہ چھپائے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ تنھوڑی تنھوڑی دیر سے وہ تھلا کر پوچھنے لگتا۔ اپنے ننگے بدن کو بار بار تڑپ تڑپ کر سہلاتا اس کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی۔ شیکھر نے مجھے کہنی ماری۔ میں کھسک کر اس کے بہت قریب ہو گیا۔ کہیں ان مراحل سے ہم کو بھی تو نہیں گزرنا ہے شیکھر۔ لیکن شیکھر اب چھٹی پٹھی آنکھوں سے ننگ ڈھڑنگ آدمی کے اطراف ہوا میں اڑتے ہوئے بے حساب کفن دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہراساں بیڑھ رہی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سانس رک جائے گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سانس رک جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مرجانا بھی یہاں بس میں نہ تھا۔۔۔۔۔ ننگ ڈھڑنگ آدمی اچھل اچھل کر کسی نہ کسی کفن کو کپڑا لینا چاہتا تھا لیکن کفن تھے کہ اس کی گرفت سے صاف بچ نکلتے۔ شرٹاپ شرٹاپ آوازیں آتی اور وہ تڑپ تڑپ کر کہیں لوٹنے لگتا، کبھی بے تحاشہ بھاگنے لگتا۔

صاحبِ اطمینان سے باتیں کرتا ہوا اپنے گتے دار کے ساتھ ادھر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ہمارے چہرے خود بخود دمک اٹھے۔ ہم لپک کر صاحب کے قریب ہو گئے۔ اب کے صاحب کے ساتھ ساتھ اس کے گتے دار نے بھی ہمیں حقارت سے دیکھا۔ میں نے بہت خوشامد سے ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صفا سے سوال کر ہی لیا کہ یہ کون مظلوم ہے؟ صاحب بھڑکیا۔ تو تم نے یہاں ڈاکوئی کا پیشہ ترک کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ظالم معین مظلوم دکھائی دیتا ہے! یہ کپڑوں کا بیوپاری ہے۔ جنگ کے زمانے میں جب کپڑا بہت

اجلی پر چھائیاں
 منہ کا ہو گیا تو اس نے کفن بیچنا شروع کیا اور اسی بہانے اس نے بڑے بڑے پرٹ
 حاصل کیے۔ مردوں کو کفن کے لیے ترسا ترسا کر اس نے زندوں کا حق ڈھانکا اور
 بے حساب پسپہ ان سے بٹور لیا۔ نہ صرف اسی پر کٹنیا بلکہ باضابطہ نصف درجن پنے
 کا رندے مقرر کیے جن کا کام صدف بھی تھا کہ شہر بھر کی ہر تازہ قبر سے راتوں کو پھیری
 لگا کر کفن نکال لاتے۔

یا۔۔ اور میری زبان سے ”اللہ“ نہ نکل سکا۔ اس لیے کہ اس گنہگار فضا
 میں صدف بھل سکتے تھے لیکن اس لفظ کے تلفظ کی ادائی ہو سکتی تھی۔ شکیہ نے
 بہت حقارت سے ننگ و صرنگ آدمی کی طرف دیکھا۔ میں نے دریافت کیا، صاحب
 اس کے چھٹیوں سمجھتی کہاں ہیں؟ صاحب نے بہت ہی یقین سے جواب دیا
 کہ وہ ابھی دنیا ہی میں ہیں۔ ان کے لیے بلائیں نازل کی گئی ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ چھکے
 چھ ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں بھیج دیئے جائیں۔ اب تو صاحب سے ہم بے اندازہ
 مرعوب ہو گئے۔ صاحب نہ صرف دوزخ میں پاؤں پتیا پھرتا ہے بلکہ اس کو اس کا بھی
 علم ہے کہ دنیا کو یہاں سے کیا کیا احکام صادر کیے جاتے ہیں۔ میں صاحب سے کچھ اور
 پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

کیا تم اس آدمی کو پہچانتے ہو۔

گھبراہٹ میں میں نے منہ سے جھوٹا موٹ نکل گیا کہ ہاں اچھی طرح جانتا ہوں۔
 صاحب نے پیٹھ ٹھونکی اور کان میں کہا کہ بلیک مارکٹ کیا ہوا اور قبروں سے
 چرایا ہوا بے شمار کپڑا یہاں اس کے نام سے اسٹور کیا گیا ہے جو بروز حشر اس کی
 دیوں کے حساب کتاب کے وقت گزروں سے نہیں سیلوں سے ناپا جائے گا لیکن اس

اجلی پر چھائیاں
 بدبخت کی روح تڑپ تڑپ کر ابھی اُسی سمت بھاگتی ہے جہاں یہ کپڑا اسٹور ہے۔ تم اس
 سے کہہ دو کہ اگر وہ تین حصے ہمیں دے سکتا ہے تو ہم نہ صرف اس پر نازل ہوئے
 عذابوں کو کم کر دیں گے بلکہ کپڑے کا جو محتاجی حصہ بچا ہوا ہے اس کے اہل و عیال کے
 لیے دنیا میں واپس کر دیں گے۔ اگر وہ سارے کا سارا کپڑا ہمارے حوالے کر دے تو
 اس کے ساتھیوں میں سے ایک نہیں دو کی جس کی بھی وہ سفارش کرے جاں بخشی کی
 جائے گی اور دنیا میں مزید دو سال، دو ماہ، دو دن، دو گھنٹے، دو منٹ، دو سکندریہ
 کی اجازت دلوادیں گے تاکہ اس طویل مدت میں وہ دونوں اس کے اور اپنے اہل و
 عیال کے لیے مستقبل کے کچھ سامان فراہم کر سکیں۔ صاحب کی یہ باتیں سن کر
 میں سسکریہ تک کا پنہ لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے
 وہ یہاں بھی بالکل دنیا ہی کے انداز سے کاروبار چلا رہا ہے۔ مجھ کو خاموش
 دیکھ کر صاحب نے پھر کنا شروع کیا۔

ڈاکٹر تم پس و پیش کیوں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ سودا میں اپنی منفعت
 کی خاطر کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا
 یہ دوزخ جو جنت کے مقابلے میں پوچ اور پچ ہے اتنا ترقی کرے اتنا ترقی کرے
 کہ سارے جتنی ہم باشندگان جہنم اور اہالیان دوزخ پر رشک کرنے لگیں۔ تم پڑھے
 لکھے ہو اور دیکھنے سے بھی کافی اٹلکچھول معلوم ہوتے ہو۔ ابھی صاحب نے جلد پورا
 نہیں کیا تھا کہ ایک میرلی سی گھنٹی کی آواز آئی اور جھٹ سے صاحب نے اپنا پائپ
 اپنے منہ سے نکال کر ہوا میں اچھال دیا۔ ہم نے دیکھا کہ صاحب سے عجیب شکل تین چار
 قدم کے فاصلے پر پائپ ہوا میں معلق آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا اور خوشبودار

اُجلی پرچھائیاں
دھویں کے جھبکے اس میں سے نکل رہے تھے۔ میں نے اوشیکھ نے ایک دوسرے کو
دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ دوسرا دن ہو گیا ہے
اور آج فشتہ کی باری ہے اور یہ فرشتہ ہی ہے جو پائپ پی رہا ہے۔

صاحب مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔ ہاں تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ ”میں نے اندازہ
لگایا ہے کہ ہم اپنی دوزخ کو بہت ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے صرف اتحاد کی ضرورت
ہے۔ اتحاد جو انسانوں اور فرشتوں کے فرق کو مٹا دے اور میں نے بہت سے فرشتوں
کو اپنا لیا ہے۔“ پھر صاحب نے نہایت ہی صفائی سے آنکھ مار کر کہا۔ ”ڈاکٹر
تم ابھی نہیں جانتے۔ فرشتوں کی قوم بڑی سیدھی سادھی ہے بہت بھولی بھالی۔“
اور جھبک کر چپکے سے کان میں کہنے لگا۔ ”نہایت سادہ لوح اور۔۔۔“ بات
کاٹ کر مسکراتے ہوئے میری باہنہ پر چٹکی لے لی۔ میں خوش تھا کہ چلو یہاں کی
ایک صاحب اقتدار شخصیت سے کچھ نئے تکلفی تو بڑھ رہی ہے۔

معلق پائپ ہوا میں جلد جلد حرکت کرنے لگا اور دھویں کی چادروں کی بجائے
گول گول بے شمار دھویں کے مرغولے ہمارے اطراف پھیل گئے۔ فرشتہ اپنی
تعریف سن کر شاید کچھ ترنگ میں آ گیا تھا۔

صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ڈاکٹر ذرا اس بات پر بھی تو غور کرو کہ قدرت نے
خود ہماری ترقی کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ یہاں کون نہیں ہے جس کی دماغی صلاحیتوں
پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے مفکر، فلسفی، شاعر، ادیب، انجینئر، سائنس دان، ایکٹرس
اور پھر ڈاکو، بلک مارکیٹرس، جیب کترے جب قدرت نے خود اس چھوٹے سے خطے
میں اہل ثروت، اہل ہنر اور اہل دماغ جمع کر دیے ہیں تو یہ خطہ ہوش مندان و

اُجلی پرچھائیاں
 فنِ داں، کس طرح کسی ایسی جنت سے پیچھے رہ سکتا ہے جہاں نہ اہلِ دل ہیں نہ اہلِ
 دماغ۔ میں نے سچہ جھری جھری سی لی۔ صاحب کی زبان پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جوجی
 چاہا بکتا رہتا ہے۔ کسی کسی برگزیدہ ہستیاں جنت میں ہوں گی ان کے متعلق اس طرح
 کھلے بندوں تو ہین آمیز الفاظ زبان سے نکلتے ہوئے بھی لوپس و پیش نہیں کرتا اور
 فشتے صاحب ہیں کہ صاحب کے پاس ہی کھڑے اطمینان سے پائپ پی رہے ہیں جیسے
 کچھ ہو ہی نہیں۔

گتے دار صاحب کی باتیں سُن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کی باچھیں ہمیشہ
 کھلی رہتیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ صاحب یہ سب اہلِ ہنر اور اہلِ فن کہاں ہیں
 جن کا ابھی آپ نے تذکرہ کیا۔ صاحب نے راز دارانہ طور پر کہا کہ سب قیدِ تنہائی جگت رہے
 ہیں۔ حاکمانِ جزا و سزا نے خاص طور پر فرشتوں کو تاکید کی ہے کہ کسی پڑے لکھے آدمی کو
 کسی پڑے لکھے آدمی سے نہ ملنے دیا جائے لیکن تم کسی سے کہنا نہیں، غصہ ملاقاتیں جاری
 ہیں۔ ہم ایک دوسرے مل رہے ہیں۔ پلان تیار ہو رہا ہے، ساری چیزیں فراہم
 ہو جانے کی توقع ہے۔ صرف کپڑے کی قلت ہے لیکن یہ کفن چور نہیں مانگا۔ ویسے جیسا
 ملیں تیار ہو جائیں گی تو ایک سے ایک عمدہ کپڑا ہیں دستیاب ہو جائے گا لیکن فی الوقت
 ہمیں اس کفن چور کے اسٹاک کی ضرورت ہے جو فوراً کام میں آ سکے۔

میں نے دست بستہ پوچھا کہ صاحب کپڑے کی اس قدر شدید ضرورت کیوں
 لاحق ہوئی۔ صاحب نے شکم کو ذرا ہٹ جانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔ جب وہ
 پار قدم پیچھے ہٹا تو صاحب نے دو قدم مجھے قریب کیا اور ایک قدم خود قریب ہو کر کہا
 کہ جب جسمانی آخریت پہنچ کر ہر ایک کو قیدِ تنہائی کی سزا دے دی جاتی ہے تو اس کے

اجلی پرچھائیاں
 بدن پر جو بھی کپڑے رہتے ہیں وہ اتار لیے جاتے ہیں۔ کپڑے اترتے ہی ایک آدمی کو
 آدمی کو نظر ہی نہیں آتا، اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں بڑی دشواری
 ہوتی ہے۔ ایک انگریز ٹیلیکریٹم نے خدمات حاصل کر لی ہیں۔ کپڑا فراہم ہو جائے تو
 ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں سہولت ہوگی۔

میں نے پوچھا کہ صاحب پھر آپ جو اس طرح اطمینان سے سوٹ پہنہ پھر رہے
 ہیں؟ یہ کہاں سے آگیا۔ صاحب نے جواب دیا کہ ڈاکٹر، میں اور یہ گئے دار صاحب
 مختلف حادثوں میں دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ میں ہوائی جہاز کے حادثے
 میں ہلاک ہوا تھا جب کہ امریکہ میں علمی ٹریننگ کے لیے دوسری بار جا رہا تھا۔ اس
 وقت بھی سوٹ میں نے زیب تن کیا تھا۔ میری لاش میسر اہل و عیال کو نہ مل سکی
 اگر مل جاتی تو دو گر کفن کا کپڑا ہی وہ لوگ میسر سا خنہ کر دیتے۔ یہی حال ان گتے دار
 صاحب کا ہے۔ یہ قوم کے ہندو ہیں۔ ملک و قوم کے بھی خواہوں میں ان کا نام سہرہ فرست
 رہا ہے۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ ایک ریلوے برج تعمیر کرواتے وقت
 انھوں نے کافی کمایا لیکن جب ٹرین پل کے نیچے گری ہے تو اپنے اہل وطن کو انکھوں
 کے سامنے دم توڑتا ہوا وہ کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی مرنے والوں میں
 چپکے سے شامل ہو گئے۔ اس وقت اسی پینٹ شرٹ میں وہ ملبوس تھے۔ دو ریکوں
 جاؤ بھی تم لوگ خود اپنے ہی کو دیکھ لو نا۔ کون کہتا ہے کہ تم دونوں کی طبعی موت
 واقع ہوئی ہے۔ شکار کے وقت جیب ایک کنویں میں گر گئی اور تم لوگ یہاں پہنچ گئے۔
 ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی غیبی قوت نے شیکر کی گردن پکڑ لی اور
 اس کو ایک شیشے میں توڑ مڑ کر اتارنے لگا۔ شیکر کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور وہ بے تحاشہ

اُٹلی پر چھائیاں
 چنچ رہا تھا۔ صاحب نے پوچھا کیا تم دونوں شرابی ہو۔ یہاں شرابیوں کی سی
 سنا ہے۔ ہیں نے کہا کہ صاحب صفت شوق کرتے تھے اور وہ بھی صرف ”بیر“ اور ”جن“
 سے۔ اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اپنی گردن پر کسی آہنی پنچے کی گرفت محسوس
 ہوئی۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور اس کے بعد مجھے ایک شیشے میں ٹھوسنا جانے
 لگا۔ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس کے بعد
 مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے صفت اتنا یاد ہے کہ ایک طویل مدت تک میں بے اندازہ
 تکلیف اور درد میں بسر کرتا رہا اور اس پوری مدت میں دل و دماغ پر غم و اندوہ کا
 اس طرح بوجھ رہا کہ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل پھیل کر اپنی
 ہیئت ترکسبی بدل چکا تھا۔ جب فرشتے نے مجھے غار سے اوپر پھینکا تو میں بالکل اس
 طرح ایک چٹیل میدان میں آگرا جیسے ایک لڑکے کی گیند جس کو ہوا میں اچھال کر زمین پر
 ٹپ کھانے سے پہلے ہی لڑکے نے مچلا دیا ہو کہ اس نے گیند اچھالی تھی ہوش و حواس
 بجا ہوئے تو مجھے پتھر کے تراشے جانے کی سُری آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ
 آواز میں نے دنیا میں بارہا سنی تھی۔ یقیناً کہیں کوئی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی تھی
 میں آہستہ آہستہ آواز کے رخ پر بڑھتا گیا۔ جوں جوں میں اس آواز کے قریب ہوتا
 گیا یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں دنیا میں واپس سجوا دیا گیا ہوں۔ جب ذریعہ تعمیر بلندنگ کے قریب
 پہنچ گیا تو بے شمار لوگ کام کر رہے تھے۔ طبل یا رھاں جو ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا
 اور جو میضے سے مراعتا وہ ٹینس کورٹ تیار کروا رہا تھا اور اس کا منہ کچھوروں سے
 بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بے تحاشہ لپٹ گیا۔ کہنے لگا کہ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ طویل

اُجلی پرچھائیاں
 قید تنہائی نے میرے دل و دماغ کو شل کر دیا تھا۔ میں سہا ہوا تھا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔
 خاموشی ہی میں مجھے خیریت نظر آئی۔ میں نے صبر اتنا پوچھا۔ یہ سب کیا ہے اور تم یہاں
 بھی کھاتے رہنے کی عادت سے باز نہیں آتے۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ ڈاکٹر وہاں تو
 تمہارے پیٹے "ٹولیفے" کا ڈر تھا جس کے آگے تمہاری ساری علین گھٹنے ٹیک چکی تھی
 اور میں چپکے سے ادھر آ نکلا تھا۔ یہاں خواہ کچھ ہو چڑیل موت تو ہے نہیں جس میں اپنا
 منہ بند رکھوں۔ بس جو سامنے آجائے کھاتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے جنت میں آم
 نہیں۔ ایک ٹن کھجور دے کر جنت والے صاف دس پونڈ آم قبول کرنے کے لیے تیار
 ہیں لیکن ہماری سہرا کا بھی سوچ رہی ہے۔ میں ششدر تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا
 ہے؟ کیا یہ وہی دوزخ ہے۔ لیکن ہر سانی نے مجھے کھل کر بات کرنے نہ دیا۔ بس ٹکڑے کر
 دیکھے جا رہا تھا۔ پبل یا رخاں نے کہا۔ ڈاکٹر اس قدر حیران کیوں ہو۔ جاؤ کچھ گھوم پھر کر
 آؤ طبیعت سنبھل جائے گی۔ آگے بڑھا۔ بڑھتا گیا کہیں سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں کہیں
 باغات کا پلان ڈالا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ ساری چیزیں دیکھتا رہا۔ چلتا رہا۔
 دیکھتا رہا۔ آبادی جہاں ختم ہو گئی تھی اس سے کچھ فاصلہ پر کچھ اور کام ہو رہا تھا۔ کام
 کرنے والے سارے کے سارے بھلک سفید لوگ تھے۔ میں نے ڈرتے ہوئے ایک نوجوان
 کو روک کر پوچھا کہ کیاں یہاں کیا بن رہا ہے۔ نوجوان نے مجھے سے پر تپک دیکھا۔
 غالباً قید تنہائی کاٹ کر ابھی چھوٹے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کہنے لگا
 ایرودرم بن رہا ہے اور ایرودرم سے دو فرلانگ ہی پرسیس کی تجزیہ گاہ تیار
 ہو رہی ہے۔ دیکھنے کے قابل عمارت ہوگی۔ دعا کرو کہ "اموف" کو ہم جنت سے اعوا
 کر کے یہاں لانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ان کے بغیر "دو زخیا دانا" کی بہت بے چینی

اٹکی پر چھائیاں
ہیں اور کہتے ہیں کہ ارموف آجائے تو جنت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہے گی۔
میں نے پوچھا یہ دونوں کون ہیں۔ نوجوان نے کہا کہ یا تم بھی کیا دو اوسٹا ف ڈیٹ“
آدمی ہو۔ یہی تو وہ ہیں جنہوں نے روس میں اسپینک تیار کیا تھا۔ ارموف دراصل ایک
کوئی ایسے نیک آدمی نہیں اور نہ ان کو ان کی نیکیوں کی بناء پر جنت میں رکھا گیا
ہے۔ حاکمان سزا و جزا کو ڈرتے تھے کہ وہ بھی ————— ”دورخیا داناوسکی“ کے ساتھ یہاں
جہنم میں رہیں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا کر دیں گے۔ اسی لیے ان دونوں کو الگ
الگ رکھنا مقصود تھا۔ ”ارموف“ کو جنت مل گئی۔ بھی سیاست بھی تو کوئی چیز ہے
اس مسئلہ پر حاکمان جبر و قدر اور حاکمان جزا و سزا میں اختلافات بھی پیدا ہو چکے
ہیں کہ ارموف کو جنت میں نہیں رکھنا چاہیے تھا کیوں کہ وہاں کی فضا کو وہ متاثر کر دینگا
میں نے پوچھا حاکموں میں زیادہ اختیارات کس کے ہیں۔ نوجوان نے کہا۔ کیا تم اخبار
بھی نہیں پڑھتے ————— اخبار۔ میں بس نوجوان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے میری پٹھ
تھکی اور کہا کہ دوست تمہیں نام ہی سے سمجھ لینا چاہیے کہ حاکمان جبر و قدر مقابلہ حاکمان
جزا و سزا سے بُرے لوگ ہیں۔ اور پھر اسی طرح بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔

شیکھر نے پوچھا۔ ”اس قید تہائی کے بعد شیکھر بے چارہ کہاں رہ گیا ڈاکٹر۔“
ڈاکٹر نے کہا۔ ہم سے زیادہ گنہگار ہو گا جو آج تک قید تہائی کاٹ رہا ہے۔“
زبیدہ نے فرمائشی قہقہہ مارا۔

ابو البشر اس سلسلے کو منقطع کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ قہقہوں کی گونج کے ختم
ہونے سے پہلے ہی اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”پھر کیا ہو ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔ پھر کیا ہوتا تھا۔ دوزخ ترقی کر گئی اور پھر آگ نکھل گئی۔

اُجلی پر چھائیاں
ابو البشر نے پوچھا۔ ”یہ تو ہوا تھا راحال چال ہم جنٹیوں کے متعلق تم نے کیا
ہیں کو اکب کچھ.....“
کیا دیکھا۔“

ڈاکٹر نے کہا ”جی یہ تو خواب ہے۔ اس طرح مسلسل ننھوڑی ہی دکھائی پڑتے
ہیں۔ تین روز تک پھر میں اس دنیا کی سیر ہی نہ کر سکا۔ چونکہ شبِ جنت کے حالات کا
علم ہوا جو تمہیں پھر کبھی سناؤں گا۔ لیکن تم وہاں بھی نہ تھے۔“
سب نے قہقہہ لگایا۔

زبیدہ نے کہا ”جی ابو البشر صاحب بہر حال مسٹر شیکھر سے تو برے نہ رہے جو
اب تک قیدِ تنہائی کاٹ رہے ہیں۔“
شیکھر نے کہا ”جی ہاں میں بُرا ہوں یا بھلا ہوں آپ کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ
ہی رہا ہوں۔“

شیکھر کی گردن میں اپنی باہیں حائل کرتے ہوئے ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔
ابو البشر کچھ اس طرح مسکرایا جیسے مسکراتے ہوئے ڈور رہا ہو۔ اس لیے کہ
زبیدہ کھسیانی ہنسی ہنسی رہی تھی۔

نیشست ختم ہوئی تو سبھوں نے جیب کا رخ کیا۔
تایا کیوں کے سینے کو چیرتی ہوئی جیب پتی شرک پر فرٹے بھر رہی تھی۔ کائیڈ
نے یکایک سیدھی جانب موڑنے کے لیے شیکھر سے کہا۔ شیکھر نے اسی اسپڈ میں
جیب موڑ لی تو زبیدہ اچھل کر کائیڈ کے کندھے سے جا لگی۔ سیدھی ہوئی تو بری
خشونت سے اس نے کہا کہ شیکھر صاحب جیب چلائیے تو اس کا بھی پاس رکھیے
کہ ایک لیڈی بھی اس میں سوار ہے۔

اُٹلی پر چھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

شیکھر نے قہقہہ مار کر کہا۔ جی ہاں جنگل کی ساری ہرنیاں سبھی اس کا خیال رکھیں گی کہ جو چپ ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے اس میں ایک شہری ہرنی بھی ہے جو ان کا شکار کرنے کے لیے ان کا تعاقب کر رہی ہے۔

چپ کھیتوں کی ناہموار زمین پر اچھلتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ گائیڈ کے ہاتھوں میں گھومتی ہوئی سرج لائٹ جنگل کی بے پناہ تاریکیوں کو ہر سمت سے جرح کر رہی تھی۔ پہیوں کے نیچے دب کر کھیتوں کی ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلے جیسے فریاد کر رہے تھے اور ان کی یہ فریاد صاف سنائی دے رہی تھی۔

زبیدہ نے چپ روکنے کے لیے کہا۔ تو شیکھر نے چپ روک لی۔ ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلوں نے چپ سادھ لی اور سنٹوں کو گدگدانے کے لیے صرف چپ کے انجن کی آواز اکیلی رہ گئی تو زبیدہ نے کہا۔

”شیکھر صاحب، مجھے شہری ہرنی کہنے کا آپ کو کس نے حق دے دیا۔“

شیکھر نے سبھی لمبے میں تھوڑی سی دشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”سُسن زبیدہ، یہ حق مجھے آپ ہی نے دیا ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے آپ ہی نے کہا تھا کہ ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورتوں کی مانند ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر نے مصالحت کرانے کے انداز سے قہقہہ لگایا۔

شیکھر نے پوچھا۔ ”اچھا تو یہ بتلائیے کہ آپ نے چپ روکیوں لی؟“

زبیدہ نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے گائیڈ کو نیچے اتر جانے کے لیے کہا۔ وہ اتر گیا۔ تو زبیدہ کبھیر کے برابر بیٹھ گئی اور گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ یہاں کون سے میں بیٹھے ہوئے مجھے ڈر لگا رہا ہے کہ کہیں اچھل کر نیچے نہ جا گروں۔ جب گائیڈ نے کونہ سنبھال لیا تو چپ پھر روانہ ہو گئی۔ گٹھا ٹوپ اندھیروں اور

اجلی پر چھاپائیاں

ہیں کوالب کچھ...

بے پناہ سناٹوں کو درہم برہم کرتی، جیب اس شان سے رواں دواں تھی جیسے سارے جنگل کی حکمران ہو۔ ایک کھیت کو پیچھے چھوڑ کر جب وہ چھوٹی سی حصار چھلانگ جاتی اور دوسرے کھیت میں دوڑنے لگتی تو سب لوگ اچھل اچھل کر پیچھے بھل جاتے۔ کٹائی چوں کہ ہو چکی تھی اس لیے سوکھے ٹٹھاپے اپنے اپنے نیزوں کی افی اپنے اپنے سروں پر رکھ کر جیسے اوپر سے آنے والی ہر مصیبت کے مقابلے کو تیار تھے لیکن جوں جوں جیب گزرتی جاتی وہ سرنگوں ہو جاتے اور جو جیب کی زد سے بچ جاتے وہ گویا اپنی جان کی خیر منگتے۔ فضا میں اڑتے ہوئے جگنو آسمان پر چلکے ہوئے تاروں کا جواب تو نہ تھے لیکن آسمان کی جانب دیکھنے کی فرصت کس کو تھی۔ جگنوؤں نے اندھیرے کی حکمرانی میں ننھی ننھی چنگاریاں اس طرح جلا رکھی تھیں جیسے موت کے مہیب سناٹوں میں زندگی کے آثار چمک دمک رہے ہوں۔ ستاروں کو دیکھ کر یہ احساس کہاں پیدا ہوتا ہے نرم مٹی کے خشک ڈھیلے چٹخ چٹخ کر اہٹتے اور سنگ ریزے اڑا کر کر جیب کو محصور کی ہوئی روشنیوں میں رقص کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارا سوا گت کر رہے ہوں۔ شیکھر نے ہیڈ لمپس کے علاوہ دونوں بازوؤں اور پیچھے کی لائٹ بھی جلا رکھی تھی۔ بے پناہ اندھیروں میں گویا اجالوں کا ایک چوٹا سا قافلہ دراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے چٹ رہے تھے، ہٹا رہے تھے، راستہ بنا رہے تھے۔ باتیں ہیں ختم ہو جاتی تو وہ جانور جو جیب سے دور تھے، دور ہی بیٹھے تاشہ کرتے لیکن گائیڈ کی سرچ لائٹ جنگل کے ہر ڈھکے چھپے ذی نفس خزانے کو اپنے حلقے میں جکڑ لیتی — بے شمار ستارے جیسے زمین پر یکایک چمک اٹھے۔ کبھی بالکل ساکت کبھی ہلکے۔ ابوالشتر خوشی سے اچھل پڑا۔ یارب تو باتہ لگ گیا کچھ — سب کے سب ان ٹٹھاتے

اُجلی پر جھائیاں
دلیوں کو تنگنے لگے جو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔
ہیں کو اکب کچھ...

ڈاکٹر نے زبیدہ کو پچھلی سیٹ سے گدگدایا۔ جو ان جھلملاتے ستاروں اور پتختے
ہوئے سناتوں کی دنیا سے دو کہیں اور ہی تھی اور شاید جیب کے اچھل جانے کی وجہ
سے ابھی ابھی شیکھر سے بالکل قریب ہو گئی تھی۔

زبیدی دیکھ رہی ہو۔ ان ٹمٹماتے دلیوں میں سے تانناک چراغوں کو چن چن کر
شیکھر کی بندوق چھونک دے گی اور تھکاری آنکھوں کے سامنے ہی ان جھلکی کی شہزادیوں
کا سہاگ لٹ جائے گا۔

لیکن زبیدہ نے ڈاکٹر سے کچھ نہ کہا۔ راستہ شیکھر سے مخاطب ہو گئی۔
مسٹر شیکھر۔ اگر میری خود آپ تک چل کر آئے اور آپ کے آگے کھڑی ہو کر استدعا
کرے کہ آپ اس کا سینہ اپنی گولیوں جھپٹنی کر دیجئے تب بھی آپ اس کو نہیں ماریں گے۔
شیکھر نے کہا میں بڑے چاؤ سے اس میری کو اپنی گود میں اٹھا لوں گا۔ اور
آہستہ آہستہ اس کے نر کی طشہ ٹریعوں گا۔ جو حسرت سے اپنی مادہ کو میری گود میں دیکھ
رہا ہو گا۔ جب میں نر کے بہت قریب پہنچ جاؤں گا تو اس کو اپنی گود سے اتار دوں گا
جب وہ دونوں انتہائی خوشی کے عالم میں چوڑیاں بھرنے لگیں گے تو میری بندوق
اٹھے گی اور نر کے سینے کو چھید دے گی۔ اور میں آپ کی زبان میں جھلکی کی شہزادی
کی حسرتوں کو دیکھا کروں گا۔

زبیدہ نے قریب قریب چیخ کر کہا تو میر تم ہی سب کچھ کر گزرو شیکھر۔
شیکھر مسکرایا۔ گائیڈ سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔ سرچ لائٹ داہنی
جانب گھماتے رہو۔

اصلی پر چھائیاں
 پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ یہی سب کچھ کر گزرتا لیکن اس
 بدبصیی کو کیا کروں کہ آپ جن کو ہرنیاں سمجھ رہی ہیں وہ چرواہے کا ریوڑ ہے جس میں
 بکریاں اور دُنبے اطمینان سے جگال کر رہے ہوں گے۔ ان کا رکھوالا کوئی چرواہا ضرور
 ان کے قریب ہی کہیں سو رہا ہو گا۔ آپ کو شاید انا تو معلوم ہی ہو گا کہ میں بکریوں یا
 دنبوں کا شکاری نہیں ہوں۔

لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کسی بھری ہوئی شیرنی کے شکاری بھی نہیں ہیں۔
 کوئی بھری ہوئی شیرنی یہاں ہوتی تو میری بندوق سب کچھ سمجھا دیتی لیکن
 کوئی مغزور نہ فی سیکر آگے آ کر یہ سمجھ لے کہ میں اسے شیرنی سمجھ لوں گا تو یہ غلط ہے۔
 اس لیے سبھی کہیں غلطی کر سبھی جاؤں تو میری بندوق مجھے ٹوک دیتی ہے۔

زبیدہ نے جل کر کہا۔ شکریہ جو آپ نے مغزور کتیا نہیں کہا۔
 شیکھر پھر مسکرایا۔ اس میں شکریے کی کیا بات تھی مسنر زبیدہ۔ میرا مخاطب
 کوئی آپ تو نہ تھیں۔ آپ اس طرح غلط فہمیوں کا شکار کیوں ہو جاتی ہیں۔
 ڈاکٹر نے چ میں مداخلت کی۔ شیکھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ کہتا
 رہی چاہتا تھا کہ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔

کانٹوں کی باڑھ کے متصل ایک خشک باولی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ گز کا فاصلہ
 رہ گیا تھا۔ اس بار شیکھر چوک جانا تو جیب اپنے سارے اجالوں اور زندگی کی حرارتوں
 کے ساتھ موت کی آغوش میں منہ چھپا لیتی۔ لیکن شیکھر جیب سے کھلونے کی طرح
 کھینچتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اپنی ہر پسندیدہ شے سے کھلونے کی طرح کھیلنے کا عادی
 ہو گیا تھا۔ اس کو شکار کرتا ہوا دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ خود زندگی سے کھیل رہا ہے۔

اُجلی پر چٹائیاں
جیب سے بچے بڑی اور بچہ تیزی سے آگے بڑھی۔ بالکل اس طرح جیسے خالی جوتے کے
ڈبے کو ڈوری باندھ کر شیکھر کا ننھا بے محابہ دوڑنا چلا جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس
کے پیچھے پیچھے جوتے کا ڈبہ جو اس کی دانست میں اس کے آگے جیب کا رہے گیند کی طرح
لڑھک رہا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیب بھی جوتے کے ڈبے کی طرح
لڑھک لڑھک کر سیدھی ہوتی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس لیے کہ شیکھر کا ننھا
نہیں خود شیکھر جیب چلا رہا تھا۔

سرچ لائٹ فلموں کے سینے میں بھالان کر پیوست ہو گئی تھی۔ تاریکیاں قدم
قدم پر پھر ورج ہو رہی تھیں۔ گائیڈ سرچ لائٹ آف کر دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اندھیرے
اُجالوں پر اندر نا امیدیاں امیدوں پر فتح پارہی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے سرچ لائٹ سے
ہرمت اجالے چینک کر گائیڈ پورے جھگل کو اپنی گرفت میں لے لیتا کبھی کوئی خرگوش ایک
جھاڑی سے نکل کر بے تحاشہ بھاگتا اور دوسری جھاڑی میں دیک جاتا کبھی اُجالوں کی
محبت میں رک کر روشنی کے ہالے میں اطمینان سے ناچنے لگتا اور جیب اس کے پاس
ہی سے گزر جاتی۔ کبھی کہیں آنکھیں جھک اٹھتیں تو گائیڈ فوراً فوکس ملا کر ان
چمکتی ہوئی آنکھوں کو روشنی کے احاطے میں محصور کر لیتا تب پتہ چلتا کہ کوئی بیل اطمینان
سے بیٹھا ہوا جگمگا کر رہا ہے یا کوئی گولا چند ہیاتی ہوئی آنکھوں سے ہر اس
ہے۔ آس پاس دخول پر بھیجے ہوئے پسند ذرا کی ذرا پر پھر پڑتے اور جیب
کے گذرتے ہی پھر اسی درخت پر بیٹھ رہتے۔

ڈاکٹر نے شیکھر کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کر کے
کہا کہ ڈیر جب زنی اس قدر مصر ہے تو گراہی لو ایک آؤدھ ہرنی بھی۔ ایک ہرنی کی
جان کی جینٹ لے کر تم دونوں کی ان بن ختم ہو جاتی ہے تو کیا برا ہے

ابلی پر چچائیاں
ہیں کو اکب کچھ۔
ابو البشر نے جو رادھیے سہروں میں انگلٹا نا شروع کر دیا تنچاپ ہو رہا۔

شیکھر نے ڈاکٹر کی بات سنی ان سنی کر دی۔ جیپ کو ڈاک بنگلے کی سمت موڑتے
ہوئے اس نے کہا کچھ رات گئے پھر آنا چاہیے ڈاکٹر۔ اس وقت تو کچھ ملنے کا امکان نہیں ہے۔
ڈاکٹر اور ابو البشر نے حامی بھری اور سیک آواز کہا کہ انھیں شدید جھوک بھی لگ رہی۔
ڈاکٹر نے ابھی ایک نوالہ بھی نہیں اٹھایا تھا کہ شیکھر نے روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے
منہ میں رکھتے ہوئے کہا: ”نہ معلوم تم کب مجھے قید تنہائی سے چھڑاؤ اور میں کب وزخ
کی تیندیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔“

ابلی بار زبیدہ نے زیادہ دلچسپی لی۔ اجیت کا حال سنانے کا تقاضہ
کرتے ہوئے اس قدر پیار سے اس نے ڈاکٹر کو دیکھا کہ ڈاکٹر نے اٹھایا ہوا نوالہ
پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

ابو البشر اب کہاں چوکنے والا تھا۔ مرغ کی ٹانگ کو جھٹاپنے دانٹوں سے
نوج کر اس نے کہا کہ ڈاکٹر تم ڈاکٹر نہ بھی ہوتے تو داستان گوئی میں مختار کوئی جواب نہ تھا
گویا یوں بھی زبیدہ تمھارے ساتھ سودا کر کے کچھ گھٹائے میں نہ رہتیں۔

شیکھر نے شہ دی۔ لیجیے مسنر زبیدہ۔ آپ کی ازدواجی زندگی کو آپ کے پسندیدہ
ابو البشر صاحب کا روبرو باری زندگی سمجھتے ہیں۔

زبیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ جی نہیں وہ تو صرف مذاق کر رہے تھے۔ اب آپ
اپنی دالت میں جو چاہیں تمھیں جو چاہیں معنی پہنائیں رنگ دیں۔

ڈاکٹر نے نوالہ منہ میں رکھ لیا اور زبیدہ کے بیچ میں کود پڑا۔
ہاں تو بھی ایک دن۔۔۔ لیکن ایک خیال بھلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں

اجلی پرچھائیاں
 امگر نکل گیا کہ آئندہ کسی پکنک میں شیکھر اور زبیدہ کا ساتھ کچھ مناسب نہیں ہے۔ زبیدہ
 جانے کیوں اس قدر زیادتی کرتی ہے لیکن شیکھر بے چارہ مجھ سے دوستی کا حق ادا کرتا
 ہے اور اس کی ہر بات کو انگیز کر جاتا ہے۔

سب اسی طے ردیکھ رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔

ایک دن تم۔

ہاں تو ایک دن میں فلم کمپنی کی بڑی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ جو اسی گتے دار
 کی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھی جس سے میں شیکھر دوزخ میں داخل ہوتے ہی ملے تھے
 اور جو صاحب کا چھینٹا ٹھنڈا بالٹی بڑی خوبصورت اور فنکاری کا نمونہ تھی۔ میں بالٹی ہی کو تنک
 رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبایا میں نے پلٹ کر دیکھا تو پرشاد کھڑا تھا میں اس
 سے پلٹ گیا۔ مجھے زبئی سے اپنے عشق کی پوری داستان یاد آ گئی۔

زبئی نے بیچ میں ٹوکا۔ ڈاکٹر صاحب۔ اب یہ عشق کی داستان داستان
 رہنے دیجیے۔

شیکھر نے لقمہ دیا۔ کیوں زبیدہ صاحبہ کیا ہر جے ہے۔ لگے ہاتھوں ہم یہ
 بھی جو سن لیں۔

زبیدہ نے تیز لگا ہوں شیکھر کو دیکھا۔

ڈاکٹر نے پانی مانگا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ اور پھر کہنے لگا۔

جانتے ہو شیکھر یہ پرشاد کون تھا۔ یہ وہی پوسٹ میں تھا جو ہسٹل میں زبئی کے

خطوط مجھ تک پہنچا یا کرتا تھا مجھ سے انعام و اکرام کے علاوہ بے شمار دعائیں بھی لیتا۔

ابلی پر چھائیاں
میرادل بھڑ آیا۔ میں نے اس سے رو ہانسہ ہو کر کہا۔ پر شا وحسب
بنی کو تم نے مجھ سے ملایا (پر شا وزنی کو بنی ہی کہا کرتا تھا) موت کے ظالم ہاتھوں نے اس
بنی کو مجھ سے چھین لیا۔ پر شا پر میری باتوں کا کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ وہ بالکل اسی
طرح مسکراتا رہا جس طرح ہاسٹل میں میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اور
اس کی یہی مسکراہٹ میری ہمت بندھاتی تھی۔

مجھے کچھ گمان گذرا۔ میں نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سچ بتاؤ پر شا۔

اور اس نے بندھے کھول دی۔

ہائیں زنی کا خط۔ میں نے اچھل کر اپنی باہیں پر شا کی گردن میں حائل کر دیا۔
کیا تم یہاں بھی یہ خدمت انجام دیتے رہو گے۔ تم کہاں ہو، زنی کہاں ہے۔ تم اس سے
کس طرح مل سکے۔

پر شا د کے لب اور آنکھیں دونوں اپنے پرانے ڈھب سے مسکرا رہے تھے۔ اس
نے میرے کان پر منہ رکھ کر کہا۔

بنی جنت میں ہیں۔ میں بھی جنت ہی میں ہوں۔ چار بار تم سے ملنے کی کوشش
کی لیکن دوزخ میں داخل نہ ہو سکا۔ وہ جو پہرے پر فرشتہ ہے نا۔ بڑا کائیاں ہے۔ آج
کچھ تخی آم اسے جھینٹ کر آیا ہوں۔ ادھر جنت میں آم صبی نعمت نہیں ہے۔ نادیدہ ہے
بے چارہ۔ بس فوراً کھانا شروع کر دیا۔ وہ تو مجھے نظر نہیں آیا۔ البتہ میں نے دیکھا کہ آم کا
رس دودھاروں میں نیچے ٹپک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ہاتھوں پر سے
چھیل کر کہنی تک پہنچ رہا ہو گا۔ بہر حال صاحبزادے مصروف ہو گئے تو میں کھسک آیا ہوں

اُجلی پر چھایاں
ایسے چھوڑ پور پھرہ دار بہت دیکھے ہیں — ریڈیٹنٹ صاحب کی میم کو سات پہروں سے
گزر کر فوجی کرنل کے خطوط پہنچانے والا پرشاد ہار مانے والا نہیں۔
پیرشاد جانے اور کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میں نے زبی کا خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔
زبی نے لکھا تھا۔

پیارے بہت پیارے — (مقام کا نام بہشت بریں لکھا تھا اور
تاریخ کی جگہ خالی تھی)

تم نہیں تو جنت بھی مجھ کو اک جہنم ہے
جب سے یہاں آئی ہوں سب کچھ حاصل ہے لیکن اداسیاں ہیں کہ چھپا ہی نہیں
چھوڑتیں۔ تم تک اپنا نام نہ محبت پہنچانے کے لیے کیا کیا کوشش کی ہیں لیکن ایک نہ چلی۔
وہ تو خبر گذری جو پرشاد سے یہاں ملاقات ہو گئی — ٹھہرو دودھ کا پیالہ میرے
منہ سے آگیا ہے۔ مجھے بالکل رغبت نہیں ہے۔ میں انکار تو کر دوں۔ یہاں یہی مصیبت
ہے بس تصور کیا اور چیز آکر منہ سے لگ گئی۔ درآںحالیکہ میں تم کو صرف یہاں کے حالات
سنانا چاہتی ہوں۔ دودھ یہاں چونکہ بہت وافر ہے اس لیے مجھے لکھنے لکھتے اس کا
خیال آگیا تھا اور وہ منہ سے آگیا۔ ہاں تو میں لکھ رہی تھی کہ پرشاد کو جب میں نے دیکھا
تو مجھے یقین نہ آیا کہ پرشاد اور جنت میں لیکن اس کی خاص مسکراہٹ نے جو یک وقت
ہونٹوں اور آنکھوں دونوں سے پھوٹتی ہے۔ بڑھ کر مجھے گدگدایا اور میں اس سے پلٹ
گئی۔ میری پلکیں جھپک گئیں تو اس نے پچکار کر کہا کہ بیٹا یہاں بھی تو اسی طرح حیران اور
بے چین ہے — پرشاد بہت معاملہ فہم ہے وہ سب کچھ سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ بڑا نیک
لڑکا تھا صرف شراب نے اس کو تجھ سے جدا کر دیا ہو گا، ورنہ وہ بھی میں سے تیرے ساتھ

اٹلی پر چھائیاں
 رہتا میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا پرشاد میری چٹھی ان تک پہنچا دو نا۔ پرشاد ایک دم بول کھلا گیا۔
 کہنے لگا بیٹا دیوانی ہو گئی ہو۔ دوزخ کی آگ کو سہہ لینے کی مجھ بڈھے میں کہاں سے
 قوت آجائے گی۔ میں نے ہنس کر کہا کہ پرشاد کا کاظم کس قدر بھولے ہو۔ تمہیں
 یہ سچی نہیں معلوم کہ جنت کا کوئی باشندہ دوزخ میں جا سکے تو آگ اس کے لیے گلزار بن
 جاتی ہے۔ راہ کے کانٹے پھول بن کر نکلتے ہیں۔ دوزخ کی آگ میں اتنی مدت ہی
 نہیں ہوتی کہ کسی مبتلی کو جھسم کر سکے اور پھر تمہیں معلوم نہیں دوزخ میں تو ایک ہنگامہ
 ہے۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں میں آج کل دوزخ ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں
 آج یہی سب سے اہم موضوع ہے جس کی نسبت بڑے بڑے دماغ حیران و ششدر
 ہیں۔ کیوں کہ اہل دوزخ نے سنا ہے کہ سخت ہو کر اس بات کا تہیہ کیا ہے کہ اپنی دوزخ کو
 جنت سے بڑھ کر کچھ بنادیں گے۔ پرشاد نے توبہ کی اور ہاتھ بڑھا کر میرے منہ پر رکھ
 دیا۔ کہنے لگا کہ میاں تم یہاں سبھی اوٹ پٹا لگ بکے جاتی ہو لیکن اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ
 دوزخ کی آگ اس کا کچھ نہیں بھڑک سکتی تو وہ راضی ہو گیا۔

لیکن ڈیر و اقمی تم لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ ہمارے یہاں بڑی بڑی برگریڈ
 ہستیاں تم لوگوں کی کاروائیوں سے متفکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ دوزخ کو بالکل دنیا ہی کے سانچے
 میں ڈھال رہے ہو۔ بعض وقت یہاں بھی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں تو ہماری عبادتوں
 میں خلل پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب گانے کی اور راکٹ کی آوازیں آتی ہیں تو بس یقین مانو
 میرے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی ہے اور میں خود کو سنبھال لیتی ہوں۔
 پہلے تمہیں جنت سے کچھ مفارقات کرا لوں تو پھر تمہیں لکھوں کہ تم لوگوں کی دوزخ نے
 ہم اہل ارم کو کس طرح پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن وعدہ کر دے کہ تم کسی کو نہ بتاؤ گے۔

اجلی پر چھائیاں

ہیں کو اکب کچھ...

جنت ایک بہت سہانا باغ ہے۔ دودھ کی نہریں اور کھجور کے درخت یہاں بہت ہیں اور یہی یہاں کے باشندوں کی عام غذا ہے۔ دودھ کی نہر سے بالکل متوازی شہد کی نہر بہتی ہے۔ چاندنی میں یہ سماں دیکھنے سے غفلت رکھتا ہے۔ سفیدی اور سرخی کی متوازی لکیریں چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پھلوں میں زیادہ تر میں تو انگوڑی استعمال کرتی ہوں۔ کھجور کو دیکھنے سے ہی میری طبیعت مکر رہ جاتی ہے بلکہ یوں کہو تو غضب ہو جاتی ہے۔ دودھ اور شہد کی نہروں سے بھی مجھے صرف نظارہ کر لینے کی حد تک لگاؤ ہے۔ ورنہ سچ چھو تو شہد اور دودھ سے طبیعت اوب گئی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی پینے کی چیزیں ہیں تو پانی زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ چلتے چلتے ایک بات یاد آگئی لیکن ڈریس اپنے ہی سینے میں دفن کر لینا ورنہ سمجھ لو کہ متحاری زہنی — بے دریغ مصائب و آلام میں مبتلا کر دی جائے گی کیوں کہ جنت کی سیاست کو یکک کرنے والے کے لیے کڑی سزائیں ہیں۔ فراس کی — جون آت آرک اور روس کی زیادہ دونوں یہ ہیں۔ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ ایک سکند پانچ نہیں بھٹکتی پتہ نہیں کہ ان دونوں نے پانی کی نہر کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا بنا کر انگوڑے کے کئی خوشے اس میں ڈال دیئے۔ پریموں انھوں نے ایک جوڑ کو اس گڑھے کا پانی پلا دیا۔ انگوڑے سڑک شاید پانی میں اپنے خواص منتقل کر چکے تھے۔ بی حورس اس طرح ناچنے ٹھکے اور سمانے لگیں کہ یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کا بھی انھیں کچھ پاس و لحاظ نہ رہا۔ جو صاحبہ کی تعیناتی تو خیر جنت سے برخاست کر دی گئی جس کا مجھے رنج نہیں لیکن اب ان دونوں لڑکیوں کو آپس میں ملنے جلنے سے باز رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں اداس اداس سی رہتی ہیں۔ سنا جا رہا ہے کہ یہاں کے انگوڑوں سے وہ خصوصیات ہی جینی جارہی جو ان کے سڑ جانے سے ان میں پیدا ہو جاتی ہیں (معاف کرنا تمہیں اپنی اولڈ اسمگلر یاد آ رہی ہو گی اور منہ میں پانی آ رہا ہو گا) ہاں تو

اجلی برچائیاں
سنا تب کبھی یہ انگور سٹہ بھی جائیں تو ہرے ہرے پھول بن کر کھلیں گے۔
ہیں کو اکب کچھ ...

یہاں ہر کھجور کے درخت کی چوٹی سے ایک یا سو اگڑے کے فاصلے پر ایک ہلال ہوتا ہے
اور ہر ہلال کے پیٹ میں ایک پشت پہلو جگہ کا تارا۔ پتہ نہیں اس منظر کو دیکھتی ہوں تو مجھے
عرب قوم کے (DOMINATION) کا تصور کیوں آتا ہے اور خود میں نظر بھی تو اپنی جگہ کوئی
دل کش نہیں۔ ویسے یہاں تاریکی یا اندھیرا بہر حال سیاہی کے قبیل کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ گھنے
سے گھنے درخت کے نیچے سائے نہیں ہوتے۔ اجالے ہی اجالے جنت کی خصوصیت ہے۔ یہاں
سایلوں، تاریکیوں اور سیاہیوں سے گناہ کا تصور وابستہ ہے اس لیے ہم گھنے سایلوں کی ٹھنڈک
سے محروم ہو گئے ہیں۔ تم کسی خوبصورت سے خوبصورت باغ کا تصور کرو اور اس باغ کے
گھنے پتروں سے اس کے ٹھنڈے سایوں کو حسین لو، باغ میں کیا رہ جائے گا، ویسے باغ اہم
مکمل طور پر اپریئل ٹرینڈ ہے۔ حوریں ایک سے ایک حسین ہیں۔ تم یہاں آ جاؤ تو بس دیوانے
ہو جاؤ۔ لیکن یہ ٹبری ٹی کے مادہ جیسی ہیں۔ بس خوبصورت سی تتلیاں۔ ہر قسم کے جذبات
سے عاری مگر اس کے باوجود تم یہاں آ جاؤ تو شاید دیوانے ہو جاؤ۔ چچا غالب نے فرمایا تھا کہ
جس جنت میں سو برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کو وہ گوارہ نہیں کریں گے لیکن یہاں
چلتے پھرتے حوروں کو چھیڑتے ہیں ایک کو دوسری سے لڑاتے ہیں اور خوشنودار پان کھا کر
اپنی رنگین باجیس پھیلا کر سکر اتے ہیں۔

میں بیس ہک لکھ پانی تھی کہ ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا ہے۔ لوگ دودھ کی ہنر پر
جمع ہو رہے ہیں ذرا پس دیکھ آؤں کہ کیا قصہ ہے۔

لوبی میں ابھی ابھی دودھ کی نہر سے آکر تھیں پھر لکھ رہی ہوں۔ ذرا اپنے
منہ دوزخیوں کو سمجھاؤ نا۔ یہ کوئی شرافت ہے بھلا کسی نے اٹلی کا پھول چکے سے نہ نہیں

اُجلی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...
چھبیک دیا ہے۔ نہر مغبر کی جانب دوزخ سے لگی بہتی ہے۔ یہ سارگنداری غالباً اُسی مقام
سے لگی ہوئی ہے ورنہ جنت میں کسی دوزخی کے داخل ہونے کی کیا مجال۔ سارا دودھ پھٹ کر
دہی بن گیا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کیوں کر دودھ ان کی مرغوب غذا ہے۔ اہل ارم دودھ کی
خصوصیات میں تبدیلی کی نسبت سوچ رہے ہیں۔ صرف ایک تنہا رپر شاد خوش ہے کہ
اس کو چھچھا چھ طے لگی جس کو وہ زمانے سے بھولا ہوا تھا۔

جنت کے پھلوں میں افسوس ہے کہ آم ہی نہیں ہیں۔ اہل جنت کی اکثریت آم
جیسے پھل کی کمی کو بے طرح محسوس کرتی ہے۔ اسلیم یہ ہے کہ آم کسی کسی طرح فراہم کر کے شہد
کی ہنر میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ شہد میں آم بیسوں تک محفوظ رہتے ہیں میں
خوش ہوں کہ چلو شہد کی ہنر کا یہ صرف تو غنیمت ہوگا۔ چنانچہ بمشکل قدرت نے چند آم فراہم
کیے ہیں جو شہد کی ہنر میں محفوظ ہیں۔ چچا غالب تو آستین چڑھا کر جب دیکھو شہد کی ہنر میں آم
ٹٹوٹے پستے تھے ہیں۔ پرسوں مرزا شیفقہ کے حصے میں جو دو آم آئے تھے وہ انہوں نے چھپ کر
چٹ کر دیئے۔

لوحی میں اس بد تمیزی سے تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے پھر چیخ رہا ہے۔ یہ ”غلمان“ بھی
عجیب الخلق حیوان ہیں۔ مجھے سخت ناپسند ہیں۔ آداب و تمیز سے جیسے واقف ہی نہیں۔
عورتوں سے برتاؤ کرنے کے ڈھنگ سے قطعی نابلد، محنت جتانے کے آداب سے بڑے ناواقف
میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں اور حضرت گدگد رہے ہیں۔ میسے رنڈ سے منہ بھڑا رہے ہیں
میں سوچ رہی ہوں کہ مشرقی عورتوں کی ایک یونین بنا کر ان کے خلاف مشترکہ احتجاج کروں
اور اس مسئلے کو اٹھاؤں کہ جب تک ہمارے رضامندی شامل نہ ہو میں نہ چھڑیں۔

شیکسپیر فرمائشی تمہقہ لکایا۔ ابوالبشر یانی پی رہا تھا۔ ضبط نہ کر سکا۔ کھل کھلا کر

اصلی پرچائیاں
ہنس پڑا تو پانی پھکاری کی طرح اس کے منہ سے نکل کر سامنے زحری ہونی پلٹ اور چھوٹ
پر جاگرا۔ اس نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے معافی مانگی۔

زبیدہ بھی ہنسی نہ روک سکی لیکن بہت جلد ہنسی پر قابو پا کر اس نے ڈاکٹر کو ڈانٹا
تھیں میرے تعلق سے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

ڈاکٹر نے ابو البشر کو آنکھ ماری اور زبیدہ کو چھڑنے کے لیے کہا کہ زبیدی تمہیں تو
”غلطان“ کی یہ ناشائستہ حرکتیں ناپسنہ ہیں۔ تم نے کبھی اس کو منہ نہیں لگایا۔ پھر تمہیں شرم
کی کیا ضرورت ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا — ڈاکٹر زبیدہ سوچ رہی ہیں تمہیں کہیں ان پر
شبہ تو نہیں ہے کہ انہوں نے غلمان “ میں کبھی دلچسپی لی ہوگی۔

قبیلوں کے درمیان زبیدہ کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سٹیر شیکھر آپ
اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔

قیقہ ختم ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر نے زبیدہ کو کچھ کہنے کا موقع دیتے بغیر پھر
کہنا شروع کیا۔

لیجے میری ترش روئی کام آئی یہ حضرت کہیں کھسک گئے ہیں۔
اچھا دیر۔ تم مجھے اس خط کا جواب دینا تو دوزخ کے تفصیلی حالات مجھے لکھنا تھیں
شاید معلوم نہیں کہ تم دوزخیوں نے یہاں کی بڑی بڑی ہستیوں کی نیند اڑا رکھی ہے تمہیں
کچھ پتہ بھی ہے کہ دوزخ کے صحیح حالات دریافت کرنے کے لیے اب تک پانچ اشخاص جن
پر یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کو بڑا اعتماد تھا، تمہاری دوزخ کو بھجوائے گئے۔ لیکن آج تک
کوئی واپس نہ آیا۔ یہاں سب حیران ہیں کہ تم لوگوں نے دوزخ کو ایسا کیا بنا دیا ہے کہ

اجلی پرچھائیاں
جنت جیسی جگہ کے باشندے جلتے ہیں تو واپس نہیں آتے۔ میں کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں
کہ اہم کا حکمران طبقہ دوزخ کی ترقی سے صرف اس لیے غافل ہے کہ جنت کی اہمیت
ہی نہیں رہ جاتی اور دنیا والوں کو اگر اس بات کا علم ہو جائے تو بے شمار منچلے دوزخ کی قصیدہ
خوانی ہی کو اپنا شعار بنالیں گے۔ ویسے بھی باوجود جنت کی برتری کے دنیا میں بڑے بڑے
اہل فن نے اس کا مذاق ہی اڑا لیا ہے۔ حالی جو اتنا سب کچھ لکھ گئے۔ اب ان سے یہاں ہم
لوگ پوچھتے ہیں تو سر سے انکار ہی کرتے پھرتے ہیں کہ یہ شعر ان کا ہے ہی نہیں سہ

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جننی، جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

وہ صاف مکر گئے، کہنے لگے استغفر اللہ۔ شعر اور حالی کا۔ اور خود اپنا شعر سنایا سہ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خُلد میں
بستر اکیوں اپنا پھینکو اتنے ہیں آپ

ہم نے کہا اس شعر میں بھی تو طنز ہے۔ حالی بڑے ہو گئے کہنے لگے مجھے پڑھنے والوں
نے پتہ نہیں دُنیا میں کس کس طرح تباہ کیا۔ اس شعر میں طنز و مزہ کچھ نہیں ہے۔ شعر بید حساس
ہے۔ مفہوم واضح ہے۔ حالی واعظ کی برگزیدہ شخصیت سے واقف ہے۔ اس کو چھیڑنے کا خیال
اس کے ذہن میں آیا ہے جو شیطان کا کرشمہ ہے۔ لیکن حالی کہاں شیطان کی پکڑ میں آنے والا
وہ فوراً توبہ کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ واعظ کو چھیڑنے سے جنت میں جو ایک بستر حالی کے لیے
محفوظ ہے وہ واعظ پھینکو ا دیں گے۔ اس لیے وہ واعظ کو نہیں چھیڑتا۔ ظاہر ہے کہ حالی
نے اس شعر میں واعظ کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور جنت سے بے پناہ محبت کا اظہار
بھی کیا ہے کہ کہیں جنت سے بستر اہ چھینک دیا جائے۔ جہاں حالی بعد ازاں رہنا چاہتا ہے۔

اُجلی پرچھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو میں نے موقع کو غنیمت جان کر پوچھا۔ مولانا آپ یہ کیا مفہوم بیان کر رہے تھے۔ بہت رازدارانہ انداز میں انہوں نے جواب دیا۔ یہی مصلحت تھی تو کوئی چیز ہے؟ اور پھر لہجہ کوئی محفوظ رکھتا ہے تو بس ایک ہی جگہ جو اسٹیل کھدائی ہے۔ سو میں نے جنت کی اب کوئی تعریف کر دی۔ یہی ناکہ اس کو ہاسٹیل کہہ دیا ہے۔ اب کیا تم اس کو بھی تعریف ہی سمجھو گی۔ میں بے اختیار منہس پڑی اور وہ مسکرا کر تیرنے کے لیے چلے گئے دُنیا میں انہیں نیز نا نہیں آتا تھا وہ انتقاماً یہاں زیادہ تیرتے ہیں۔ ۵

شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی اہل ارم خاص طور پر یہاں کی بزرگزیہ ہستیاں دوزخ کی ہنگامہ آرائی پر بہت متفکر ہیں۔ پہلے جن مولانا کو دوزخ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ حالی کے وہی واعظ ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا۔ لیکن یہ حضرت آج تک نہیں لوٹے اس کے بعد ہندو قوم کی ایک بہت بزرگ ہستی نے اپنے اعتماد کی ایک ایسی شخصیت کو اس کام کے لیے مقرر کیا جس کی نسبت ان کو ناز تھا کہ یہ شخص اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کر سکا۔ ان صاحب کو ”نارو منی“ کہتے ہیں۔ گہروں میں اٹھنا پلٹنا یہ شخص ایک ستارے کے برابر ہی اعتماد سے یہاں سے روانہ ہوا۔ اس کے بعد پتہ ہے بے چارے کا حشر کیا ہوا؟ وہی جو ہونا تھا۔ کئی دن انتظار کرنے کے بعد جب یہاں سے مایوس ہو گئے تو اس بزرگزیہ ہستی نے جس نارو منی کو اس کام پر تعین کیا تھا بہت دکھی ہو گئی۔ دوسری مخترم ہستیوں نے انہیں تسلی دی۔ انہوں نے آخری کوشش کر دی تھی اور ایک میل کے درخت کے نیچے اکڑوں بیٹھ کر آنکھیں بند کیں اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ، بیس منٹ، پچیس منٹ آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن اس علم کے زور پر بھی ”نارو منی“

آجی پر چھایاں

ہیں کو اکب کچھ

واپس نہ آیا۔ وقت کے ساتھ ان کا فتنہ بھی بڑھنا گیا اور وہ یہ آواز بلند جمجم جمجم کر پڑھنے لگے۔ اب ایک گھنٹہ پورا ہونے ہی کو تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ ”ماروئی“ نے جو ستار سوتھن سے اپنے ساتھ رکھا تھا وہ ہوا میں تیزی سے اڑتا ہوا آ کر ان کے قدموں میں گر پڑا وہ انتہائی غصہ کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ماروئی موہ اور مایا کے جال میں پھنس گیا ہے۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو ”ماروئی“ کا دل بھی میری طرف راغب ہوا جب رغبت زیادہ ہوئی تو اس نے ستار چھڑ کر گیان شروع کیا لیکن جب میں نے اسے واپس بلا لیا چاہا اور علم کے زور پر دوزخ سے اٹھا کر معلق کر دیا تا کہ یہاں اس کو کچھ لوں، تو گنخت نے ستار ہی ہوا میں اچھال دیا تا کہ گیان دھیان کی کیفیت ہی ختم ہو جائے۔ وہ تو فوڈ وہیں گر پڑا اور یہ ستار یہاں اڑ آیا۔ انھوں نے غیظ میں ستار کو ایک ٹھوکہ لگا فی جس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن ہزار سے بڑے ٹکین نغمے پھوٹ رہے تھے۔

میں یہیں تک پڑھ سکا تھا کہ مجھے پرشاد کا خیال آیا۔ کہیں حضرت بھی یہیں کے ہو رہے تو اپنی رتی کے محبت جوئے خط کا جواب اس کے توسط سے بھیج سکوں گا میں نے پلٹ کر دیکھا پرشاد غائب تھا۔ اس پاس کے ساتھیوں سے پوچھا۔ کہنے لگے جب تم خط پڑھ رہے تھے تو وہ بڑھابھت خوش خوش اچھلا کودتا اس سمت جا رہا تھا۔ بار بار ایک ایک سے کہہ رہا تھا بچے چکر نہ دو۔ یہ دوزخ نہیں ہے یہی تو دنیا ہے۔

میرے پر کے پیچھے سے دوزخ نکل گئی میں چلتا یا پرشاد۔ پرشاد۔ دیوانوں کی طرح میں نے ہر طائر جھاگ جھاگ کر اس کو دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہ تھا میں پھیسے ٹھوں کی پوری قوت سے چلتا یا پرشاد چھ پر اور میری رتی پر دم کرو۔ گہرا ہٹ میں میری آنکھ کھل گئی۔ واقعی میں میرے پر کے پیچھے سے دوزخ نکل گئی تھی۔

اجلی پر چھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

ابو البشر کہنے لگا کہ ڈاکٹر بے چارے کبیر کی تھیں چھ کچھ خبری نہیں ملی۔
ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ یہ نہیں کتنی ہر نیوں کا خون ناقص اس کی گرو
پر ہے جو آج تک قید تہائی کاٹ رہا ہے۔

زبیدہ نے مداخلت کی۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر، تمہارے شیکھر صاحب کو تو وہی بات
پر زائے کر ان کی بندوق نے کبھی کسی ہر نی کے سینے کو زخمی نہیں کیا۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مسکرا کر دیکھا۔ ڈاکٹر زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔
زبی وہ بندوق سے نہیں، اپنی آنکھوں سے بھی بے شمار شہری غزالوں کو شکار
کر چکا ہے۔ یہ اس کا ہنر ہے۔ اس کا فن ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو بہت گھور کر دیکھا۔ ڈاکٹر تجھ گیا کہ اس نے بے وقوف غلط بات کہہ دی ہے۔
ابو البشر نے پہل کی۔ اس کے اٹھتے ہی یکے بعد دیگرے تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

مین خالی ہو گئی۔ چراسی نے بڑھ کو ٹپس سینٹا شروع کیں۔
لان پر اب بھی کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ابو البشر نے یہاں بھی پہل کی۔ ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے پائپ جلا لیا
شیکھر نے چھالیہ کا ایک ٹکڑا اور لاپچی منہ میں ڈال لی اور گھلانے لگا۔

ڈاکٹر نے سگریٹ پیش کیا تو زبیدہ نے کہا کیوں ویسٹ کرتے ہو۔

لیکن شیکھر نے یہ کہتے ہوئے سگریٹ لے لی کہ سنہ زبیدہ کبھی تو میں شوق کر ہی لیتا ہوں۔
زبیدہ نے لائٹر سے اپنا سگریٹ جلا لیا اور جلتا ہوا لائٹر ہوا میں یہ کہتے ہوئے اچھا

دیا کہ اب فرشتے کی باری ہے۔

ایک قہقہہ پڑا۔ اور سب لائٹر پر چھپے

ابھی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...
شیکھر نے اچھل کر لائٹر کو کھینچ لیا جو ابھی جل رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی جل گئی لیکن اس
نے کسی کو محسوس ہونے نہ دیا۔ اپنا سگریٹ جلا چکا تو لائٹر کو گل کر کے اس نے اپنا کھلا
ہاتھ ڈاکٹر کے آگے بڑھا دیا۔

ہتھیلی پر داغ دیکھ کر ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔ ارے فرشتے بننے کی خواہش میں یہ کیا کر لیا
شیکھر نے مسکرا کر کہا۔ اس کے باوجود بھی زبیدہ کو میرے فرشتہ ہونے پر شبہ ہے ڈاکٹر۔
ابوالبشر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ شیکھر، زبیدہ تمہیں نہ صرف فرشتہ سمجھتی ہیں بلکہ وہی عالی ظرف
فرشتہ سمجھتی ہیں جو ایک معمولی سے پاپ کی خاطر انجین کے ساتھ خون معاف کر دیتا ہے۔
تینوں ہنسنے رہے۔ زبیدہ جس کے متعلق ابوالبشر نے سوچا تھا کہ بہت خوش ہو گی صرف
مسکرا کر رہ گئی۔

شیکھر نے عالی ظرف کے لفظ کو دہرایا اور ابوالبشر کو پھر داد دی۔
مقبوضہ مسلسل اسی ٹوٹا بھی نہ تھا کہ زبیدہ نے جاہیاں لینا شروع کر دیں۔ شیکھر نے ڈاکٹر
سے کہا۔ جناب ڈاکٹر صاحب گھل ہو چکا ہے۔ ”بوریا بستر سمیٹے“
ڈاکٹر نے دیکھا، زبیدہ واقعی جاہیاں لے رہی تھی۔
کیا اب شکار کو نہیں چلو گی زبئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔
زبیدہ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس نے پھر ایک جاہی لی اور مسکرا کر رہ گئی۔

جب ابوالبشر نے اصرار کیا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ لشر صاحب آپ کا اصرار ہے
تو میں ضرور چلتی ہوں لیکن نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ سر میں کچھ دھمک سی ہے
آپ معاف ہی کر دیں تو بہتر ہو گا۔

ابوالبشر کچھ کہنے والا تھا کہ زبیدہ نے شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ مسٹر شیکھر! آتھ

اہلی پرچائیاں
مجھ مل گیا ہے ہاتھ کی تکلیف سے زندگی میں پہلی بار کہیں ان کا نشانہ خطانہ ہو جائے۔

شیکم نے کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر اور زبیدہ بھی ذرا لالان پر بیٹھ رہے۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر زبیدہ نے سگریٹ پھینک دیا تو ابوالبشر نے کہا: شیکم ہوتا تو پھر ایک بار اپنے فرشتہ ہونے کا ثبوت دیتا۔

زبیدہ نے ہنس کر کہا۔ اور اس کوشش میں بیچارے فرشتے کو آگ سے کھیلنے کی پاداش میں ایک اور دماغ ہی ہاتھ آتا۔

ڈاکٹر مسکرایا اور زبیدہ کو کمرے میں لے چلنے کے لیے اس کی بائیں کپڑی۔
چلو زبئی۔ اب سو رہیں۔

زبیدہ نے کہا۔ جی کمرے میں تو سویا نہیں جائے گا مجھ سے پھلی طرف کیپ کاٹس سمجھ کر آسمان تلے کیوں نہ سو رہیں۔

ڈاکٹر نے خوشامد کی۔ زبئی بوند اب اندی ہونے کا ڈر ہے۔ نیند اچاٹ ہو جائے تو سارا مزہ اکر کر رہا ہو جائے گا۔

زبئی نے بھی ڈاکٹر کو ہچکچارایا۔ سوچو ڈاکٹر کس قدر حبس ہے کچھ برس بھی جائے تو فوراً کمرے میں جا کر پڑیں گے۔

ڈاکٹر کے حامی بھرنے سے پہلے ہی اس نے ملازم کو آواز دی اور کیپ کاٹس باہر نکالنے کے لیے کہہ دیا۔

ڈاکٹر بے چارہ بڑی حسرت سے زبئی کو ٹکڑے کر دیکھتا رہا۔

جب دونوں سونے کے لیے چلے گئے تو ابوالبشر نے دروازے ہی میں فرش پر اپنا

اُٹلی پرچائیاں میں کو اکب کچھ....

بستر لگو الیا کیوں کہ اپنی پرانی عادت کے سبب پلنگ پر اس کو نیند ہی نہ آتی تھی۔

اپنے اپنے بستر پر دراز ہوئے تو ڈاکٹر نے زہنی سے شکایت کی۔ آج اس قدر مرغن غذائیں کھائیں میں آئی ہیں اور تم نے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا۔ کیا تم نے میرے اصرار پر بھی کچھ نہیں سمجھا۔

زہنی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تو ڈاکٹر اور جلی گیا۔ منہ چھلکا کر اس نے کروٹ بدل لی۔ زہنی نے تار لیا کہ ڈاکٹر روٹھ گیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کے کان کی لولہ کی کوٹھلی میں پکڑ کر چیڑا۔

ڈاکٹر نے اس چیڑے جھڑکے تعلق سے زہنی کے پہل کرنے کو غنیمت جانا اور مسکرا کر اس کو دیکھا تو زہنی نے جباہی لے کر کہا۔

کیا یہاں کسی نے تم پر میرے ٹبھا دیئے ہیں جو تم اس قدر ادا اس ہو۔

ڈاکٹر نے زہنی کے ہاتھ کو جوڑتے ہوئے کہا۔ ڈرائنگ یہاں ”پرانی“ ”وسی“

(PRIVACY) کہاں ہے۔ سب کے سونے کا انتظار کرتے کرتے خود میری

ہی آنکھ لگ جائے گی اور تم تو جباہیاں لے رہی ہو۔

ڈاکٹر اسی باتوں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا تو زہنی کی آنکھیں مسند رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی چلت پھرت ہل چلی اور گھما گھی جیسے خاموشیوں اور سننا ٹول کے سیکڑاں اور استغناء سمندریں دو بگڑ گئی۔

گیم اگر ڈاکٹر نے آنکھ کھولی تو بارش کے موٹے موٹے قطرے ٹپا ٹپ گر رہے

تھے۔ زہنی بستر پر نہ تھی۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ وہ سونے کا انتظام کرنے کے لیے پیٹری کمرے میں چلی گئی ہے۔ اپنا بستر سمیٹ کر اس نے بغل میں دبا اور چکر کاٹ کر ورائڈ

اُعلیٰ پر چھائیاں
ہیں کو اکب کچھ....
کی کٹن لپکا۔ برآمدے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ابو البشر شیکم کے کمرے کے
بھڑے ہوئے کواڑوں پر کان لگائے بہت غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا
ہے۔ پاؤں دبا کر ڈاکٹر اس کے قریب پہنچا تو ابو البشر کو ڈاکٹر کی آمد کا
احساس تک نہ ہوا۔

تم نامردی کی حد تک مجھے ٹھکرا رہے ہو شیکم۔ کمرے سے زبانی آواز صاف
سنائی دے رہی تھی جس میں پھری ہوئی شیرازی کا غصہ تھا۔
شیکم کہہ رہا تھا۔ سوچو تو تم کہاں تک گر گئی ہو زبیدہ۔ جن باتوں کو خطوط
میں لکھتے ہوئے تم نے شرم محسوس نہیں کی آج اپنی زبان پر لاتے ہوئے بھی
تم مجھ نہیں ہو۔ میں جو کچھ ہوں بہر حال تمہارے لیے نہیں ہوں۔
تو پھر میرے خطوط لوٹا دو۔ زبیدہ رو ہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔
خطوط میرے ساتھ موجود ہیں۔ میں اسی وقت لوٹا سکتا ہوں۔ میں نے
سوچ لیا تھا کہ تم اب اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گی تو تمہارے پانچوں خطوط ڈاکٹر
کے حوالے کر دیں گے۔

دروازہ کھول کر ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو شیکم اپنی پتلون کی جیب
سے خطوط نکال رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا دیا تو شیکم نے چپ چاپ
خطوط اس کے ہاتھ میں تمنا دیئے۔

زبیدہ جھپٹی تو شیکم نے دھکا دے کر اس کو پرے ڈھکیں دیا۔
ڈاکٹر چھٹی چھٹی آنکھوں سے خطوط کو گھورتا رہا۔ اس کا گلہ زندہ ہو گیا
تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ تم نے آج یہ کس دوزخ میں مجھے

مُحلی پر چھائیال
ڈھکیل دیا ہے زبانی جس کی آگ کو بجھا دینا کسی آدمی کے بس میں نہیں۔ اور
ہمیں کو اکب کچھ.....
پھر میں اس قابل بھی تو نہ تھا۔
